کمال رازوال

محی الدین نواب

کمال رازوال

محی الدین نواب

علم و عرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40-اُردو بازار، لاہور۔
فون: 7352332، 7232336 فیکس: 7223584
www.ilmoirfanpublishers.com
E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

کمال راز وال

مغلوں کے زوال کے مطابق مورخوں اور دانشوروں نے طرح طرح کے نظریات قائم کیے ہیں۔ جب کوئی کمال حاصل کرتا ہے تو اس کی واہ واہ کی جاتی ہے۔ جب وہی زوال پذیر ہونے لگتا ہے تو اسے پتھر مارے جاتے ہیں۔ ان سلسلے میں اورنگزیب کو زیادہ پتھر مارے گئے۔ اس پر الزامات ہیں کہ اس نے سیاست پر مذہب کو مسلط کر لیا۔ اسلامی قوانین نافذ کرتے وقت ہندوؤں اور دوسرے غیر مسلموں کے جذبات کا خیال نہیں کیا۔ اور اس طرح اس نے مخالفتوں اور بغاوتوں کو ہوا دی۔ اس ہوا نے آندھی کی صورت اختیار کر کے مغل سلطنت پر جھاڑو پھیر دی۔

بعض مورخین نے یہ رائے قائم کی ہے کہ شہنشاہ جلال الدین اکبر نے اپنے طور پر مذہبی راواداری کی بنیادوں پر ہندوؤں کو سلطنت کے معاملات میں شریک کیا۔ اس نے ہندوؤں کو اپنے دربار اور اپنے صوبے میں بڑے بڑے عہدے دیئے۔ حکومتی معاملات میں انہیں اپنا مشیر خاص بنایا۔ اس طرح جانے انجانے میں ان کے لئے اقتدار حاصل کرنے

کے راستے ہموار کرتا رہا۔

اسی بات کو دوسرے پہلوؤں سے دیکھا جائے تو اس نے ہندوؤں کو اور خاص طور پر راجپوتوں کو گلے لگا کر بڑی حد تک نفرت اور تعصبات کو ختم کر دیا۔ مغل سلطنت کو قائم رکھنے کے سلسلے میں سب سے بڑا یہ فائدہ پہنچا کہ ہندو اور مسلمان ایک ہی لشکر مین سپاہی بن کر رہتے تھے۔ اور اپنے ہی ہم مذہب باغیوں اور دشمنوں سے جنگ کر کے انہیں پسپا کرتے تھے۔

انسان اپنی عام زندگی میں یا شاہانہ طرز عمل سے کوئی صحیح قدم اٹھائے تو دوسروں کی نظروں میں دوسرے پہلوؤں سے وہی قدم غلط ہو جاتا ہے۔ اورنگزیب کے دور میں امراء دربار اور دوسرے جاگیردار در پردہ اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ انہوں نے مختلف حیلے بہانوں سے زمین سے ہونے والی آمدنی کو شاہی خزانے تک پہنچنے سے روکنا شروع کیا۔ اس طرح پہلی بار مغل حکومت مالی اعتبار سے کمزور ہونے لگی۔

زوال کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ انگریز آہستہ آہستہ دوسرے صوبوں میں قدم جما رہے تھے۔ تجارت کو فروغ ہو رہا تھا۔ چھوٹی ریاستوں کے حاکموں نے اور ہندو بنیوں نے ان تاجروں کی ہمت افزائی کی۔ ان کے ساتھ مل کر کاروبار شروع کیا۔ یہ ہندو بنیے ساہوکار اور تاجر اس قدر دولت مند ہوتے گئے کہ یہ راجاؤں نوابوں امراء اور مغل بادشاہوں کو قرض دینے لگے اور انہیں اپنا احسان مند بنانے لگے۔

زوال کی کئی وجوہات میں ایک اہم وجہ خانہ جنگی تھی۔ تمام شہزادے تخت نشینی کے لئے آپس میں لڑنے مرنے لگے تھے۔ محلاتی سازشیں ہمیشہ سے ہوتی آرہی تھیں، بیگمات شہزادیاں اور کنیزیں اپنے مفادات کی خاطر اپنے طور پر چالیں چلتی رہتی تھیں۔ نور جہاں کی سازشوں نے شاہ جہاں کو مجبور کیا، اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اگر اس نے اپنے مخالف بھائی شہریار اور دوسرے بھائیوں کو قتل نہ کیا، انہیں اندھا اور معذور نہ بنایا تو ان کی سازشیں ہمیشہ جاری رہیں گی۔

جہاں آراء کی سازشوں نے اورنگزیب کو سوچنے سمجھنے پر مجبور کیا کہ پہلے بھائیوں اور تخت کے دوسرے وارثوں کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔ اورنگزیب عالمگیر کے متعلق طنزیہ انداز میں کہا جاتا ہے۔ کہ وہ پکا مسلمان تھا، اس نے ایک وقت کی نماز نہیں چھوڑی اور ایک

بھائی کو بھی نہیں چھوڑا۔ وہ بعد میں اپنے تمام بیٹوں سے خوفزدہ رہتا تھا۔ اس اندیشے میں مبتلا رہتا تھا کہ جس طرح اس نے اپنے باپ شاہ جہان کو اپنی عمر میں آخری سانسوں تک قیدی بنا کر رکھا تھا۔ اسی طرح اس کے بیٹے بھی اس کے ساتھ یہی سلوک کریں گے پھر آپس میں لڑتے مرتے رہیں گے۔ حکومتی معاملات میں مسائل پیدا ہوں گے۔ رعایا کا سکون برباد ہو جائے گا۔ لہذا اس نے کسی بیٹے کو کبھی حکومت کے معاملات میں مداخلت کرنے کی اجازت نہیں دی۔

جن بیگمات نے ان شہزادوں کو جنم دیا تھا۔ وہ فکر مند تھیں۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ اس کا اپنا بیٹا تخت نشین ہو۔ ایک بیگم نے عالمگیر سے کہا۔ ”میرا بیٹا تمام شہزادوں سے بڑا ہے۔ اصولاً اسے تخت کا جانشین ہونا چاہئے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ اسے ولی عہد بنانے کا اعلان کر دیں۔“

عالمگیر نے کہا۔ ”ہمیں ایسا کوئی اعلان کرنا ہوتا، تو بہت پہلے کر چکے ہوتے۔ ہم آپ کو بھی سمجھاتے ہیں اور دوسری بیگمات کو بھی یہی سمجھایا کرتے ہیں کہ اپنے صاحبزادوں کو عیش و عشرت کی زندگی سے باز رکھیں۔ انہیں زیادہ سے زیادہ سے تعلیم اور فن سپہ گری کی طرف مائل کرتی رہیں۔ ایک وقت آئے گا جب ہم دیکھیں گے کہ ان میں کون سب سے زیادہ قابل اور حکومت کرنے کا اہل ہے۔ پھر اسے ہی تخت پر بٹھایا جائے گا۔“

بیگم نے کہا۔ ”فی الحال آپ ہمارے بیٹے کو کوئی جاگیر تو عطا کر سکتے ہیں؟“

”شہزادوں کو جاگیریں عطا کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انہیں وہاں کا حاکم بنا دیا جائے۔ وہاں وہ اپنی فوجیں تشکیل دیتے ہیں۔ بادشاہ کی لاعلمی میں اپنی من مانی کرتے ہیں۔ رفتہ رفتہ فوجی قوت بڑھاتے ہیں۔ پھر اپنے ہی بادشاہ پر لشکر کشی سے باز نہیں آتے۔“

وہ اسی طرح سے تمام بیگمات کو مایوس کن جواب دیا کرتا تھا۔ لیکن وہ عورتیں مایوس ہونے والی نہیں تھیں۔ سب ہی اپنے اپنے شہزادے کے بارے میں فکر مند تھیں کہ ان کا مستقبل کیا ہوگا؟ تخت ہوگا یا تختہ ہوگا؟

وہ دیکھتی اور سنتی آئی تھیں کہ ماضی میں اپنے ہی شہزادوں نے تخت و تاج کے لئے قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا تھا۔ ایک ہی باپ اور ایک ہی ماں کی اولاد ہونے کے

باوجود ایک دوسرے کی لاش پر سے گزرتے ہوئے تخت شاہی تک پہنچتے رہے تھے۔

تمام بیگمات کے ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ ان میں سے جس کے بیٹے کو تخت پر بٹھایا جائے گا، اس کی لشکری قوت کے آگے دوسرے تمام شہزادے گھٹنے ٹیک دیں گے۔ یا تخت وتاج کی ہوس میں حرام موت ماریں جائیں گے۔ وہ تمام بیگمات محل سے باہر دربار شاہی کے معاملات کو بہت اچھی طرح سمجھتی تھیں۔ اور اپنے طور پر معلومات حاصل کرتی رہتی تھیں۔

معلومات یہ تھیں کہ مراہٹے، سکھ اور روہیلا قوم کے باغی اورنگزیب عالمگیر کے لئے دردسر بنے رہتے تھے۔ تمام جاگیردار خراج کے طور پر بھاری رقمیں خزانے تک نہیں پہنچاتے تھے۔ درباری امراء بدلتے ہوئے حالات کو دیکھ کر اپنے تیور بدل رہے تھے۔ ان کے اندر بھی اقتدار حاصل کرنے کی ہوس پیدا ہو رہی تھی۔ ان امراء کے کئی گروہ بن گئے تھے۔ ہر گروہ یہ چاہتا تھا کہ کسی شہزادے کو اپنا آلہ کار بنا کر اسے تخت شاہی تک پہنچایا جائے۔ ایسے وقت محل میں رہنے والی بیگمات نے اپنے خواجہ سراؤں اردہ بیگنیوں کے ذریعے ان امراء سے رابطہ کیا۔ مختلف بیگمات نے مختلف امراء کے گروہ سے یہ وعدہ کیا کہ ان کے بیٹے کو مستقبل کا بادشاہ بنایا جائے گا تو وہ انہیں لاکھوں روپے پیشگی کے طور پر ادا کریں گی۔ بعد میں انہیں زیادہ سے زیادہ رعایتیں دی جائیں گی اور ان کے جو بھی مطالبات ہوں گے وہ سب پورے کئے جائیں گے۔

عالمگیر ایک حکمران کی حیثیت سے اس قدر طاقتور تھا کہ اس کے خلاف بغاوت کرنے کا حوصلہ کسی میں نہیں ہوتا تھا۔ سب ہی مناسب وقت کے انتظار میں تھے اور فی الحال مناسب وقت یہی سمجھ میں آرہا تھا کہ عالمگیر اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے کوچ کر جائے، تب ہی بات بنے گی۔ لیکن بڑی بیگم میں صبر وتحمل نہیں تھا۔ وہ اپنے بیٹے اکبر (محمد سلطان) کو جلد سے جلد تخت نشین ہوتے دیکھنا چاہتی تھی۔

اس نے ایک بہت ہی طاقتور امراء کے گروہ سے رابطہ کیا۔ اس گروہ کا امیر سعادت الملک زیادہ سے زیادہ جاگیریں اور مال ودولت سمیٹنے کی فکر میں رہتا تھا۔ اسے مغل خاندان کی وفاداری اور ملک وقوم کی کوئی فکر نہیں تھی۔ اس نے نادر شاہ کو دہلی پر حملہ کرنے کی

دعوت دی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ نادر شاہ محض لٹیرا ہے۔ حملہ کرنے اور فتح حاصل کرنے کے بعد ہندوستان میں نہیں رہے گا۔ خزانہ لوٹ کر واپس چلا جائے گا اور جاتے جاتے اسے وہاں کا حاکم بنادے گا۔

شہزادہ اکبر کی ماں نے سعادت الملک سے خفیہ طور پر رابطہ کیا۔ اور اسے کہا۔

"آپ حکمران بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اگر ظل سبحانی عالمگیر کے بعد آپ کو ایسا کوئی موقع ملا تو شاہی لشکر کے سپہ سالار اور ترک امیر آپ کو حکمران کی حیثیت سے تسلیم نہیں کریں گے۔ اس کے لئے لازمی ہوگا کہ آپ کسی مغل شہزادے کو تخت پر بٹھائیں اور اس کے ساتھ مل کر حکومت کریں۔"

سعادت الملک نے کہا۔ "آپ درست فرماتی ہیں۔ آئندہ ہمارے لئے لازمی ہوگا کہ ہم کسی بھی مغل شہزادے کا تعاون حاصل کریں۔ کیا آپ اس سلسلے میں ہمارا ساتھ دینا چاہتی ہیں؟"

"بے شک۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بیٹے کو جلد سے جلد تخت پر بٹھایا جائے۔ اس کے لئے ہم آپ کے تمام مطالبات ماننے کو راضی ہیں۔"

"ظل سبحانی عالمگیر شہزادوں کے معاملات میں بہت محتاط ہیں، انہوں نے کسی کو جاگیر عطا نہیں کی۔ شہزادوں کو محل سے اور دارالسلطنت سے باہر جانے کی اجازت نہیں دیتے ہیں۔ اپنی فوجی قوت حاصل کرنے اور اپنے باپ سے بغاوت کرنے کے لئے لازمی ہے کہ وہ دارالسلطنت سے دور ایسی جگہ جائے۔ جہاں ہم باغی راجاؤں اور مہاراجاؤں کو متحد کر کے آپ کے بیٹے کے لئے ایک لشکر ترتیب دے سکیں۔"

بیگم نے کہا۔ "آپ جو چاہتے ہیں وہی ہوگا۔ میرا بیٹا شکار کے بہانے یہاں سے جائے گا۔ پھر آپ اسے اپنے ساتھ جہاں چاہیں گے اسے لے جاسکیں گے۔"

اس منصوبے کے مطابق شہزادہ اکبر ایک دن شکار کھیلنے کے بہانے محل سے نکلا۔ اس کے ساتھ دوسرے شکاریوں اور سپاہیوں کی ٹولی تھی۔ جب وہ شکار گاہ تک پہنچنے کے لئے ایک جنگل سے گزرنے لگا تو ایسے وقت ان سب کی نظریں بچا کر وہاں سے فرار ہوگیا۔ پھر ایک مقررہ مقام پر سعادت الملک کے ساتھیوں سے آکر مل گیا۔ اس کے فرار ہونے پر

اورنگزیب عالمگیر نے اپنی بیگم کا سختی سے محاسبہ کیا۔ بیگم نے قسمیں کھا کر یقین دلایا۔ ''ہم نہیں جانتے کہ ہمارا بیٹا اچانک کہاں چلا گیا ہے؟ کہاں گم ہو گیا ہے؟ ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ خود کہیں گیا نہ ہو۔ دشمنوں نے اسے اغواء کیا ہو۔ اگر ایسا ہے تو اسے کہیں قیدی بنا کر رکھا گیا ہوگا، ہم اس کے لئے پریشان ہیں۔ پتہ نہیں اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا جا رہا ہوگا؟''

عالمگیر نے اپنے سپاہیوں اور اپنے خاص آدمیوں کو حکم دیا کہ شہزادہ اکبر کو تلاش کیا جائے۔ جب دشمنوں اور باغیوں پر شبہ ہوگا کہ انہوں نے شہزادے کو اغواء کیا ہے تو ان پر لشکر کشی کی جائے گی۔

کئی ماہ تک سراغ نہ ملا۔ کہ وہ کہاں گم ہو گیا ہے؟ پھر ایک دن ایک صوبے کا حاکم اپنے علاقے سے فرار ہو کر عالمگیر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے کہا۔ ''جہاں پناہ! ہم جان کی امان چاہتے ہیں۔ ظلِ سبحانی شائد یقین نہ کریں۔ شہزادہ محمد سلطان اکبر نے ہم پر لشکر کشی کی۔ ہماری فوج نے مقابلہ کیا۔ لیکن ہم شکست کھانے کے بعد فرار ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔''

عالمگیر نے حیرانی اور بے یقینی سے پوچھا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ شہزادہ اکبر نے لشکری قوت کہاں سے حاصل کی ہے؟''

''صاحب عالم نے باغی راجاؤں مہاراجاؤں کو متحد کیا ہے۔ ان کے ساتھ مراہٹوں کی فوج بھی شامل ہو گئی ہے۔ ان کی لشکری قوت اتنی زیادہ ہے۔ کہ انہیں صرف شاہی لشکر سے ہی شکست ہوسکتی ہے۔ ہم فریادی بن کر آئے ہیں۔ انہوں نے ہمارے صوبے میں ایسی لوٹ مار مچائی ہے کہ وہاں کے مہاجن ساہوکار اور دوسرے دولت مند سب ہی کنگال ہو گئے ہیں۔ آپ تو مراہٹوں کو جانتے ہی ہیں کہ وہ صرف لوٹ مار کرنے کے لئے حملے کرتے ہیں۔ انہوں نے اس بار بھی یہی کیا ہے۔''

عالمگیر نے ترک امیر کو بلا کر حکم دیا۔ ''ان باغی مہاراجاؤں پر لشکر کشی کی جائے۔ اور شہزادہ اکبر کو گرفتار کر کے ہمارے سامنے ایک قیدی کی طرح پا بزنجیر حاضر کیا جائے۔''

پھر اس نے محل میں آ کر بیگم سے گرجتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا بیٹا بہت ہی عاقبت نا اندیش نکلا۔ اس نے اپنے نام حرام موت لکھ لی ہے۔ ہم نے تمام شہزادوں کو سخت نگرانی میں

رکھا تھا تا کہ وہ کبھی ہم سے بغاوت نہ کریں لیکن شہزادہ اکبر نے کچھ زیادہ ہی چالاکی دکھائی ہے۔ تم بہت جلد اپنے بیٹے کی میت پر ماتم کرنے والی ہو۔''

بیگم نے روتے ہوئے کہا۔ ''نہیں۔ ہمارے بیٹے پر رحم فرمائیں۔ وہ نادان ہے۔ دشمنوں کے بہکانے میں آ کر اس نے ایسی غلطی کی ہے۔ ہم اسے سمجھائیں گے۔ وہ آپ کے قدموں میں گر کر معافی مانگے گا۔ اور ہمیشہ آپ کے قدموں ہی میں رہا کرے گا۔''

''جب اسے ہتھکڑیاں پہنا کر ہمارے سامنے لایا جائے گا تو اس کی کھال کھنچوائی جائے گی۔ پھر ہم اس کھال کی جوتیاں بنوا کر اپنے پیروں میں پہنیں گے۔ اس طرح تمہاری یہ خواہش پوری ہوگی۔ تمہارا بیٹا ہمارے قدموں ہی میں رہا کرے گا۔''

بیگم جانتی تھی کہ بادشاہ کی ہر بات پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔ وہ جو کہہ دیتا ہے اس پر ضرور عمل کرتا ہے۔ اس کے بیٹے کی سلامتی اسی میں تھی کہ شاہی لشکر سے مقابلہ کرے تو شکست نہ کھائے اور اگر شکست کھائے تو بادشاہ کے ہاتھ نہ آئے۔

بیگم نے پھر بڑی راز داری سے سعادت الملک کو یہ تحریری پیغام بھیجا۔ ''بادشاہ بہت ہی غضب ناک ہو رہا ہے۔ شہزادہ اکبر کو باغی قرار دے کر اس کی بدترین سزا تجویز کر چکا ہے۔ ہم تو خوف کے مارے لرز رہے ہیں۔ نجانے ہمارے بیٹے کا انجام کیا ہوگا؟ اوپر خدا ہے اور نیچے آپ ہی اس کے محافظ ہیں۔

یہ بادشاہ وقت کی ایک بیگم نہیں' ایک ماں آپ سے التجاء کرتی ہے کہ ہمارے بچے کو تحفظ دیں۔ جب شاہی لشکر سے مقابلہ ہو تو اسے سمجھائیں کہ وہ پیش پیش نہ رہے۔ اگر حالات ناموافق ہوں تو وہ گرفتار ہونے سے پہلے وہاں سے فرار ہو جائے۔''

سعادت الملک نے جواباً تسلی بخش پیغام بھیجا۔ ''آپ خاطر جمع رکھیں۔ آپ کے شہزادے پر کبھی کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ ہم اسے بادشاہ سلامت کے ہاتھ نہیں لگنے دیں گے۔''

سعادت الملک کے عزائم کچھ اور تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ شہزادہ اکبر کے ذریعے کامیابی حاصل ہوگی اور وہ شاہی لشکر کو شکست دے سکے گا تو یہ کامیابی دراصل اس کی اپنی ہو گی۔ اس نے امراء کا جو گروہ بنایا ہوا تھا۔ وہ دوسرے تمام امراء سے افضل و برتر ہوگا۔ وہ تمام امراء جو دوسرے شہزادوں کو اپنے لئے مہرہ بنا رہے ہیں۔ ان کی جان کے لالے پڑ

جائیں گے۔شہزادہ اکبر فاتح بننے اور تخت پر بیٹھنے کے بعد اپنے کسی بھائی کو زندہ نہیں چھوڑے گا اور ان کی حمایت کرنے والے امراء کو بھی تباہ و برباد کر دے گا۔

اور اگر شہزادہ اکبر شاہی لشکر سے شکست کھائے گا تو سعادت الملک کی یہی کوشش ہوگی کہ وہ گرفتار ہو کر باپ کے سامنے جائے اور ایسی عبرت ناک سزا پائے کہ دوسرے شہزادے اسے دیکھ کر اپنے کان پکڑیں۔اپنے حمایتی امراء کا آلہ کار بننے سے انکار کر دیں اور بادشاہت سے توبہ کر لیں۔

ان حالات میں سعادت الملک کو یقین تھا کہ نادر شاہ آکر حملہ کرے گا۔تو مال و دولت لوٹ کر جانے کے بعد اسے وہاں کا حکمران بنا دے گا۔وہ نادر شاہ کو حملہ کرنے کے لئے دعوت نامہ بھیج چکا تھا۔اور وہاں سے جواب موصول ہوا تھا۔"جب ہمارے حالات موافق ہوں گے اور ہمارے نجومی حملہ کرنے کے سلسلے میں نیک ساعت کا یقین دلائیں گے' تب ہم ہندوستان پر ضرور حملہ کریں گے۔فی الوقت آپ انتظار فرمائیں۔"

سعادت الملک نے یہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ شہزادہ اکبر کی شکست ہوگی تو اس کی بھی شامت آجائے گی۔جب شہزادہ قیدی بن کر آئے گا اور اس پر تشدد کیا جائے گا تو وہ سارا بھید کھول دے گا کہ کس طرح اس کی آکم مادر اور سعادت الملک نے سازشیں کی تھیں اور اسے باغی بنانے کے لئے شکار کے بہانے شاہی محل سے فرار ہونے کا مشورہ دیا تھا۔

جب جنگ شروع ہوئی تو سعادت الملک دارالسلطنت سے نکل کر ایک خفیہ پناہ گاہ میں چلا آیا۔باغی شہزادے اکبر کے جھنڈے تلے کئی راجا مہاراجہ اور مرہٹے اپنی فوج کے ساتھ آکر متحد ہو گئے تھے،اچھی خاصی فوجی قوت تھی پھر بھی وہ شاہی لشکر کے مقابلے پر زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے۔شہزادہ اکبر نے جب شکست کے آثار دیکھے تو وہاں سے فرار ہونے لگا۔سعادت الملک نے راجاؤں مہاراجاؤں سے کہہ دیا تھا کہ شہزادہ اگر بزدلی دکھائے اور منہ پھیر کر بھاگنا چاہے تو اسے بھاگنے کا موقع نہ دیا جائے۔اسے زخمی کر کے بے بس و مجبور کر کے بادشاہ کا قیدی بننے پر مجبور کر دیا جائے۔

جب وہ فرار ہونے لگا۔تو ان راجاؤں مہاراجاؤں کے چند سپاہی جو اس کی تاک میں تھے اس کا راستہ روکنے لگے۔لیکن اکبر کے بھی کئی حمایتی سپاہی تھے۔جنہوں نے ان کا

مقابلہ کیا اور اکبر کو فرار ہونے کا موقع دے دیا۔شکست کا سامنا ہوتے ہی سپاہی میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے۔شاہی لشکر نے ان کا تعاقب کیا۔ان کے سپہ سالار اور فوج کے اعلیٰ عہدیداروں کو ایک راجہ سمیت گرفتار کیا۔اس راجہ نے اورنگزیب کے سامنے حاضر ہو کر بیان دیا۔

"مہاراج ادھیراج کی جے ہو۔ہم آپ سے بغاوت کرنے اور آپ سے مقابلہ کرنے کی جرات کبھی نہیں کر سکتے تھے لیکن آپ کے امیر سعادت الملک نے صرف ہم راجاؤں مہاراجاؤں کو ہی نہیں شہزادہ اکبر کو بھی بغاوت پر آمادہ کیا۔اس نے ہمیں سبز باغ دکھائے اور ہم اس کے فریب میں آگئے۔"

سعادت الملک کی شامت آگئی۔اورنگزیب عالمگیر نے حکم دیا کہ اسے دور دراز تک ایک ایک علاقے میں تلاش کیا جائے۔کہیں روپوش ہونے کا موقع نہ دیا جائے اور باغی شہزادہ اکبر کا بھی تعاقب کیا جائے،جو اسے گرفتار کر کے لائے گا۔اسے انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔

شہزادہ اکبر وہاں سے فرار ہو کر ایران کی طرف چلا گیا تھا پھر ایسے غائب ہو گیا تھا۔جیسے کبھی اس دنیا میں اس کا کبھی وجود نہ رہا ہو۔وہ کبھی پلٹ کر شاہی خاندان میں منہ دکھانے نہیں آیا۔

عالمگیر غضب ناک ہو رہا تھا۔وہ چاہتا تھا۔شہزادہ اکبر کے بعد دوسرے شہزادوں کو بغاوت کرنے کی جرات نہ ہو۔اس نے شہزادہ اکبر کے بیٹے نیکو سیر اور اس کی بیٹیوں کو قید میں ڈال دیا۔بیگم نے احتجاج کیا۔"یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ یہ آپ کا پوتا ہے۔پوتیاں ہیں۔آپ بیٹے کی سزا اپنے پوتے پوتیوں کو کیوں دے رہے ہیں؟"

اس نے کہا۔"یہ سزا تمہیں بھی ملنی چاہئے۔کیونکہ تم نے ایسی ناخلف اولاد کو پیدا کیا ہے۔بہتر ہے کہ تم بھی اپنی بہو پوتے اور پوتیوں کے ساتھ قید خانے میں رہا کرو۔"

اس نے اپنی بیگم کو بھی وہیں پہنچا دیا۔وہ چاہتا تھا کہ محل کی دوسری بیگمات اور شہزادے عبرت حاصل کریں اور بادشاہ وقت کے خلاف کبھی کوئی قدم اٹھانے کی جرات نہ کریں۔اس نے ایسا سخت رویہ اختیار کیا تھا کہ اس کی زندگی میں پھر کسی شہزادے اور ان

کے حمایتی امراء نے بغاوت کرنے کی جرات نہیں کی۔اس کے باوجود وہ سب اندر ہی اندر کھچڑیاں پکاتے رہے۔اور مناسب موقع کا انتظار کرتے رہے۔

اور مناسب موقع وہی تھا' جب اورنگزیب عالمگیر نے اپنی آخری سانسیں پوری کیں۔اور راہی ملک عدم ہوا۔تمام امراء کے جماعتوں کو اور تمام شہزادوں کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔وہ سب ایک عرصے سے کھچڑیاں پکا رہے تھے۔اور اب وہ کھچڑیاں حلق سے اتارنے کے لئے پک کر تیار ہو چکی تھیں۔

ان امراء کے گروہوں میں سید برادران کا گروہ سب سے زیادہ مضبوط اور جوڑ توڑ کا ماہر تھا۔انہوں نے شہزادہ اکبر کے بیٹے نیکو سیر کو قید خانے سے نکال کر تخت پر بٹھایا۔نیکو سیر نا اہل تھا لیکن سید برادران اس کی پشت پر رہ کر حکومت کی باگ ڈور سنبھال سکتے تھے۔

دوسری طرف سعادت الملک اپنی پناہ گاہ سے نکل آیا تھا۔اس نے جہاندار کا ساتھ دیا۔جہاں دار شاہ مرحوم عالمگیر کے دوسرے بیٹے محمد معظم (شاہ عالم) کا بیٹا تھا۔اس نے حملہ کر کے تخت پر قبضہ جمایا اور نیکو سیر کو پھر قید خانے میں پھنکوا دیا۔

جہاں دار شاہ بلا کا عیاش تھا۔دن رات رقص موسیقی اور شراب وشباب میں مست رہتا تھا۔ایک سکھ حسینہ لال کور کا دیوانہ ہو گیا تھا۔اس کے بغیر نہ سوتا تھا' نہ جاگتا تھا۔وہ حسینہ اپنی ریشمی زلفوں سے اس کے بدن کے کچھ حصّوں کو سہلاتی تھی' تب اس کی آنکھ لگتی تھی۔جب اسی طرح سہلاتے ہوئے گنگناتی تھی تو وہ نیند سے بیدار ہوتا تھا۔

دوسرے شہزادے فرخ سیر نے امراء کے ایک گروہ سید برادران کی بھرپور مدد حاصل کر کے جہاندار شاہ پر حملہ کیا۔ساہوگڑھ کے مقام پر جب دونوں فوجیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں تو جہاندار شاہ کی فوج کے پچھلے حصّے میں طوائفوں اور سازندوں کی ٹولی تھی۔آگے فوج لڑ رہی تھی۔پیچھے مغلیہ بادشاہوں کا سپوت رنگ رلیاں منا رہا تھا۔لال کور اس کا پہلو گرما رہی تھی۔طوائفیں اپنے اپنے بدن کے زاویئے پیش کرتی ہوئی جھوم جھوم کر رقص کر رہی تھیں۔

ایسی عیاشی اور غفلت کے باوجود اس جنگ میں جہاندار کا پلڑا بھاری ہو رہا تھا۔کیونکہ شاہی لشکر میں بندوقوں' توپوں اور سپاہیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی لیکن اچانک ہی

شہزادہ فرخ سیر کے ایک سپہ سالار نے فوج کا ایک دستہ لے کر عقب سے حملہ کیا' جہاں رقص وسرود کی محفل عروج پر تھی۔ایسے زبردست اور اچانک حملے سے شاہی فوج تتر بتر ہو گئی۔شکست کا سامنا ہوتے ہی لال کور بڑی چالاکی سے جان بچا کر فرار ہو گئی۔جہاندار گرفتار ہو گیا۔

فرخ سیر نے تخت نشین ہوتے ہی سب سے پہلے اپنے بھائی جہاندار شاہ اور اس کے لڑکے شہزادہ اعزاز الدین کو قتل کرا دیا۔اس کے بعد اپنے چھوٹے بھائی محمد ہمایوں بخت اور عالی تبر کو اندھا کرا دیا۔

یہ شہزادے مغل خاندان کی آخری نسلوں میں سے تھے۔شاہجہاں اور عالمگیر کے دور سے اپنے ہی بھائیوں کو قتل کرنے' اندھا کرنے اور طرح طرح کی اذیتیں دے کر مار ڈالنے کا جو سبق حاصل کیا تھا' اسی پر یہ بھی عمل کر رہے تھے۔ایسے وقت یہ کہنا چاہئے۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

فرخ سیر نے تخت پر بیٹھتے ہی من مانی شروع کر دی۔سید برادران سے جو وعدہ کیا تھا۔اس سے منحرف ہو گیا۔ان کے ناجائز مطالبات ماننے سے انکار کرنے لگا۔یہ بھول گیا تھا کہ دولت اور فوج کی تنخواہ اور راشن ان سید برادران کے ہاتھوں میں ہے۔

سید برادران نے حکم دیا کہ فرخ سیر کو حرم سے گرفتار کر کے لایا جائے۔جب سپاہی وہاں پہنچے تو فرخ سیر کی ماں، بیگمات اور دوسری شہزادیاں رونے لگیں۔ہاتھ جوڑ کر رحم کی درخواست کرنے لگیں۔مغل خاندان کی بیگمات اور شہزادیوں پر پہلے کبھی ایسا وقت نہیں آیا تھا کہ وہ معمولی سپاہیوں کے آگے ہاتھ جوڑ کر رحم کی بھیک مانگتیں۔تخت وتاج کے لئے لڑنے والوں کو اس بات کی قطعی پرواہ نہیں تھی کہ مغل خاندان کی عزت ووقار خاک میں مل رہا ہے اور وہ اپنی سطح سے گر کر ذلت کی زندگی گزار رہے ہیں۔

فرخ سیر کو حرم سے گھسیٹ کر باہر لایا گیا۔ایک تنگ وتاریک کمرے میں پہنچا دیا گیا پھر وہیں اسے قتل کر دیا گیا۔اسے قتل کرانے کے بعد سید برادران کو کوئی اور شہزادہ نہیں مل رہا تھا جو شہزادے رہ گئے تھے، وہ سعادت الملک اور غلام قادر روہیلا کے ہاتھوں کھیل

رہے تھے۔ باقی یا تو قتل ہو گئے تھے یا انہیں اندھا کرا دیا گیا تھا۔ آخر سید برادران نے ایک شہزادے کو قید سے نکال کر تخت پر بٹھا دیا۔

تخت نشینی کے معاملے میں دیر نہیں کی جا سکتی تھی۔ کیونکہ مخالف گروہ والے ان سے بازی لے جا سکتے تھے۔ لہٰذا قید خانے سے نکالے جانے والے شہزادے کو جب تخت پر بٹھایا گیا تو اس کی یہ حالت تھی کہ انتہائی میلا کچیلا تھا۔ اس کے کپڑے بدلنے کی بھی فرصت نہیں ملی تھی۔ ان ہی میلوں کپڑوں پر اسے قیمتی موتیوں کی مالا پہنائی گئی۔ اور تاج سر پر رکھا گیا۔ وہ تاج جس میں دنیا کا سب سے قیمتی ہیرا کوہ نور جڑا ہوا تھا۔ وہ تخت طاؤس جس کی خوبصورتی اور شاہی دبدبہ بے مثال تھا۔ مغلیہ دور کی کتنی ہی چیزیں قابل فخر تھیں۔ ان سب کی قدر و قیمت اور تاریخی اہمیت کو خاک میں ملایا جا رہا تھا۔

جس میلے کچیلے شہزادے کو تخت پر بٹھایا گیا۔ وہ دِق کا مریض تھا۔ چند مہینوں کے بعد مر گیا۔ ایسے وقت غلام قادر روہیلا اُن سید برادران پر غالب آ گیا۔ اس نے پہلے تو اکبر نامی ایک شہزادے کو تخت پر بٹھایا۔ لیکن وہ بالکل ہی اہل تھا۔ غلام قادر نے غصے سے حکم دیا۔
"چلو تخت سے اترو۔ اور سب کے سامنے رقص کرو۔"

وہ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑا کر التجا کرنے لگا کہ اسے بھرے دربار میں ذلیل نہ کیا جائے لیکن جب اس کے جسم پر چابک پڑنے لگے تو وہ مجبوراً ناچنے لگا۔ اس سے پہلے کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ مغل شہزادے اور شہزادیوں کو اس طرح ذلیل کیا جائے گا۔ شہزادیوں سے جو بدترین اور شرمناک سلوک کیا گیا۔ اسے کسی مورخ نے بیان نہیں کیا اور نہ ہی کرنا چاہئے۔

ان دنوں شمالی ہندوستان میں روہیلوں اور مراہٹوں کو عروج حاصل ہو رہا تھا۔ ان دونوں نے متحد ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ مغل خاندان کے ایک شہزادے کو تخت پر بٹھا کر اس کی پشت پر اقتدار حاصل کیا جائے۔ اس طرح تمام شاہی لشکر اپنے زیر اثر رہے گا۔ دوسرے باغی دارالسلطنت کا رخ کرنے کی جرات نہیں کریں گے۔ انہوں نے شہزادہ شاہ عالم کو محض نمائش کے لئے تخت پر بٹھایا۔ پھر اس پر پابندی عائد کر دی کہ وہ دہلی شہر سے باہر نہ جائے۔ محل اور دربار میں رہ کر اپنی کھوکھلی بادشاہت کا مظاہرہ کرتا رہے۔

انہی دنوں نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ دارالسلطنت کو اس طرح تباہ و برباد

کیا کہ وہ شہر کھنڈر بن کر رہ گیا۔ وہاں سے جاتے جاتے بے انتہا خزانے کے ساتھ کوہ نور ہیرا اور تختِ طاؤس بھی ساتھ لے گیا۔

☆☆☆

ایسے پُر آشوب دور میں مراہٹوں نے قسم کھائی کہ ہندوستان کی زمین سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹا دیں گے۔ مراہٹوں کے ایک جنگجو رہنما سیوا جی نے اورنگزیب کے زمانے میں بغاوت شروع کی تھی۔ وہ مختلف صوبوں اور علاقوں میں پہنچ کر اپنی فوج کے ساتھ لوٹ مار کرتا تھا۔ اس علاقے کو مکمل تباہ و برباد کر دیتا تھا۔ پھر اچھی خاصی دولت لوٹ کر واپس چلا جاتا تھا۔ عالمگیر نے کئی بار اس کی سرکوبی کی تھی۔ وہ شکست کھا کر فرار ہو جاتا تھا اور کبھی ہاتھ نہیں آتا تھا۔

اس کی موت کے بعد بالا جی پیشوا اور سدا شیو پنڈت بھاؤ جیسے مراہٹے میدان میں آئے۔ انہوں نے ایک بہت بڑا جلسہ منعقد کیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ مراہٹوں کی تاریخ کا بہت بڑا جلسہ تھا۔ اس جلسے میں مسلمانوں کے خلاف بڑے ہی جوش اور جذبے سے کئی فیصلے کئے گئے۔ اگر وہ اپنے فیصلوں پر عمل کرتے ہوئے کامیاب ہو جاتے تو پورے ہندوستان پر ان کا قبضہ ہو جاتا۔ اور ایک مسلمان بھی باقی نہ رہتا۔

ایک مراہٹے نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "مسلمان حملہ آور ہمیشہ افغانستان کے راستے ہندوستان آتے ہیں۔ اور آئندہ بھی آتے رہیں گے۔ ان حالات میں ان کا راستہ روکنا ہے۔ اُدھر سے آنے والے احمد شاہ ابدالی کے پاس اتنی بڑی فوجی طاقت موجود ہے کہ ہمیں اس کا مقابلہ کرنے کے لئے پھر سے متحد اور منظم ہو جانا چاہئے۔

اگر ہم اس سے بڑی فوج ترتیب دینے میں کامیاب ہو جائیں گے تو سب سے پہلے افغانستان کے مرکز کابل پر قبضہ کریں گے۔ کیونکہ وہاں کے افغان، بیرونی حملہ آور مسلمانوں کو طرح طرح کی امداد پہنچاتے رہتے ہیں۔ اور ان کے لئے ہندوستان تک پہنچنے کے راستے ہموار کرتے رہتے ہیں۔ اگر ہم مسلمان حملہ آوروں کی آمد کا وہ راستہ بھی روک دیں۔ تو پھر کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔ ہندوستان میں جتنی بھی مسلمان ریاستیں ہیں۔ ہم انہیں ایک ایک کر کے ختم کرنا شروع کر دیں گے۔ ہماری دھرتی پر ایک بھی اسلامی

ریاست باقی نہیں رہے گی۔“

سداشیو پنڈت بھاؤ نے کہا۔”ہمارا سب سے پہلا اور بدترین دشمن محمود غزنوی تھا۔اس کے حملے سے ہمارے دل آج بھی زخمی ہیں۔اور صدیاں گزرنے کے بعد بھی یہ زخم اب تک ہرے ہیں۔محمود غزنوی نے متھرا کے مندروں کو توڑا۔قنوج کے مندروں کو برباد کیا۔کسی بھی مندر میں کسی بت کو ثابت وسالم نہیں رہنے دیا۔حتیٰ کہ سومناتھ کا مندر بھی توڑ ڈالا۔صدیوں پہلے ہمیں جو زخم لگائے گئے ہیں۔اب ان کے علاج کا وقت آ گیا ہے۔

اب ہمارے پاس اتنی قوت ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں۔سومناتھ کی مورتی کی جو بے حرمتی کی گئی ہم اسے بھولے نہیں ہیں۔اب وقت آ گیا ہے کہ ہم سومناتھ کی مورتی کو شاہ جہاں کی بنائی ہوئی جامع مسجد دہلی کے منبر پر نصب کریں اور وہاں پوجا پاٹ شروع کر دیں۔“

سداشیو نے فضا میں گھونسہ لہراتے ہوئے کہا۔”ہم اپنی فوجی قوت کے ذریعے پنجاب پر قبضہ کر کے افغانستان میں گھس جائیں گے۔اور وسطی پہنچ کر محمود غزنوی کا مقبرہ ڈھا دیں گے۔اس کی لاش کو قبر سے نکال کر اس کے دانت توڑ ڈالیں گے۔پھر اسے آگ میں جلا دیں گے۔دنیا کو دکھا دیں گے کہ ہندوستان کے ہندو بے غیرت اور بے حس نہیں ہیں۔وہ صدیوں بعد بھی انتقام لینا جانتے ہیں۔“

بالاجی نے اپنے چچازاد بھائی پنڈت بھاؤ کی تقریر سننے کے بعد کہا۔”میں اس سے بھی اونچے عزائم رکھتا ہوں۔میرے اندر انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے۔میں ہندوستان سے مسلمانوں کو یکسر مٹا کر اس دھرتی کو پوتر (پاک) کر دینا چاہتا ہوں۔آئندہ کوئی مسلمان حملہ آور ہندوستان کا رخ کرنے کی جرات نہیں کر سکے گا۔“

اس جلسے میں یہ فیصلہ کیا گیا۔کہ سب سے پہلے دہلی کی مغل حکومت کا خاتمہ کیا جائے۔کیونکہ وہاں کے موجودہ حکمران نہایت ہی نااہل اور بزدل تھے۔وہ آپس میں لڑ رہے تھے اور ایک دوسرے کو قتل کر رہے تھے۔ وہاں کا برائے نام حکمران شاہ عالم تھا۔جسے قلعہ معلیٰ میں نظر بند رکھا جاتا تھا۔

یہ فیصلہ کیا گیا کہ پہلے دہلی کی مغل حکومت کا خاتمہ کیا جائے۔اس کے بعد سیدھا

پنجاب کا رخ کیا جائے۔وہاں اٹک کے کنارے پہنچ کر احمد شاہ ابدالی کو آگے بڑھنے سے روکا جائے۔اسے شکست دے کر کابل، قندھار اور غزنی اس سے چھین لیا جائے۔

بڑے بڑے سہانے اور سنہرے خواب دیکھے جا رہے تھے۔ایک افغان ابراہیم خان مراہٹہ فوج کے توپ خانے کا سردار تھا۔اسے توپیں چلانے اور گولے داغنے میں اتنی مہارت حاصل تھی کہ مراہٹے مجبوراً اس کی خدمات حاصل کر رہے تھے۔بالاجی نے ابراہیم خان سے کہا۔”ہم مسلمانوں کے خلاف جو کچھ کہہ رہے ہیں اور کرنا چاہتے ہیں۔اس کا اثر تم جیسے وفاداروں پر نہیں ہوگا۔تم ہمارے سائے میں زندہ سلامت رہا کرو گے۔“

ابراہیم خان نے کہا۔”میں آپ کو اپنی وفاداری کا پورا یقین دلاتا ہوں۔آپ کا نمک کھاتا ہوں۔اس کے لئے ہر حال میں خود کو نمک حلال ثابت کرتا رہوں گا۔آپ میرے ملک افغانستان پر حملہ کریں گے تب بھی میں آپ کا وفادار رہوں گا۔مگر ایک چیز ناقابل برداشت ہے اور وہ یہ کہ جامع مسجد دہلی کے منبر پر سومناتھ کی مورتی نصب کی جائے گی۔تو میرا ایمان، میرا دل و دماغ اسے برداشت نہیں کرے گا۔پھر میں اپنے تمام افغان ساتھی اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔“

ابراہیم خان کو یقین دلایا گیا کہ جامع مسجد دہلی کے منبر پر سومناتھ کی مورتی نہیں رکھی جائے گی۔سداشیو بڑی نفرت سے ابراہیم خان کو دیکھ رہا تھا۔ابراہیم خان اور دوسرے مسلمان سپاہی مراٹھوں سے وفاداری ثابت کرتے آئے تھے۔پنڈت بھاؤ خاموش تھا۔لیکن کسی بھی مسلمان پر بھروسہ کرنے کے لئے کبھی راضی نہیں رہتا تھا۔وہ اس قدر متعاصب تھا کہ اپنے ہی لشکر کے مسلمان سپاہیوں سے فاصلہ رکھ کر بات کرتا تھا تاکہ مسلمانوں کا سایہ بھی اس پر نہ پڑے۔

انہوں نے ایک عظیم الشان لشکر تشکیل دیا۔اور اس کا سپہ سالار سداشیو پنڈت بھاؤ کو بنایا۔اس لشکر کے علاوہ بالاجی کی بھی ایک فوج تھی۔جس میں پانچ لاکھ سپاہی تھے۔جب یہ لشکر پونا سے روانہ ہوا تو دکن کے ہندو جوش وخروش سے نعرے لگا رہے تھے۔راستے میں جو شہر، قصبے اور گاؤں ملتے تھے۔وہاں کے ہندو ان فوجیوں کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کرتے تھے۔فوجیوں پر پھول برساتے تھے۔اکثر مسلمان گھروں میں چھپ

جاتے تھے یا جنگلوں میں چلے جاتے تھے۔ کیونکہ مسلمانوں کو دیکھتے ہی فوج کے سپاہی ان پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ انہیں زدوکوب کرنے کے بعد قتل کر دیتے تھے۔ ان کے گھروں کو لوٹ لیا جاتا تھا اور ان کی عورتوں کی بے عزتی اور بے حرمتی کی جاتی تھی۔

بالاجی پیشوا کے ایک بھائی کو ایک مسلمان طوائف نے جنم دیا تھا۔ اس کا نام بشن سنگھ تھا۔ پنڈت بھاؤ نے بالاجی سے کہا۔ ''آپ کا ایک بھائی مسلمان عورت سے ہے اور وہ ہمارے ساتھ کھانے پینے میں شریک ہو جاتا ہے۔''

پھر اس نے بشن سنگھ کو بلا کر کہا۔ ''یہاں ہم سب سرداروں کی رائے یہ ہے کہ تم مسلمان ہو جاؤ تاکہ ہندو سردار تمہارے ساتھ کھانا نہ کھائیں۔ پانی نہ پئیں اور ان کا دھرم خراب نہ ہو۔''

بشن سنگھ نے کہا۔ ''بے شک۔ میری ماں مسلمان تھی لیکن میں ہمیشہ ہندو عورتوں اور ہندو مردوں کے ساتھ زندگی گزارتا آیا ہوں۔ میں نے مسلمانوں کی طرح کبھی عبادت نہیں کی اور ایک ہندو کی طرح دیویوں اور دیوتاؤں کی پوجا کرتا رہا ہوں۔ مجھے دھرم بدلنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ میں ہندو رہنا چاہتا ہوں۔''

دوسرے مراہٹوں کو بھی یہ منظور نہیں تھا کہ بشن سنگھ اپنا دھرم تبدیل کرے لیکن وہ سب سدا شیو پنڈت بھاؤ کے سامنے بول نہیں پاتے تھے۔ وہ ایک لشکر جرار کا سپہ سالار تھا۔ اس کے حکم کی تعمیل لازمی ہوگئی تھی۔

آخر بشن سنگھ کو مسلمان ہونے پر راضی کر لیا گیا۔ ابراہیم خان نے ایک مولوی کو بلا کر اسے کلمہ پڑھایا۔ اسے مسلمان کیا۔ مولوی نے کہا۔ ''اس کا نام اسماعیل خان رکھو۔''

لیکن ابراہیم خان نے کہا۔ ''یہ شخص دل سے مسلمان نہیں ہوا ہے۔ پنڈت بھاؤ کے حکم سے مجبور ہو کر اسلام قبول کر رہا ہے۔ اس لئے میں اس کو ایک بڑے پیغمبر کا پاک نام نہیں دے سکتا۔ لہٰذا اس کا نام شمشیر بہادر رکھا جائے۔''

وہ بشن سنگھ جب تک ہندو کہلاتا رہا۔ تب تک سدا شیو کے دماغ میں کھٹکتا رہا۔ اب اس نے مطمئن ہو کر کہا۔ ''تم اپنی ماں کے پیٹ سے مسلمان تھے۔ اب پھر مسلمان ہو گئے ہو۔ آئندہ مجھ سے دور دور سے بات کرنا۔ اپنا سایہ بھی مجھ پر نہ پڑنے دینا۔''

پنڈت بھاؤ کو پاگل یا خبطی کہنا چاہئے۔ ایک انسان دوسرے انسان سے اتنی نفرت نہیں کرتا۔ خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو لیکن مسلمان اس کے دل میں انگارے کے طرح دہکتے رہتے تھے اور دماغ میں پھوڑے کی طرح پکتے رہتے تھے۔ وہ جن اسلامی ریاستوں پر حملے کرتا تھا۔ وہاں مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی تمیز کئے بغیر قتل عام کا حکم دیتا تھا۔ غصے سے گرج گرج کر کہتا تھا۔ ''ایک مسلمان بھی اس ریاست میں زندہ نہ رہنے پائے...''

اس کی فوج میں ایک دستہ خاص طور پر لوٹ مار کے لئے رکھا جاتا تھا۔ وہ ہر گھر سے ہر محل سے مال و دولت لوٹ کر لاتے تھے۔ مسلمان عورتوں کے لئے حکم تھا کہ جو زیادہ سے زیادہ حسین ہوں، صرف انہیں پنڈت بھاؤ کے سامنے پیش کیا جائے۔ وہ پہلے انہیں اپنے لئے پسند کرتا تھا۔ باقی عورتوں کو سپاہیوں کے حوالے کر دیا کرتا تھا۔

ہندو عورتوں کے لئے حکم تھا کہ انہیں ہاتھ بھی نہ لگایا جائے۔ ان کی عزت کی جائے۔ ان کے سامنے سر جھکا کر ہاتھ جوڑ کر ان کا مان بڑھایا جائے۔

وہ جس علاقے میں لوٹ مار کرتا تھا، وہاں کی مسلمان عورتیں اس کے خیمے میں لائی جاتی تھیں۔ وہ دو چار انتہائی حسین عورتوں کو پسند کرتا تھا۔ پھر ان کی عزت آبرو کی دھجیاں اڑاتے ہوئے ان سے جانوروں کی طرح سلوک کیا کرتا تھا۔ آخر تھک ہار کر انہیں لاتیں مار کر خیمے سے نکال دیا کرتا تھا۔ اس کے بعد اپنے بستر پر لیٹ کر گہری گہری سانسیں لیا کرتا تھا۔ جیسے پوری مسلمان قوم کی ایسی کی تیسی کرنے کے بعد اطمینان حاصل ہو رہا ہو۔

اب سے پہلے احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملے کئے تھے پھر واپس چلا گیا تھا۔ پچھلی بار واپس جاتے وقت اس نے یعقوب علی خاں کو دہلی میں قلعہ دار بنایا تھا۔ جب پنڈت بھاؤ کی مراہٹہ فوج زلزلہ پیدا کرتی ہوئی دہلی کی طرف آئی تو اس وقت محمد شاہ رنگیلے کا بیٹا احمد شاہ برائے نام بادشاہ تھا۔ بھاؤ نے دہلی کے قریب پہنچ کر یعقوب خاں کو لکھ بھیجا۔ ''قلعہ کی کنجیاں ہمارے حوالے کرو۔ اور اپنی جان کی امان پاؤ۔ ورنہ حرام موت مارے جاؤ گے۔''

یعقوب علی نے جواباً لکھ بھیجا۔ ''میں احمد شاہ ابدالی کا نمک خوار ہوں۔ اس نے مجھے دہلی شہر کا محافظ بنایا ہے۔ میں آخری سانسوں تک لڑنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔ میں قلعے

کی کنجیاں تمہارے حوالے نہیں کروں گا۔"

بھاؤ نے طنزیہ انداز میں لکھ بھیجا۔"کس احمد شاہ ابدالی کی امداد کا گھمنڈ کر رہے ہو؟ جب تک وہ تمہاری مدد کو یہاں پہنچے گا۔اس وقت تک میں اس دہلی شہر کو کھنڈر بنا دوں گا۔لہٰذا خیریت چاہتے ہو تو خاموشی سے میرے حکم کی تعمیل کرو۔"

یعقوب علی نے اپنی دانست میں شہر اور قلعے کے بچاؤ کے لئے بڑے اچھے انتظامات کئے تھے لیکن وہ جانتا تھا کہ مراہٹوں کی تین لاکھ سے زیادہ کی فوج کے سامنے وہ ٹھہر نہیں پائے گا۔ایسے وقت دریائے جمنا چڑھا ہوا تھا۔احمد شاہ ابدالی کی فوج دریا عبور کر کے اس کی مدد کے لئے نہیں پہنچ سکتی تھی۔اس کے باوجود وہ سداشیو کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر آمادہ نہیں تھا۔

پنڈت بھاؤ نے چاروں طرف سے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔اور گولہ باری شروع کر دی۔ایسے ہی وقت احمد شاہ ابدالی کے وزیر اعظم اشرف الوزراء کا خط آیا۔اس نے لکھا تھا۔"دہلی شہر میں جنگ نہ ہونے دو۔ہمارے مٹھی بھر سپاہی مارے جائیں گے اور رعایا کی جان و مال کو بھی بہت نقصان پہنچے گا۔تم جنگی مصلحت کی بناء پر فی الوقت بھاؤ سے صلح کر لو۔قلعے کی کنجیاں اس کے حوالے کر دو۔جب وہ فتح کے نشے میں شرسار ہو کر دہلی سے آگے بڑھے گا،تو ہم ایک کھلے میدان میں اس کے ہوش اڑا دیں گے۔"

یعقوب علی نے حکم کی تعمیل کی۔اور قلعے کی کنجیاں سداشیو کے حوالے کر دیں۔یوں دہلی پر قبضہ کرنا مراہٹوں کے لئے بہت بڑی بات تھی۔وہ اب تک چھوٹی چھوٹی مسلمان ریاستوں کو پامال کرتے آئے تھے۔اس بار انہوں نے دارالسلطنت پر قبضہ جما لیا تھا۔انہوں نے اپنی عادت کے مطابق اس شہر میں بھی لوٹ مار کا بازار گرم رکھا۔مالِ غنیمت کے طور پر جو مسلمان حسین عورتیں اٹھا کر لائی گئیں۔انہیں پہلے پنڈت بھاؤ کے سامنے پہنچایا گیا۔اس نے دو انتہائی حسین دوشیزاؤں کو پسند کیا۔پھر باقی عورتوں کے لئے حکم دیا۔"انہیں لے جاؤ۔اور آپس میں بانٹ لو۔"

وہ تمام عورتیں چلی گئیں۔اس کی خوابگاہ میں صرف دو حسین لڑکیاں رہ گئیں۔پندت بھاؤ نے انہیں شدید نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔"سالی مسلمان

زادیاں....!تمہارے باپ دادا نے برسوں ہم پر حکومت کی اور ہماری عورتوں کی عزت آبرو سے کھیلتے رہے۔اب تمہاری باری ہے۔میں اپنی دھرتی پر کسی بھی مسلمان عورت کی آبرو کو صحیح سلامت نہیں رہنے دوں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے دونوں لڑکیوں کی پٹائی کی۔پھر ان کے لباس پھاڑنے لگا۔وہ بری طرح سہمی ہوئی تھیں۔تکلیف سے چیخ رہی تھیں۔چلا رہی تھیں۔اور وہ کہہ رہا تھا۔"جب مسلمان مرتے وقت چیختے چلاتے ہیں اور عورتیں عزت آبرو کی دہائیاں دیتی ہیں تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔خوب چیختی رہو۔خوب چلاتی رہو۔"

ان میں سے ایک دوشیزہ نے پیچھے ہٹ کر کہا۔"رک جا بھاؤ!اگر تو مسلمانوں کا دشمن ہے۔تو پھر مجھ پر کیوں ظلم کر رہا ہے؟ میں تو ہندو ہوں۔اور تیری طرح مراہٹہ قوم سے تعلق رکھتی ہوں۔"

اس نے حیرانی اور بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔"تو جھوٹ بولتی ہے۔میرے انتقام سے بچنے کے لئے مسلمان سے ہندو بن رہی ہے۔"

"میں بھولے ناتھ شیو شنکر کی قسم کھا کر کہتی ہوں اور ہماری مراہٹہ قوم کے سب سے پہلے دیس بھگت شیوا جی کی بھی قسم کھا کر کہتی ہوں۔میں ہندو ہوں۔میرا نام سرلا کھوٹے ہے۔"

بھاؤ نے کہا۔"اگر تو سچ کہہ رہی ہے تو ہمارے آدمی تجھے ان مسلمان عورتوں کے ساتھ کیوں لے آئے ہیں؟"

سرلا کھوٹے نے کہا۔"تیرے آدمی عقل کے اندھے ہیں۔وہ ہمیں بازارِ حسن سے اٹھا کر لائے ہیں۔وہاں تو ہر مذہب،ہر ذات اور ہر قوم کی لڑکیاں ہوتی ہیں۔جس طرح گیہوں کے ساتھ گھن پس جاتا ہے۔اسی طرح میں پسنے کے لئے یہاں آ گئی ہوں۔"

اس بار وہ مراہٹہ زبان میں بول رہی تھی۔سداشیو نے فوراً ہی چادر اٹھا کر اس پر ڈالتے ہوئے اس کے بدن کو چھپاتے ہوئے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔پھر سر جھکا کر کہا۔"میرے آدمیوں سے بڑی بھول ہوئی۔میں تمہیں بڑی عزت سے اچھی خاصی رقم دے کر تمہارے گھر والوں کے پاس تمہیں پہنچا دوں گا۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔"میرا گھر ہوتا تو کیا میں بازارِ حسن میں ہوتی؟ تو پہلا مرد ہے

جس نے میرا لباس تار تار کیا ہے۔ اب میں کسی دوسرے مرد کا منہ نہیں دیکھوں گی۔ دن رات تیرے ساتھ رہوں گی تو محل میں رہے یا میدان جنگ میں' تیری خدمت کرتی رہوں گی۔"

یہ کہہ کر وہ اس کے قدموں میں جھک گئی۔ اس نے اسے قدموں سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تو بہت سندر ہے۔ تو نے میرا دل جیت لیا ہے۔ بے شک اب تو میرے ساتھ رہا کرے گی۔"

اس نے اپنی داسیوں کو بلا کر کہا۔ "یہ سرلا کھوٹے ہے۔ آج سے میری گھر والی ہے۔ اسے محل کے ایک پر تکلف کمرے میں لے جا کر عزت اور آرام سے رکھو اور اس کی ہر ضرورت پوری کرتی رہو۔"

سرلا کھوٹے ان داسیوں کے ساتھ قلعے کے دوسرے کمرے میں آ گئی۔ وہاں اس نے لباس تبدیل کیا، پھر داسیوں کو حکم دیا۔ "میں تنہائی چاہتی ہوں۔ تم سب یہاں سے جاؤ۔"

وہ سب چلی گئیں۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کیا پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی سنجیدگی سے سوچتی ہوئی ایک آرام دہ مخملی بستر پر آ کر چاروں شانے چت ہو گئی۔ اس کا نام سرلا کھوٹے نہیں' سلیمہ بانو تھا۔ اس نے بڑی حاضر دماغی سے کام لے کر پنڈت بھاؤ کے جانوروں جیسے سلوک سے خود کو بچایا تھا۔

وہ سنتی آئی تھی کہ مراہٹے فوجی قوت اور اقتدار حاصل کرتے آ رہے ہیں اور انہوں نے مسلمانوں کو ہندوستان کی دھرتی سے نیست و نابود کر دینے کی قسم کھائی ہے۔ بازار حسن میں جو لوگ اس کا گانا سننے اور رقص دیکھنے آتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مراہٹے خوف و دہشت کی علامت بن چکے ہیں۔ وہ جس علاقے سے گزرتے ہیں' مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیتے ہیں۔ پھر وہی مسلمان رہ جاتے ہیں جو ان کی آمد سے قبل یا ان کے بعد کسی طرح بچ بچا کر فرار ہوتے ہیں اور جنگلوں میں جا کر پناہ لیتے ہیں۔

سلیمہ نے دیکھا تھا کہ دہلی میں مغل سلطنت کے غبارے سے ہوا نکل چکی ہے اور دوسری اسلامی ریاستیں ایک دوسرے سے متحد نہیں ہیں۔ اسی لئے مراہٹے انہیں کچلتے جا رہے ہیں۔ دہلی کے مسلمان بس ایک ہی بات کہتے تھے کہ اوپر خدا ہے اور نیچے احمد شاہ ابدالی ہے۔ ہم اسی سے آس لگائے بیٹھے ہیں۔ وہ یہ سوچ کر سہم جاتی تھی کہ مراہٹوں نے دہلی پر

حملہ کیا تو ہمارا کیا بنے گا؟ کیا وہ مجھ سے بھی جانوروں جیسا سلوک کریں گے؟

ان ہی دنوں سے اس کے دماغ میں یہ کھچڑی پک رہی تھی اور اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ ایسا وقت آئے گا تو اسے کیا کرنا چاہئے؟ ایک ہی بات سمجھ میں آئی تھی کہ فوراً مسلمان سے ہندو بن کر اپنا بچاؤ کرنا چاہئے۔

اب موجودہ حالات نے اسے مراہٹہ فوج کے سب سے بڑے سپہ سالار سداشیو پنڈت بھاؤ کے پاس پہنچا دیا تھا۔ وہ چاہتی تو پنڈت بھاؤ کا اعتماد حاصل کرنے کے بعد ہندو بن کر اس سے دور کہیں جا سکتی تھی۔ اس نے سوچا آخر بازار والی ہوں۔ میرے لئے ہندو کیا اور مسلمان کیا؟ ہر مذہب، ہر ذات، ہر قوم کے لوگ میرے کوٹھے پر آتے ہیں۔ اگر میں پنڈت بھاؤ کی گھر والی بن کر رہوں گی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس بدبخت کے اندر مسلمانوں کے خلاف زہر بھرا ہوا ہے۔ اگر میں ذہانت اور حاضر دماغی سے کام لیتی رہوں گی تو اس شیطان کے اندر کا سارا زہر نچوڑ کر رکھ دوں گی۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بڑے عزم و حوصلے سے سوچ رہی تھی۔ "پہاڑ جیسا ہاتھی تیر و تلوار سے با آسانی نہیں مرتا مگر اسے ایک چیونٹی مار ڈالتی ہے۔ پنڈت بھاؤ کو کوئی فوجی قوت زیر کرے یا نہ کرے مگر ایک طوائف اسے جہنم میں ضرور پہنچائے گی۔"

☆☆☆

دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد مراہٹوں کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ سداشیو نے کہا۔ "اب ہم دہلی کی جامع مسجد کے منبر پر سومناتھ کی مورتی لے جا کر رکھ سکتے ہیں اور وہاں پوجا پاٹ شروع کر سکتے ہیں۔"

دوسرے سرداروں نے سمجھایا کہ اس سلسلے میں جلد بازی مناسب نہیں ہو گی۔ ابھی احمد شاہ ابدالی کا خطرہ سر پر منڈلا رہا ہے۔ پہلے اسے شکست دینی ہو گی اور اگر ہم نے شکست کھائی تو اپنے علاقوں کی طرف واپس بھاگنا ہو گا۔

ایک اور سردار نے کہا۔ "فی الحال ہمیں اپنے پہلے پیشوا شیواجی کے اصولوں پر عمل کرنا ہو گا۔ یہاں کا خزانہ لوٹ کر اور جو بھی مال و اسباب ہاتھ آتا ہے، انہیں یہاں سے پونا پہنچانا ہو گا اور اپنی فوج کو دن رات احمد شاہ ابدالی سے مقابلے کے لئے تیار رکھنا ہو گا۔"

پھر انہوں نے یہی کیا۔ایک طرف تو اپنی فوج کو نئے سرے سے منظم کرتے رہے اور دوسری طرف شاہی خزانہ سمیٹتے رہے۔لال قلعے کی دیوان خاص کی چھت میں سونے کے پترے جڑے ہوئے تھے۔انہوں نے وہ تمام سونا وہاں سے اکھاڑ لیا۔اپنے پیشوا کے نام کے سکے ڈھال کر مراہٹہ ساکھ بڑھانے کے لئے اُن سکوں کو مختلف علاقوں میں بھیجتے رہے۔پنڈت بھاؤ نے اپنے پیشوا بالا جی کو خط لکھا۔''ہم نے اورنگزیب کے باپ کا قلعہ چھین لیا ہے اور ہمارے دیس کے لوٹے ہوئے سونے سے دیوان خاص کی جو چھت بنائی گئی تھی۔اس سونے سے اشرفیاں ڈھالی گئی ہیں۔انہیں آپ کی خدمت میں روانہ کیا جا رہا ہے۔

دہلی کے مسلمانوں نے ہماری فوج کے جوانوں پر گلیوں اور بازاروں میں جو حملے کئے تھے۔اس کا منہ توڑ جواب دیا گیا ہے۔بیشمار مسلمانوں کو تلواروں کے ذریعے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔

دلی میں جو بادشاہ ہے وہ محض کھلونا ہے۔محل کے طاق پر رکھا رہتا ہے۔ہم جب چاہیں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر سکتے ہیں مگر ابدالی دریا جمنا کے اس پار انوپ شہر میں موجود ہے۔ہم پہلے اسے ہندوستان سے بھاگ جانے پر مجبور کر دینا چاہتے ہیں اور بہت جلد ایسا ہوگا۔یہ آپ دیکھیں گے.....''

کرنال کے قریب چھوٹی سی ریاست گنج پورہ تھی۔مراہٹوں نے وہاں بھی حملہ کیا۔وہاں کے پٹھانوں نے بڑی جیداری سے مقابلہ کیا۔لیکن لشکر جرار کے آگے مارے گئے۔

پنڈت بھاؤ نے دہلی واپس آ کر فتح حاصل کرنے کی خوشیاں منائیں۔ایسے ہی وقت خبر آئی کہ احمد شاہ ابدالی نے دریائے جمنا کو عبور کر لیا ہے۔اس کا لشکر باغ پت کے گھاٹ پر آ پہنچا ہے۔

پندت بھاؤ اس سے مقابلہ کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔احمد شاہ ابدالی کی فوج دریا پار کرنے کے بعد ابھی دم لینے بھی نہ پائیں تھیں کہ بھاؤ کی فوجیں اس کے مقابلے کے لئے پہنچ گئیں۔انہوں نے وہاں پہنچتے ہی حملہ کیا۔مسلمان اگرچہ ہشیار تھے۔مگر یہ توقع نہیں کر رہے تھے کہ مراہٹے اتنی جلدی سامنے آ جائیں گے۔

احمد شاہ ابدالی نے بیشمار جنگیں لڑی تھیں،وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کن حالات میں کیسی حکمت عملی اختیار کرنی چاہئے۔اس کے جنگی تجربات نے پنڈت بھاؤ کی خوش فہمی ختم کر دی۔اسے بڑا غرور تھا کہ ایک لشکر جرار کا سپہ سالار ہے۔جس میں پانچ لاکھ سپاہی ہیں۔وہ سپاہی اب پیچھے ہٹ رہے تھے۔ان دنوں جنگ کا یہ دستور تھا کہ شام ہوتے ہی اندھیرا پھیلنے سے پہلے جنگ بند ہو جاتی تھی پھر دوسری صبح لڑائی شروع ہوتی تھی۔

دس دنوں تک یوں ہی صبح سے شام تک جنگ ہوتی رہی۔ابدالی کے سپاہیوں نے مار کرتے ہوئے مراہٹہ فوج کو پانی پت کے میدان تک پیچھے ہٹا دیا۔دشمنوں کو چار کوس یعنی چھ میل پیچھے جا کر چھاؤنی ڈالنی پڑی۔

مراہٹوں کے عادت تھی کہ وہ جب شکست کھانے لگتے تھے تو بظاہر پیچھے ہٹ جاتے تھے۔لیکن رات کی تاریکی میں اچانک حملہ آور ہوتے تھے۔احمد شاہ ابدالی نے حکم دیا کہ اپنے لشکر کے چاروں طرف بیس گز چوڑی خندق کھودی جائے۔

لشکر کے تمام سپاہی' سردار' سپہ سالار اور خود احمد شاہ ابدالی خندق کو کھودنے میں مصروف ہو گیا۔ان سب نے مل کر ایسی پھرتی سے خندق تیار کی۔جس کی مثال کسی بھی جنگی تاریخ میں نہیں ملتی۔ہر سردار' ہر سوار مزدور بن گیا تھا۔خندق بیس گز چوڑی تھی اور اتنی گہری تھی کہ اگر ہاتھی اس کے اندر کھڑا ہوتا تو باہر سے دکھائی نہ دیتا۔تمام سپاہی خندق کھودنے کے دوران میں نعرہ تکبیر بلند کرتے رہتے تھے۔اور درود شریف پڑھتے رہتے تھے۔اور یہ کہتے رہتے تھے کہ آج ہم اپنے رسول ﷺ کی سنت پر عمل کر رہے ہیں۔جنہوں نے اپنی گنتی سے دس گنا زیادہ دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لئے مدینے کے گرد خندق کھودی تھی۔اور خود رسول اللہ ﷺ کئی وقت کی فاقے کی حالت میں پیٹ پر پتھر باندھے اپنے اصحابؓ کے ساتھ خندق کھودتے رہے تھے۔

جب مراہٹوں کو یہ خبر پہنچی تو انہوں نے بھی اپنے لشکر کے آس پاس خندق کھودی۔ان دونوں خندقوں کے درمیان میں چھ میل کا فاصلہ تھا۔اب دور ہی دور سے توپوں کے ذریعے گولے داغے جاتے تھے۔اور تیر چلائے جاتے تھے۔

پنڈت بھاؤ نے سردار گوبند پنڈت کو حکم دیا''دس ہزار سوار لے کر ابھی یہ

جاؤ۔ گنگا اور جمنا کے بیچ میں جتنے شہر، قصبے اور جتنے دیہات ہیں۔ وہاں سے مسلمانوں کو رسد پہنچائی جارہی ہے۔ تم ان سب کو لوٹ لو۔ اور یادرکھو ابدالی کی فوج تک کھانے پینے کی ایک چیز بھی نہیں پہنچنی چاہیئے۔"

دوسرے ہی دن ابدالی کی فوج میں رسد نہیں پہنچی۔ تب پتہ چلا کہ کھانے پینے کی چیزوں کو وہاں تک پہنچنے سے روکا جارہا ہے۔ اس نے سردار عطائی خاں کو بلا کر حکم دیا۔ "ابھی دو ہزار سوار لے کر جاؤ۔ اور گوبند پنڈت کا سرکاٹ کر لے آؤ۔"

پنڈت بھاؤ نے بڑی اچھی چال چلی تھی۔ اگر واقعی فوج کا راشن روک دیا جاتا۔ تو وہ بھوک پیاس سے نڈھال ہو جاتے اور مقابلہ کرنے کے قابل نہ رہتے۔ گوبند پنڈت کے دس ہزار سپاہی گنگا جمنا کے درمیان مختلف چھوٹے بڑے شہروں میں پہنچے ہوئے تھے۔ اور وہاں سے راشن کی سپلائی روک رہے تھے۔ ایسے میں سردار عطائی خان اپنے دو ہزار ساہیوں کے ساتھ وہاں آپہنچا۔ گوبند پنڈت اسے دیکھتے ہی بوکھلا گیا۔ اس کی فوج کے سپاہی مختلف علاقوں میں جانے کے باعث منتشر ہو گئے تھے۔ وہ ان کا مقابلہ نہ کرسکا۔ فرار ہونا چاہا تو مارا گیا۔ مختلف علاقوں میں اس کے جو سپاہی تھے وہ بھی اتنی کم تعداد میں تھے کہ مسلمان سپاہیوں کا مقابلہ نہ کرسکے۔ یا تو مارے گئے۔ یا فرار ہو گئے۔

سردار عطائی خان نے گوبند پنڈت کا سرکاٹ کر احمد شاہ ابدالی کے قدموں میں لا کر رکھ دیا۔ جب پنڈت بھاؤ کو خبر ملی کہ پنڈت مارا گیا ہے اور دس ہزار سپاہی بھی یا تو مارے گئے ہیں یا دم دبا کر کہیں بھاگ گئے ہیں تو اسے بہت صدمہ پہنچا۔ سب سے بڑا صدمہ یہ ہوا کہ اس علاقے سے اس کا راشن آنا بھی بند ہو گیا۔ سردار عطائی خان نے اپنے سپاہیوں کو وہاں پہرے پر بٹھا دیا تھا۔ ان علاقوں کا کوئی بنیا یا ساہوکار کھانے پینے کی کوئی چیز مراہٹہ سپاہیوں تک نہیں پہنچا سکتا تھا۔

پنڈت بھاؤ نے اپنے ایک سردار کو حکم دیا کہ وہ دلی جا کر وہاں سے خزانہ لے آئے۔ تاکہ فوج کے لئے رسد کے خریداری ہوسکے۔ بھوک صرف اناج کی نہیں ہوتی۔ جنسی بھوک بھی ہوتی ہے۔ جب لشکر کے سپاہی اپنا علاقہ چھوڑ کر جنگ لڑنے کے لئے دور دراز کے علاقوں میں جاتے ہیں تو تین وقت کی روٹیاں ملتی ہی رہتی ہیں لیکن عورت نہیں

ملتی۔ مقبوضہ علاقوں میں جو ملتی ہیں۔ وہ ہزاروں لاکھوں سپاہیوں کے لئے ناکافی ہوتی ہیں۔ مراہٹہ سپاہیوں کے لئے وہ دن خوشیوں کے ہوا کرتے تھے۔ جب وہ کسی علاقے پر قبضہ جماتے تھے۔ وہاں لوٹ مار کرتے تھے، پھر ایسے بھوکے ہوتے تھے کہ جوان عورتیں تو کیا، بوڑھیوں اور بچیوں کو بھی نہیں چھوڑتے تھے۔

ان مال غنیمت میں لوٹی ہوئی عورتوں کے لئے حکم تھا کہ ان کے ساتھ دو چار دن گزارے جائیں۔ لیکن انہیں مستقل فوج میں اپنے ساتھ نہ رکھا جائے۔ کیونکہ کسی بھی لشکر میں کھانے پینے کا مسئلہ سب سے اہم ہوتا ہے اور اکثر اناج کی کمی ہو جایا کرتی ہے۔ ان حالات میں صرف فوج کا سپہ سالار اور چند اعلیٰ عہدیدار اپنے ساتھ ایک آدھ عورت رکھتے تھے۔ باقی ہزاروں لاکھوں سپاہی دور ہی دور سے ان چند عورتوں کو اپنے اعلیٰ عہدیداروں کے پاس دیکھ دیکھ کر ترستے رہتے تھے۔

سپہ سالار سدا شیو پنڈت بھاؤ اور دوسرے اعلیٰ عہدیداروں کے خیمے اُن سپاہیوں سے ذرا الگ نصب کئے جاتے تھے۔ وہاں رہنے والی عورتیں ان خیموں سے باہر نکل کر ایک دوجے کے ساتھ ہنستی بولتی رہتی تھیں۔ ادھر سے ادھر آتی جاتی دکھائی دیتی رہتی تھیں۔ ان میں سرلا کھوٹے سب میں نمایاں تھی۔ اس کی چال میں رقص کا انداز ہوتا تھا۔ وہ جان بوجھ کر ایسی ادائیں دکھاتی تھی کہ دور سے دیکھنے والے سپاہی للچانے لگتے تھے۔ دل پکڑ کر رہ جاتے تھے۔

وہ کسی اور کی بیٹی، بہن یا بیوی ہوتی تو کتنے ہی سپاہی اس پر پل پڑتے اور اس کے چیتھڑے اڑا دیتے لیکن وہ سردار سدا شیو پنڈت بھاؤ کی داشتہ تھی۔ میدان جنگ میں دلیری دکھانے والے سپاہی اس تیز طرار حسینہ کو ہاتھ لگانے کی جرات بھی نہیں کرسکتے تھے۔

لیکن سرلا کھوٹے جیسے پنڈت بھاؤ سے خوفزدہ نہیں تھی۔ اس نے ایک مسلمان سپاہی جہاندار ربانی کو تاڑ لیا تھا۔ اسے دیکھ کر ایسے مسکراتی تھی اور ایسی ادائیں دکھاتی تھی جیسے اپنی طرف بلا رہی ہو۔ وہ ہاتھی جیسے ڈیل ڈول والا دلیر سپاہی تھا۔ کئی مہینوں سے عورتوں کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اور تعبیر نہیں مل رہی تھی۔ اب سے پہلے مراہٹہ فوج نے جتنے علاقوں میں لوٹ مار کی تھی وہاں ہندو سپاہیوں نے مال غنیمت میں حاصل ہونے والی عورتوں کو آپس

میں بانٹ لیا تھا۔اور انہیں اپنے ہی لشکر کے مسلمان سپاہیوں تک پہنچنے نہیں دیا تھا۔

وہ بھوکا پیاسا جہاندار ربانی دور ہی دور سے سرلا کھوٹے کو دیکھتا تھا تو یوں لگتا تھا جیسے ٹھنڈے میٹھے پانی کا دریا قریب ہی ہے۔اور ساحل پر دستر خوان بچھا ہوا ہے اور اس دستر خوان کے دانے دانے پر اسی کا نام لکھا ہوا ہے۔

ربانی تڑپ جاتا تھا۔اور جوش وجنون میں سوچتا تھا کہ جان جاتی ہے تو جائے ،مگر ایک بار اس چنچل حسینہ پر جھپٹ پڑے۔پھر اسے ایسا ایک موقع مل ہی گیا۔احمد شاہ ابدالی کے ساتھ کئی دنوں سے جنگ جاری تھی۔وہ جنگ صبح شروع ہوتی تھی اور شام کو بند ہو جاتی تھی پھر دوسری صبح شروع ہو جاتی تھی۔ان ہی دنوں ربانی لڑنے کے دوران زخمی ہو گیا تھا۔زخمی سپاہیوں کی مرہم پٹی کی جاتی تھی اور انہیں آرام کرنے کی اجازت دی جاتی تھی۔لہٰذا دوسرے دن سداشیو پنڈت بھاؤ' دوسرے اعلیٰ عہدیدار اور تمام سپاہی میدان جنگ کی طرف گئے تو ربانی دوسرے زخمی سپاہیوں کی طرح اپنے خیمے میں پڑا ہوا تھا۔مگر ان کے جاتے ہی اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

اس نے خیمے سے باہر آ کر دیکھا۔ایک طرف دور تک سپاہیوں کے ہزاروں خیمے تھے اور دوسری طرف سپہ سالار اور اعلیٰ عہدیداروں کے خیمے دکھائی دے رہے تھے۔وہیں پنڈت بھاؤ کے خیمے کے پاس سرلا کھوٹے کھڑی ہوئی تھی۔ہاتھوں کے اشارے سے سمجھا رہی تھی کہ خیمے کے پچھلے حصے سے چلے آؤ۔

وہ اسے دعوت دینے کے بعد اندر آ گئی۔ذرا فاصلے پر دور دور تک دوسرے اعلیٰ عہدیداروں کے خیمے تھے۔جہاں ان کی داشتائیں رہتی تھیں۔سرلا کھوٹے نے ان سے کہہ دیا تھا کہ اس کے سر میں درد ہے۔وہ اپنے خیمے میں آرام کرے گی۔ہو سکتا ہے کہ سو جائے۔لہٰذا کوئی اس کے خیمے میں نہ آئے۔

چونکہ وہ سپہ سالار سداشیو بھاؤ کی داشتہ تھی اس لئے دوسری تمام عورتیں اس سے کم تر تھیں اور اس کا حکم مانتی تھیں۔اس لئے کسی نے اس کے خیمے کی طرف رخ نہیں کیا۔

وہ پچھلے راستے سے اندر چلا آیا۔سرلا کھوٹے اپنے بستر پر بڑے ہی جذباتی انداز میں پڑی ہوئی تھی۔بکھرا ہوا انگ انگ کہہ رہا تھا کہ آؤ مجھے سمیٹ لو اور وہ جیسے جنم جنم کا بھوکا

پیاسا تھا۔دیوانہ وار آگے بڑھا تو سرلا نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔"رک جا....."

وہ رک گیا۔اس نے پوچھا۔"مجھ سے محبت کرنے آیا ہے یا صرف ضرورت پوری کرنے؟"

"اگر تمہاری محبت مل جائے تو میں خود کو دنیا کا سب سے خوش نصیب آدمی سمجھوں گا۔"

"تو پھر ابھی ضرورت کی طرف نہ آ۔پہلے محبت سے باتیں کر۔یہ بتا مجھے حاصل کرنے کے لئے تُو کیا کر سکتا ہے؟"

"میرے پاس دولت نہیں ہے۔بس ایک جان ہے۔وہ دے سکتا ہوں اور تم دیکھ رہی ہو کہ جان پر کھیل کر یہاں آیا ہوں۔"

"ہاں۔یہ تو میں دیکھ رہی ہوں۔کیا تُو میرے لئے کسی کو قتل کر سکتا ہے؟"

"صرف ایک قتل نہیں' قتل عام کر سکتا ہوں۔"

"میں ایک دشمن کا کٹا ہوا سر چاہتی ہوں۔"

"میں تمہارے لئے کٹے ہوئے سروں کا مینار کھڑا کر سکتا ہوں۔"

اس نے پوچھا۔"تو میدان جنگ میں پنڈت بھاؤ کے ساتھ رہتا ہے؟"

"ہاں۔حالات جنگ کے مطابق کبھی اس کے قریب ہوتا ہوں۔کبھی اس سے دور ہو جاتا ہوں۔"

"تجھے اس کے قریب رہنا چاہئے۔"

اس نے سر ہلا کر کہا۔"میں سمجھ رہا ہوں تم چاہتی ہو کہ میں پنڈت بھاؤ کے قریب رہ کر اس کی حفاظت کرتا رہوں؟"

وہ سخت لہجے میں بولی۔"نہیں۔میں اس کا کٹا ہوا سر چاہتی ہوں۔"

ربانی نے چونک کر اسے بے یقینی سے دیکھا۔وہ بولی۔"تو حیران کیوں ہے؟"

وہ بولا۔"میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تم ہندو ہو، اور اپنے ہی ہندو سپہ سالار کا کٹا ہوا سر کیوں چاہتی ہو؟"

وہ بستر پر لیٹے لیٹے بدن کے زاویئے بدلتے ہوئے بولی۔"یہ میری ضرورت

ہے۔اس سے آگے کوئی سوال نہ کر۔بس ایک جواب دے۔کیا اس کا کٹا ہوا سر میرے
قدموں میں لائے گا؟.... ہاں یا ناں؟''

''ہاں۔مگر.....''

''یہ اگر مگر کیا ہے؟''

''میں کہنا چاہتا ہوں' اس کا سر کاٹنے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں بھی مارا جاؤں
گا۔سارا لشکر مجھ پر ٹوٹ پڑے گا۔مجھے اپنی جان کی پرواہ نہیں ہے۔لیکن وہ مجھے اتنا موقع
نہیں دیا جائے گا کہ اس کا سر کاٹ کر تمہارے قدموں میں لاسکوں۔''

''میں تیری کوئی مجبوری سننا نہیں چاہتی۔تُو مسلمان ہے تو زبان دے کہ اس کا کٹا
ہوا سر میرے پاس لائے گا۔''

''میں زبان دیتا ہوں۔آخری سانس تک میری یہی کوشش ہوگی۔اب ہمیں سمجھ
لینا چاہئے کہ یہ ہماری پہلی اور آخری ملاقات ہے۔''

وہ دونوں بانہیں پھیلا کر بولی۔''ہاں۔آجا...اور میرے سلگتے ہوئے وجود سے
پہلی ملاقات کرلے۔ہوسکتا ہے یہ آخری ملاقات نہ ہو۔ہوسکتا تقدیر کو کچھ اور ہی منظور ہو۔''

اس نے حملے کی دعوت تھی۔وہ سپاہی تھا۔مگر ہاتھ میں تلوار نہیں تھی۔شب خون
مارنے والے چھپ کر آتے ہیں اور ہتھیار چھپا کر لاتے ہیں اور توقع سے کچھ زیادہ ہی توڑ
پھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔وہ ایک دم سے اس پر ٹوٹ پڑا۔

پنڈت بھاؤ بڑے جوش و جذبے سے پورے ہندوستان کو فتح کرنے نکلا
تھا۔اپنے لشکر جرار میں پانچ لاکھ سپاہیوں کو دیکھ کر بڑے فخر سے کہتا تھا کہ ہندوستان کے
ایک ایک مسلمان کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دے گا اور احمد شاہ ابدالی جیسے زبردست
حملہ آور کو اپنی دھرتی سے دم دبا کر بھاگنے پر مجبور کر دے گا۔

جب سر پر پڑتی ہے تب پتہ چلتا ہے کہ وہ پڑنے والی ہتھوڑی نہیں ہتھوڑا
ہے۔پچھلے کئی دنوں سے جاری رہنے والی جنگ نے اس کے ہوش اڑا دیئے تھے۔احمد شاہ
ابدالی اپنی جنگی مہارت کے ذریعے اسے ہر محاذ پر شکست دیتا جارہا تھا۔

پنڈت بھاؤ نے اس کے لشکر کی اناج کی ترسیل روکنی چاہی تو اسے زبردست

نقصان اٹھانا پڑا۔اس کے دس ہزار مرہٹے سپاہی مارے گئے۔الٹا اس کی ہی فوج کے لئے
اناج کی ترسیل رک گئی۔اب اس کے آدمی دہلی گئے تھے۔وہاں جو بچا کھچا خزانہ تھا۔اسے
سمیٹ کر لانے والے تھے اور اس کے ذریعے فوج کے لئے اناج خریدنے والے تھے۔

پنڈت بھاؤ نے اپنے آدمیوں کو سمجھایا تھا کہ نہایت رازداری سے دہلی جا کر
خزانہ سمیٹ کر لایا جائے۔اس کے حکم کی تعمیل کی جارہی تھی۔فوج کا ایک چھوٹا سا دستہ دہلی
گیا تھا۔وہ رات کی تاریکی میں خچروں پر خزانہ اور بیل گاڑیوں میں اناج لاد کر لارہا تھا۔

یہ کہنا چاہئے کہ ایسے وقت پنڈت بھاؤ کے ستارے گردش میں آگئے تھے۔اس کی
فوج کا وہ دستہ رات کے اندھیرے میں بھٹک کر احمد شاہ ابدالی کے لشکر میں چلا آیا۔دوسری
صبح پنڈت بھاؤ نے سنا کہ اس کی فوج کے اس دستے کے تمام سپاہی مارے گئے ہیں اور جو
خزانہ اور اناج دہلی سے لایا گیا تھا۔وہ بھی چھین لیا گیا ہے۔اس صورت حال نے اسے
جھاگ کی طرح بٹھا دیا۔

اب اس کی فوج میں زیادہ سے زیادہ دو دن کا راشن رہ گیا تھا۔اس کے بعد تمام
سپاہی پیٹ پر پتھر باندھ کر نہیں لڑ سکتے تھے۔اس کے سامنے دو ہی راستے رہ گئے تھے کہ
شکست کھا کر واپس بھاگ جائے یا پھر احمد شاہ سے صلح کرلے۔اس نے اپنے ایک قاصد کو
اپنی پگڑی دے کر نواب شجاع الدولہ کے پاس بھیجا۔اور یہ لکھا''۔ہم آپ کے پگڑی بدل
بھائی بننا چاہتے ہیں۔ہمارے حالات ناموافق ہیں۔آپ اپنے اس بھائی کی مدد فرمائیں
اور کسی بھی طرح احمد شاہ ابدالی سے صلح کرادیں۔ہم نہیں چاہتے کہ یہ جنگ جاری رہے اور
دونوں طرف کے سپاہی خواہ مخواہ مارے جائیں۔''

نواب شجاع الدولہ نے اپنی پگڑی بھیج کر اسے یقین دلایا کہ ہم آپ کے بھائی
بن چکے ہیں اور انشاء اللہ احمد شاہ ابدالی سے ضرور آپ کی صلح کرائیں گے۔

وہ اپنی چھوٹی سی فوج لے کر خود ہی احمد شاہ کے پاس گیا اور کہا۔''کئی دنوں سے
جنگ جاری ہے۔دونوں طرف کے سپاہی مارے جارہے ہیں۔اگر آپ مناسب سمجھیں تو
یہ خون خرابہ ختم ہوسکتا ہے۔سداشیو پنڈت بھاؤ صلح کے لئے آمادہ ہے۔''

احمد شاہ نے کہا۔''صلح کرنے کے سلسلے میں میں اپنا کوئی فیصلہ سنانا نہیں

چاہتا۔ میں تو آپ لوگوں کی مدد کرنے کے لئے یہاں آیا ہوں۔ آپ تمام مسلمان یہاں کے تمام معاملات سے نمٹ سکتے ہیں۔''

کئی امراء اور سرداروں نے کہا کہ صلح ہو جانا چاہئے۔ جنگ جاری رکھنا مناسب نہیں ہے۔ لیکن نواب نجیب الدولہ نے اعتراض کیا اور کہا۔''مراہٹے دشمن اسلام ہیں۔ وہ لال قلعہ پر قبضہ کر چکے ہیں۔ دیوان خاص کی چھت سے سونا اتار لیا ہے۔ سارا خزانہ لوٹ لیا ہے۔ اپنے نام کے سکے ڈھال کر ہندوستان کے تمام ہندو راجاؤں کو یہ یقین دلایا ہے کہ یہ لوگ دہلی کے بادشاہ بن چکے ہیں۔ ان لوگوں نے کنج پورہ کے بیس ہزار افغانوں کو بڑی بے رحمی سے قتل کیا ہے۔''

نجیب الدولہ نے احمد شاہ ابدالی سے کہا۔''اگر ہم آج صلح کر لیں گے تو کل آپ کے جاتے ہی یہ مراہٹے تازہ دم ہو کر مسلمان حکمرانوں پر حملے کریں گے۔ اور ایک ایک کو چن چن کر قتل کر ڈالیں گے۔''

ایک سردار نے کہا۔''کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ ایسا کرے۔ وہ ہم سے تقریباً جنگ ہار چکا ہے۔ اس کی کمر ٹوٹ چکی ہے۔ وہ صلح کے بعد یہاں سے اپنے علاقے میں واپس جائے گا تو پھر ادھر پلٹ کر نہیں آئے گا۔''

اس روز کوئی بات طے نہ ہو سکی۔ دوسرے دن بھی یہی بحث جاری رہی۔ احمد شاہ ابدالی نے کہا۔''آپ لوگ خوب سوچ سمجھ کر کسی نتیجے پر پہنچیں۔ اگر آپ صلح کرنا چاہیں گے تو یہاں ہمارے فرض کی ادائیگی نہیں رہے گی۔ ہم واپس چلے جائیں گے۔ ویسے نجیب الدولہ کی بات دل کو لگتی ہے۔ یہ ہندو قابل اعتماد نہیں ہیں۔ ہمارے جاتے ہی پلٹ کر حملہ کر سکتے ہیں۔''

دو دنوں تک جاری رہنے والی بحث سے یہ تاثر پیدا ہو رہا تھا کہ شائد صلح ہو جائے گی۔ جنگ ختم ہو جائے گی اور آئندہ زرہ بکتر پہن کر اور ہتھیاروں سے لیس ہو کر نہیں رہنا پڑے گا۔ پنڈت بھاؤ کی یہی جنگی چال تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ صلح کا پیغام بھیج کر جنگ میں تعطل پیدا کیا جائے۔ مسلمانوں کو لڑائی کی مستعدی سے غافل رکھا جائے پھر ان کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر اچانک ہی ان پر شب خون مارا جائے۔

وہ بڑی رازداری سے اپنے اس منصوبے پر عمل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن احمد شاہ ابدالی کے مخبر بہت ہی مستعد اور باخبر رہتے تھے۔ ایک مخبر نے آدھی رات کو آکر اطلاع دی کہ پنڈت بھاؤ مکاری سے ہمیں زیر کرنا چاہتا ہے۔ آج رات پچھلے پہر وہ اپنے پورے لشکر کے ساتھ شب وخون مارنے والا ہے۔

احمد شاہ ابدالی کے سپاہی بہت ہی تربیت یافتہ تھے۔ اس کا حکم سنتے ہی برق رفتاری سے زرہ بکتر پہن کر ہتھیاروں سے لیس ہو کر گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ تیر انداز اور توپ چلانے والے پہلی صفوں میں آتے ہی آگے بڑھنے لگے۔

دوسری طرف سے پنڈت بھاؤ کی فوج آگے بڑھتی آ رہی تھی۔ انہوں نے جب دور سے مسلمانوں کو منظم اور مستعد پایا تو حیران رہ گئے۔ وہ حملہ کرنے آئے تھے۔ اس کے برعکس ابدالی کی فوج نے ان پر حملہ کر دیا۔ گھمسان کی لڑائی ہونے لگی۔ دوسرے دن کا سورج نکلتے نکلتے مراہٹہ فوج کے قدم اکھڑنے لگے۔ وہ پیٹھ دکھا کر بھاگنے لگے۔

ربانی ایسے وقت پنڈت بھاؤ کے ساتھ ساتھ تھا۔ مناسب موقع کا انتظار کر رہا تھا۔ بھاؤ اپنے سپاہیوں کو بھاگتے دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ چیخ چیخ کر انہیں رکنے اور مقابلہ کرنے کے لئے جوش دلا رہا تھا۔ ایسے ہی وقت ربانی نے اس کی طرف ایک نیزہ پھینک کر مارا۔ وہ نیزہ گھوڑے کی گردن میں آکر پیوست ہوا۔ گھوڑا لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اس کے ساتھ پنڈت بھاؤ اچھل کر زمین پر آ گیا۔ وہ قلابازیاں کھاتا ہوا ایک جگہ پہنچ کر رکا۔ اس کے بدن کی ہڈیاں دکھنے لگی تھیں۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ربانی اس کے سر پر آ پہنچا تھا۔ تلوار کا ایک ہاتھ مارا تو وہ زخمی ہو کر لڑکھڑاتا ہوا پیچھے گیا پھر اپنی تلوار سے جوابی حملہ کرتے ہوئے بولا۔''نمک حرام.....! میرا کھاتا ہے اور مجھ پر حملہ کرتا ہے۔ میرے باپ دادا یہ سچ کہتے آئے ہیں کہ کبھی کسی مسلمان پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔''

دونوں بڑھ بڑھ کر تلواروں سے حملے کر رہے تھے۔ ربانی نے کہا۔''ہمارے باپ دادا نے بھی یہی سمجھایا ہے کہ ایک طرف سے سانپ ڈسنے آ رہا ہو اور دوسری طرف سے ہندو حملہ کرنے آ رہا ہو تو پہلے ہندو کو مارو۔''

پنڈت بھاؤ کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ لڑنے کے دوران وہ اچانک ہی لڑکھڑایا اور

گرنے لگا۔ایسے ہی وقت ربانی نے تلوار کا ایک ہاتھ اس کی گردن پر مارا۔تو سرتن سے جدا ہوگیا۔

مراہٹہ فوج تتر بتر ہوگئی تھی۔تمام سپاہی بھاگ رہے تھے۔احمد شاہ ابدالی نے حکم دیا کہ سانپوں کو کسی بل میں گھسنے نہ دو۔انہیں کچل ڈالو۔کوئی زندہ نہ بچے۔ان کی زندگی مسلمانوں کی موت ہے۔

مسلمان سپاہیوں نے ان کے پیچھے گھوڑے دوڑا دیئے۔انہوں نے چالیس کوس تک ان کا پیچھا کیا۔اور انہیں جہنم میں پہنچاتے چلے گئے۔ابدالی نے پوچھا۔"پنڈت بھاؤ کہاں ہے؟اسے یا تو گرفتار ہونا چاہئے۔یا اس کی لاش ملنی چاہئے۔"

تھوڑی دیر بعد خبر ملی کہ بھاؤ کی لاش مل گئی ہے۔لیکن اس کا سر نہیں ہے۔ابدالی نے پوچھا۔"سر کے بغیر کیسے پہچانا جاسکتا ہے کہ وہ بھاؤ کی لاش ہے؟"

وہاں چند برہمنوں کو قیدی بنایا گیا تھا۔انہوں نے کہا۔"ہم نے جسم کے نشانات سے بھاؤ کو پہچانا ہے۔یہ اسی کی لاش ہے۔"

ابدالی نے کہا۔"پھر بھی لاش کے آس پاس اس کا سر تو ہونا چاہئے۔آخر سر کہاں چلا گیا؟"

آخر ایک قیدی مراہٹہ سپاہی نے کہا۔"میں نے جہاندار ربانی کو بھاؤ کا سر کاٹ کر یہاں سے جاتے دیکھا ہے۔وہ گھوڑے پر سوار اس کٹے ہوئے سر کو فاتحانہ انداز میں اٹھائے۔ہمارے خیموں کی طرف جا رہا تھا۔"

وہ سب پنڈت بھاؤ کے خیمے کے پاس آئے۔تو وہاں پہنچتے ہی ٹھٹک گئے۔خیمے کے سامنے زمین پر بھاؤ کا سر پڑا ہوا تھا۔سرلا کھوٹے اس پر کھڑی ہو کر ربانی کے برابر ہو کر اس کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔اور اسے بڑے پیار سے چومتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

احمد شاہ ابدالی اس آخری معرکہ کے بعد ہندوستان سے چلا گیا۔وہاں کے مسلمانوں پر اتنا احسان کیا کہ مراہٹوں کی کمر توڑ ڈالی۔افسوس کا مقام یہ ہے کہ اس کے بعد بھی مغلیہ خاندان کی آخری نسل کو نہ عقل آئی نہ عبرت حاصل ہوئی۔وہ عیش وعشرت میں

ڈوبے رہے۔ہندو بنئے اور ساہوکاروں کے قرض دار ہوتے چلے گئے۔مراہٹوں میں اگرچہ اب دم خم نہیں رہا تھا' تاہم انہوں نے روہیلوں اور قرض دینے والے ساہوکاروں سے اتحاد کر کے ان قرض دار مغل حکمرانوں پر حاوی ہو گئے۔

انہوں نے اس وقت کے مقروض بادشاہ عالم گہر عرف شاہ علم ثانی سے بالکل غلاموں جیسا سلوک کیا۔یہ حکم صادر کیا کہ بادشاہ' بیگمات، کنیزیں' شہزادیاں اور شہزادے قلعہ معلے سے باہر نہیں نکلیں گے۔صرف کھڑکیوں سے جھانک کر آسمان دیکھ سکیں گے۔وہاں کے تمام دروازے چنوا دیئے گئے۔صرف دو دروازے آمد ورفت کے لئے کھلے رکھے گئے۔جہاں مسلح سپاہیوں کا سخت پہرہ لگا رہتا تھا۔

مراہٹہ رہنما مادھو سندھیا' بادشاہ اور شہزادوں کو زیادہ سے زیادہ ذلیل کرنا چاہتا تھا۔اس نے نظام الدین نامی ایک شخص کو ان کا نگراں مقرر کیا۔اور حکم دیا کہ ان کے اخراجات میں انتہائی کمی کی جائے۔وہ شخص بادشاہ شاہ عالم ثانی کو روزانہ دو سیر چاول اور آدھ سیر گوشت دیا کرتا تھا۔اس راشن میں بمشکل پانچ افراد کھا سکتے تھے۔دوسرے شہزادے اور شہزادیوں کو الگ راشن دیا جاتا تھا۔بادشاہ کے دسترخوان پر جو روزانہ کھانا ہوا کرتا تھا۔اس میں بادشاہ کا معالج خاص، ولی عہد اور اس کی چھوٹی لڑکی ہوتی تھی۔اس بادشاہ کی دو سو بیویوں میں سے کوئی ایک بیوی اس دسترخوان پر آتی تھی۔ایک بیوی سے زیادہ کی گنجائش نہیں تھی۔اس حساب سے بادشاہ کے ساتھ کھانے کے لئے کبھی بھی بیوی کا نمبر چھ مہینے کے بعد آتا تھا۔

انگریز تجارت کرنے ہندوستان آئے تھے۔اور اپنی فوجی قوت بڑھاتے جا رہے تھے۔مراہٹے بھی ان کے زیر اثر آگئے تھے۔انہوں نے ایک انگریز افسر ڈی بوئی کو اپنا وائسرائے بنایا۔اس نے مراہٹوں کو حکم دیا کہ بادشاہ کا الاؤنس پانچ ہزار روپے کر دیا جائے۔بیگمات اور شہزادیوں کو جاگیریں دی جائیں۔

اس طرح بادشاہ شہزادوں اور شہزادیوں کو اخراجات کے لئے کچھ رقمیں ملنے لگیں۔ایسی محتاجی اور ذلت کی زندگی گزارنے کے باوجود بادشاہ اور شہزادے عیاشی سے باز نہیں آتے تھے۔شاہ عالم کی دو سو بیویاں تھیں۔اور شاہ عالم کا بیٹا اکبر اٹھارہ سال کی عمر میں

اٹھارہ بیویوں کا شوہر تھا۔ ان کے علاوہ دوسرے مقتول بھائیوں کے بیٹے بھی شہزادے اور سلاطین کہلاتے تھے۔ ان سب کی تعداد دو ہزار سے کچھ زیادہ تھی۔

شاہ عالم جب انگریزوں کی حفاظت میں آیا۔ تو انہیں قلعہ معلی میں بڑی حد تک آزادی دی گئی۔ انگریزوں کے حکم سے وہ باہر کے لوگوں سے رابطہ کر سکتے تھے۔ پھر ان کے الاؤنس میں اضافہ کر دیا گیا تھا۔ رقمیں کچھ اور زیادہ ملنے لگی تھیں۔ بادشاہ اور شہزادوں کی عیاشیاں کچھ اور بڑھ گئی تھیں۔ ایک فرانسیسی سیاح نے شاہ عالم کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی پانچ سو سے زائد محرمات ہو گئی تھیں۔ جن سے اس کے ستر لڑکے لڑکیاں تھیں۔ اور کوئی سال ایسا نہیں جاتا تھا جب کئی کئی بچے پیدا نہ ہوتے ہوں۔

ایک دوسرے سیاح داماداؤ نے لکھا ہے کہ شاہ عالم عورتوں کا شوقین تھا۔ پانچ سو محرمات کے علاوہ بیشمار کنیزیں بھی رکھتا تھا۔ میلوں دور تک پھیلے ہوئے قلعہ معلی میں وہ بادشاہ، شہزادے اور شہزادیاں ہزاروں کی تعداد میں یوں رہتے تھے جیسے خانماں برباد مہاجر ہوں۔ اور کہیں سے لٹ لٹا کر آئے ہوں۔ چونکہ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس لئے قلعہ کے آس پاس لاتعداد جھونپڑیاں بنائی گئی تھیں۔ جہاں یہ ذلت کے مارے لوگ رہتے تھے۔ اور انہیں اپنی ذلت کا احساس تک نہیں ہوتا تھا۔ وہ دن کو پتنگیں اڑانے میں، بٹیر بازی اور کبوتر بازی میں مصروف رہتے تھے۔ رات کو چوسر، گنجفہ اور شطرنج وغیرہ کھیلنے میں وقت گزارتے رہتے تھے۔

قلعے کی محدود دنیا میں ان شہزادوں کے آس پاس صرف عورتیں اور خواجہ سرا رہا کرتے تھے۔ دن رات ان کے ساتھ رہ کر ان میں بھی نسوانی عادات اور خصوصیات پیدا ہو گئی تھیں۔ فن سپہ گری سیکھنا تو دور کی بات ہے۔ وہ کبھی تلوار پکڑنے کے بارے میں سوچتے بھی نہیں تھے۔ ایک شہزادے کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے ایک بار ایک سپاہی کے ہاتھ میں برہنہ تلوار دیکھی تو مارے ڈر کے اپنی ماں کے آغوش میں آ کر چھپ گیا۔ ان تمام شہزادوں کی زندگی میں بس ایک ہی کام رہ گیا تھا کہ عورتوں کے ساتھ دن رات گزارو، اور زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرتے رہو۔

اس وقت تک انگریزوں نے اپنی مستقل حکومت قائم نہیں کی تھی۔ دہلی میں ان کی

کوئی باقاعدہ فوج نہیں تھی۔ وہ مختلف صوبوں میں ابھی معاشی طور پر مستحکم ہو رہے تھے۔ بنئے اور ساہوکاروں سے تجارت بڑھا رہے تھے۔ ان کی مستقل توجہ دہلی کے بادشاہ پر لگی رہتی تھی۔ اسی لئے مراہٹے، روہیلے اور سکھ وغیرہ ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے۔ وہاں جس کا غلبہ ہوتا تھا بادشاہ اسی کے زیر اثر آ جاتا تھا۔

ان دنوں مراہٹوں اور روہیلوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی تھی۔ مراہٹوں نے جنگ کے دوران میں ضابطہ خان روہیلا کے بیوی بچوں کو قید کر لیا۔ ان میں ضابطہ خان کا ایک نوعمر لڑکا غلام قادر نہایت ہی حسین و جمیل تھا۔ شاہ عالم ثانی سبزہ خط پر دل و جان سے فدا ہو گیا۔ اس نے کچھ رقم مراہٹوں کو دے کر اس سبزہ خط کو حاصل کر لیا اور اسے خصی کرا دیا۔

بیشمار بیویاں تھیں۔ بیشمار کنیزیں تھیں۔ پھر بھی ہوس پوری نہیں ہوتی تھی۔ عاقبت کی کوئی فکر نہیں تھی۔ یہ سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ کبھی قیامت آئے گی' یوم حساب ہوگا۔ قیامت تو بہت دور تھی۔ اسی دنیا میں دوسرے شہزادوں کا عبرتناک انجام دیکھا جا چکا تھا۔ ایسے وقت خوش فہمی ہوتی ہے کہ دوسروں کے ساتھ جو ہوا سو ہوا۔ ہمارے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوگا۔

وہ اس نوعمر لڑکے کو زنانہ لباس پہنایا کرتا تھا۔ اسے لڑکیوں کے انداز میں بولنے چلنے پھرنے اور ادائیں دکھانے کا حکم دیتا تھا۔ وہ مجبوراً اس کے احکامات کی تعمیل کرتا تھا۔ مگر اس کے دل میں غصے اور انتقام کی شعلے بھڑکتے رہتے تھے۔

روہیلے بھی اس بات پر غضبناک تھے کہ شاہ عالم نے ان کے سردار ضابطہ خان کے بیٹے کو زنخا بنا دیا ہے۔ انہوں نے پیغام بھیجا کہ غلام قادر کو صحیح سلامت واپس کر دیا جائے۔ ورنہ بادشاہ کا انجام بہت برا ہوگا۔

آج مسرتوں کے ہجوم میں کون سوچتا ہے کہ کل تقدیر ماتم کرا سکتی ہے۔ بادشاہ کو انگریزوں سے اچھی خاصی رقمیں ملتی تھیں۔ بڑے عیش و عشرت سے دن رات گزر رہے تھے۔ پھر وہ غلبہ پانے والے مراہٹوں کو خوش رکھا کرتا تھا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ آج کسی کی جیت ہوئی ہے تو کل ہار ہو سکتی ہے۔

پھر یہی ہوا کچھ عرصے بعد روہیلوں کو مراہٹوں پر غلبہ حاصل ہو گیا۔ انہوں نے

شاہ عالم پر بھی دھاوا بول دیا۔اس بادشاہ کے پاس کون سی فوجی قوت تھی کہ ان کا مقابلہ کرتا۔ اس نے گھٹنے ٹیک دیئے۔ضابطہ خان روہیلا نے آکر اس کے منہ پر تھوکتے ہوئے کہا۔"تو نے میرے بیٹے کو زنخا بنایا ہے۔میں تیری اولاد کے ساتھ بھی یہی سلوک کروں گا۔"

پھر اس نے شاہ عالم کو اپنے بیٹے غلام قادر کے حوالے کر دیا۔وہ تو ایک عرصے سے انتقام کی آگ میں سلگ رہا تھا۔اس نے گن گن کر بدلے لئے اسے طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں۔پھر چاقو کی نوک سے اس کی دونوں آنکھیں نکال لیں اور اسے ایک کال کوٹھری میں پھنکوا دیا۔

وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسی نا قابل برداشت اذیتوں سے گزرنا ہو گا۔اس کی اندھی زخمی آنکھوں کا علاج نہیں کرایا گیا۔وہ اس کال کوٹھری کے ٹھنڈے فرش پر پڑا ہوا تکلیف سے تڑپتا رہا اور اللہ اللہ کرتا رہا۔

اس کی ہوس پرستی نے اس سے سب کچھ چھین لیا۔بیشمار حسین بیگمات کو اور پر شباب کنیزوں کو حاصل کرنا تو دور کی بات ہے۔اپنی اندھی آنکھوں سے انہیں دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔دنیا کے سارے نظارے گم ہو گئے تھے اور تاریکی مقدر بن گئی تھی۔وہ تکلیف سے کراہتا رہتا تھا اور بولتا رہتا تھا۔"کوئی ہے.....؟ مجھ پر رحم کرو..ایک جائے نماز اور ایک تسبیح لا کر مجھے دو۔اتنا تو کرو کہ میں خدا کو راضی کر سکوں۔"

انسان کو اشرف المخلوقات نہیں.....ذلیل المخلوقات کہنا چاہئے۔جب سب کچھ چھن جاتا ہے' تب ہی اسے خدا یاد آتا ہے۔

کچھ عرصے بعد انگریزوں نے ان روہیلوں کو مار بھگایا۔لارڈ لیک کی سربراہی میں دہلی پر قبضہ جما لیا۔پھر شاہ عالم کو کال کوٹھری سے نکال کر برائے نام بادشاہ بنا دیا۔بھلا ایک اندھا کیا بادشاہ بنتا اور کیا حکومت کرتا؟ اسے تو محض ایک لیبل کے طور پر رکھا گیا تھا۔کیونکہ وہ انگریز فرنگی کہلاتے تھے۔یہ جانتے تھے کہ وہاں کے لوگ اپنی قوم اور برادری کے بادشاہ اور راجہ کو قبول کرتے ہیں۔لہٰذا جن صوبوں میں مسلمان سلاطین تھے اور جن علاقوں میں راجے مہاراجے تھے۔ان سب کو جوں کا توں رہنے دیا۔وہ بڑی حکمت عملی سے اپنی معاشی اور تجارتی حیثیت کو مستحکم کرتے جا رہے تھے۔

انہوں نے شاہ عالم کی موت کے بعد اس کے بیٹے اکبر ثانی کو ولی عہد نامزد کر دیا۔اکبر ثانی کے گیارہ بیٹے اور چھ بیٹیاں تھیں۔سب سے بڑا بیٹا بہادر شاہ ظفر تھا۔اب مغل خاندان کا جو بھی شہزادہ بادشاہ بن رہا تھا' وہ انگریزوں کا وظیفہ خوار اور تنخواہ دار ہوتا تھا۔وہ دہلی کے تخت پر بظاہر بادشاہ کہلاتے تھے۔لیکن انگریزوں کے محتاج رہتے تھے۔ان کی جی حضوری کرتے تھے اور وظیفہ یا تنخواہ بڑھانے کے لئے عرضیاں لکھ لکھ کر پیش کیا کرتے تھے۔اس ذلت کا قطعی احساس نہیں تھا کہ وہ بھیک مانگنے والے بادشاہ بن گئے ہیں۔

ان کے لئے یہی بہت تھا کہ وہ بادشاہ کہلا رہے ہیں۔بڑی بڑی رقمیں مل رہی ہیں۔اگرچہ ان رقومات سے بھی ان کے شاہانہ اخراجات پورے نہیں ہوتے تھے۔تاہم یہ فخر کرتے تھے کہ ہمارے باپ دادا بھی بادشاہ تھے اور ہم بھی بادشاہ ہیں۔

ان حالات میں پھر یہ جھگڑا پیدا ہوا کہ آئندہ ولی عہد کون ہوگا؟ اکبر ثانی کی چہیتی بیگم یعنی بہادر شاہ ظفر کی سوتیلی ماں ممتاز محل بیگم اپنے بیٹے مرزا جہانگیر کو ولی عہد مقرر کرانا چاہتی تھی۔اس بات پر سوتیلی ماں سے محاذ آرائی شروع ہو گئی تھی۔اکبر ثانی بھی چہیتی بیگم کو خوش رکھنے کے لئے اپنے بڑے بیٹے بہادر شاہ ظفر کی مخالفت کرنے لگا تھا۔اس نے انگریز آقاؤں کے نام عرضی بھیجی کہ آئندہ اس کے بیٹے مرزا جہانگیر کو ولی عہد مقرر کیا جائے۔

مرزا جہانگیر اپنے باپ دادا اور پردادا کی طرح عیاش تھا اور بدمزاج بھی تھا۔اکبر ثانی کی وفات کے بعد انگریز وائسرائے طامس مٹکافے نے قلعے میں آکر بہادر شاہ ظفر کو تخت پر بٹھا دیا۔

بہادر شاہ ظفر بدمزاج اور ظالم نہیں تھا اور نہ ہی عیاش تھا۔اسے کنیزیں پالنے کا شوق نہیں تھا۔تاریخی کتب میں اس کی صرف چھ بیویوں کا ذکر ملتا ہے۔بہرحال یہ طے ہے کہ وہ عیاش اور بدمزاج نہیں تھا۔

مگر کیا جائے کہ شاہانہ مزاج اس کی بھی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔اس نے بادشاہ بنتے ہی ایک بہت قیمتی ہشت پہلو گنگا جمنی تخت تیار کرایا۔جس کا نام تخت ہما رکھا گیا۔تاریخ کا جو سب سے قیمتی تخت طاؤس تھا۔اسے تو نادر شاہ لے گیا تھا۔وہ تخت ہما اس کے مقابلے میں قیمتی اور جاذب نظر نہیں تھا۔پھر بھی اس پر بیٹھنے سے شاہانہ انداز رعب و دبدبہ طاری ہوتا

تھا۔لیکن کیا کیا جائے کہ بادشاہ کو اس تخت پر ایک ہی بار بیٹھنے کا موقع ملا۔ایک انگریز جرنل لارڈ ایلین اس کے دربار میں آیا تھا۔چونکہ بادشاہ نے تخت سے اُٹھ کر اسے کرسی پیش نہیں تھی۔لہٰذا حکم صادر ہوا کہ وہ آئندہ اس تخت پر نہیں بیٹھے گا۔اس تخت کو وہاں سے ہٹا دیا گیا۔

بیچارہ مجبور بادشاہ اسے انگریزوں کی جانب سے ایک لاکھ روپیہ وظیفہ کے علاوہ تہوار اور دیگر تقاریب کے اخراجات کے لئے پچیس ہزار روپے ماہانہ ملتے تھے۔اس کے علاوہ دیگر مکانات اور دکانات سے پچیس ہزار روپے کرایہ آتا تھا۔اس طرح بادشاہ کی کل ماہانہ آمدنی ڈیڑھ لاکھ روپے تھی۔لیکن شاہی اخراجات اس آمدنی میں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھے۔

اگرچہ قلعہ معلیٰ میں پرانی شان وشوکت باقی نہیں رہی تھی اور بادشاہ کو صرف دہلی تک محدود کر دیا گیا تھا۔تاہم اس نے ظاہری شان وشوکت برقرار رکھی تھی۔اس وقت کے منشی فیض الدین کا بیان ہے کہ صبح بادشاہ کی آنکھ کھلتے ہی چلمچی آفتاب والیاں اور رومان خانے والیاں موجود ہوتی تھیں۔جو بادشاہ کے بیدار ہونے پر مجرا کرتیں اور مبارکباد دیتیں۔

بادشاہ بیدار ہونے کے بعد طشت چوکی پر جا کر وضو کرتا' نماز پڑھتا پھر وظیفہ کرتا۔اس کے بعد توشے خانے والیاں ہاتھ باندھے لباس تبدیل کراتیں۔اس کا خاص حکیم آکر نبض دیکھتا۔پھر دواخانہ سے سربمہر تبرید بھیجی جاتی۔(دوا آمیز ٹھنڈے شربت کو تبرید کہا جاتا ہے۔جسم کی حدت دور کرنے کے لئے بادشاہ کو یہ تبرید پلائی جاتی تھی) پھر بھنڈے خانہ والیاں چاندی کے تاش میں اسے بھنڈا (حقہ) نوش کرواتی تھیں۔

ہر صبح کہاریاں ہوادار لاتی اور بادشاہ سلامت سواری فرماتے تھے۔بادشاہ کی سواری کی گاڑی میں سولہ گھوڑے اور ان کی بیگم زینت محل کی سواری میں آٹھ گھوڑے ہوا کرتے تھے۔اردہ بیگنیاں مردانہ کپڑوں میں ملبوس سر پر پگڑیاں رکھے' کمر پر دوپٹہ باندھے تھوں میں ننگی تلواریں لئے ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔جسولنیاں پکار پکار کر بادشاہ کے آنے کی بر کرتی تھیں۔

وہی شاہانہ انتظامی ٹھاٹ باٹ تھے۔امیر وزیر بخشی' ناظر وکیل' میر منشی اور محرّر یرہ ہاتھ باندھے کھڑے رہتے اور اپنے محکموں سے متعلق رپورٹ پیش کر کے احکامات

حاصل کرتے تھے۔آمدنی کم اور اخراجات ضرورت سے زیادہ تھے۔اس وجہ سے بادشاہ ہمیشہ مالی مشکلات میں مبتلا رہتا تھا۔انگریزوں سے وظیفے میں اضافہ اور قرضے کی ادائیگی کے لئے درخواستیں ارسال کرتا رہتا تھا۔وہ کبھی سود' کبھی تمسک لکھ کر اور کبھی جاگیریں گروی رکھ کر قرضے حاصل کرتا رہتا تھا۔

جب قرض کی ادائیگی ناممکن ہوگئی تو قرض خواہوں نے شہزادوں سے سربازار اپنی رقم کا تقاضہ شروع کر دیا۔اس صورتحال سے نمٹنے کے لئے بادشاہ نے اپنے دربار کے بڑے بڑے عہدے کثیر رقم کے نذرانوں کے عوض فروخت کرنے شروع کر دیئے۔اس طرح چھوٹے چھوٹے ملازم بھی حلقہ امراء میں داخل ہونے کے لئے بڑھ چڑھ کر نذرانے پیش کرنے اور بڑے بڑے عہدے حاصل کرنے لگے۔

یوں طرح طرح سے مسائل حل کرنے کے باوجود بادشاہ کے اخراجات پورے نہ ہوتے تھے۔اس نے اپنے شہزادے مرزا شاہ رُخ کے مکان سے برآمد کئے ہوئے کلابتو سے بھرے ہوئے دو صندوق' سنہری کام کے سیلے' اشرفیوں کا دیگچہ اور روپوں سے بھرا ہوا ایک دیگچہ اپنے خزانے میں داخل کرایا۔ایک شہزادے مرزا بخت کے انتقال کے بعد اس کا تمام سامان بھی نیلام کرا دیا۔

اگرچہ بادشاہ کئی پہلوؤں سے بہت سمجھدار تھا۔لیکن یہ پہلو اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ شاہانہ ٹھاٹ باٹ میں زیادہ سے زیادہ کمی کی جائے۔تب ہی قرض خواہوں سے نجات ملے گی۔کتنے ہی ملازمین تنخواہ نہ ملنے کے باعث ملازمت چھوڑ کر چلے گئے۔اور جو رہ گئے۔وہ چوری اور غبن کرنے لگے۔انہوں نے قلعے کے برج سے تانبے کا کلس چرا لیا۔جہاں جو چیز ملتی تھی' اسے اٹھا کر لے جاتے تھے اور بازار میں بیچ دیتے تھے۔لونڈیاں اور خادمائیں بیگمات کے زیورات چرانے لگی تھیں۔باورچی خانے سے چینی کے برتن چوری ہو گئے تھے۔شہزادے اور سلاطین کی اولاد بھی اس بدعنوانی میں شامل ہوگئی تھی۔وہ شہزادے کیا تھے کیا ہو گئے تھے؟ قرض کی ادائیگی نہ کرنے پر انہیں سرعام ذلیل کیا جاتا تھا۔شاہی وقار خاک میں مل رہا تھا۔اس کے باوجود وہ بادشاہ حکمران کہلانے کی خوش فہمی میں مبتلا تھا۔

بادشاہ کی بس یہی ایک کمزوری تھی کہ وہ کھوکھلی شان وشوکت اور برتری کا مظاہرہ

کرتا رہتا تھا۔باقی دوسرے تمام پہلوؤں سے ایک انتہائی نیک اور شریف انسان تھا۔اپنے سینے میں دردمند دل رکھتا تھا۔صرف اپنی بیگمات شہزادے اور شہزادیوں سے ہی نہیں دہلی کے تمام شہریوں سے محبت کرتا تھا۔ان کی فریادیں سن کر انصاف کرتا تھا۔اور ضرورت مندوں کی حتی الامکان ضرورتیں پوری کرتا تھا۔

شہنشاہ ظہیرالدین بابر کے زمانے سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک تمام شہنشاہ ادبی ذوق کے حامل تھے۔انہوں نے ابتدا ہی سے تصنیف اور تالیف کی روایات برقرار رکھیں اور درباری زندگی میں بھی فنون لطیفہ کے مشاغل کو جاری و ساری رکھا۔بہادر شاہ ظفر ایک حساس اور باشعور شاعر تھا۔اس نے اپنے دور کے پانچ شعراء کی شاگردی اختیار کی تھی۔ان پانچ شعراء میں سے ایک کا نام نصیرالدین تخلص نصیر تھا۔دوسرے شاعر عزت اللہ عشق تھے۔تیسرے میر کاظم حسین تخلص بیقرار تھے۔چوتھے مشہور و معروف شاعر ذوق تھے اور پانچویں دنیائے ادب کے تاریخی اہمیت کے حامل شاعر مرزا غالب تھے۔

مرزا غالب چودہ جولائی ۱۸۵۰ء کو بادشاہ کے حضور پیش ہوئے۔بادشاہ نے انہیں نجم الدولہ دبیر الملک نظام اور جنگ کے خطابات عطا کئے۔چھ پارچے اور تین رقم جواہر کی خلعت عطا کی گئیں اور پچاس روپے ماہانہ تنخواہ مقرر کر دی گئی۔اس طرح سے وہ باقاعدہ قلعے کے ملازم ہو گئے۔انہیں فارسی زبان میں خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے کا کام دیا گیا تھا۔

جب ذوق کا انتقال ہوا تو بہادر شاہ ظفر مرزا غالب سے اپنے کلام میں اصلاح لینے لگے۔مرزا اس کام کو بادل ناخواستہ سرانجام دیا کرتے تھے۔کاظم حسین مرحوم لکھتے ہیں کہ ایک روز میں اور مرزا صاحب دیوان عام میں بیٹھے تھے کہ چوبدار آیا اور کہا۔"بادشاہ سلامت نے غزلیں مانگی ہیں۔"

مرزا نے کہا۔"ذرا ٹھہر جاؤ۔"

پھر انہوں نے اپنے آدمی سے کہا۔"پالکی میں کچھ کاغذات رومال میں بندھے رکھے ہیں۔انہیں لے آؤ۔"

وہ فوراً ہی لے آیا۔مرزا نے اسے کھولا تو اس میں سے آٹھ نو پرچے برآمد ہوئے

۔جن پر ایک ایک، دو دو مصرعے لکھے ہوئے تھے۔انہوں نے دوات اور قلم منگوا کر ان مصرعوں پر غزلیں لکھنی شروع کر دیں اور وہیں بیٹھے بیٹھے آٹھ یا نو غزلیں لکھ ڈالیں۔پھر انہیں چوبدار کے حوالے کر دیا۔انہوں نے اتنے کم وقت میں اتنی غزلیں لکھی تھیں کہ ناظر حسین مرحوم حیران رہ گئے۔

جب چوبدار غزلیں لے کر چلا گیا تو مرزا نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔" بادشاہ سلامت کی کبھی کبھی کی فرمائشوں سے آج مدت بعد سبکدوشی ہوئی ہے۔"

جب بادشاہ کوئی عمدہ چیز پکواتا تو اکثر مصاحبین اور اہل دربار کے لئے ضرور بھیجا کرتا۔اس کے شکریے میں مرزا غالب نے ایک قطعہ لکھا۔

نہ پوچھ اس کی حقیقت حضور والا نے
مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں نہ نکلتے خلد سے باہر
جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

ایک طالب علم مرزا کے پاس پڑھنے آیا کرتا تھا۔اس کی موجودگی میں ایک بار چوبدار بادشاہی پکوان لے کر مرزا کے پاس آیا۔طالب علم نے حیرانی سے اس پکوان کو دیکھا۔پھر چوبدار کے جانے کے بعد مرزا سے پوچھا۔"بیسنی روٹی ایسی کیا نادر چیز ہے کہ بادشاہ کی سرکار سے آپ کے پاس بھیجی گئی ہے؟"

مرزا نے کہا۔"ارے احمق! چنا وہ چیز ہے کہ اس نے ایک دفعہ آسمان کی طرف دیکھ کر فریاد کی تھی کہ دنیا میں مجھ پر بڑے ظلم ہوتے ہیں۔مجھے دَلتے ہیں۔پیستے ہیں۔بھونتے ہیں۔پکاتے ہیں اور مجھ سے سینکڑوں کھانے کی چیزیں بنا کر کھاتے ہیں۔جیسا مجھ پر ظلم ہوتا ہے ایسا کسی پر نہیں ہوتا۔"

آسمان سے حکم ہوا۔"اے چنے! تیری خیر اسی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے چلا جا۔ورنہ ہمارا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ تجھ کو کھا جائیں۔"

مرزا غالب کی زندہ دلی سے بادشاہ بھی محظوظ ہوا کرتا تھا۔ایک روز وہ بہادر شاہ کے ساتھ باغ حیات میں ٹہل رہے تھے۔وہاں کے آم بادشاہ سلاطین یا بیگمات کے سوا کسی

کو میسر نہیں آسکتے تھے۔ مرزا بار بار آموں کی طرف غور سے دیکھتے تھے۔

بادشاہ نے پوچھا۔ ''مرزا! اس قدر غور سے کیا دیکھ رہے ہو؟''

انہوں نے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ ''پیر و مرشد! یہ جو کہا جاتا ہے کہ دانے دانے پر کھانے والے کا نام لکھا ہوتا ہے تو دیکھ رہا ہوں کہ کسی دانے پر میرا یا میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہوا ہے یا نہیں؟''

اس بات پر بہادر شاہ مسکرایا۔ پھر دوسرے روز عمدہ آموں کا ایک ٹوکرہ مرزا کے گھر بھجوا دیا۔

بہادر شاہ ظفر کو ملک کے بدلتے ہوئے سیاسی حالات نے انتہائی مصائب میں مبتلا کر دیا تھا۔ ان دنوں ہندو، مسلمان سب ہی انگریزوں کی برتری اور بڑھتے ہوئے اقتدار کی خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ انگریز بہادر نے جہاں چاہا، اپنا قبضہ جمایا اور جہاں حکومت قائم کی، وہاں اپنی من مانی کرنے لگے۔

مثلاً سڑکیں بناتے وقت مندر یا مسجد راہ میں آتے تو انہیں گرا دیا جاتا تھا۔ اس حرکت پر ہندو اور مسلمان مشتعل ہو رہے تھے۔

ہسپتالوں میں عورتوں کی بے پردگی کا شکوہ کیا گیا اور یہ احتجاج بھی کیا گیا کہ ہسپتالوں میں مریضوں کے لئے ذات پات کی تفریق نہیں کی جاتی۔

انگریزوں نے بیوہ کی شادی کا قانون پاس کیا تو اسے مذہبی معاملات میں مداخلت تصور کیا گیا۔ جیلوں میں ہندو اور مسلمان قیدیوں کے لئے ایک ہی جگہ کھانا پکانے پر بھی جھگڑا ہونے لگا۔ کٹر ہندو عورتیں اپنے مردہ پتی کے ساتھ چتا میں جل مرتی تھیں اور ستی کہلاتی تھیں۔ انگریزوں نے اس رواج کے خاتمے کا اعلان کیا تو اس پر بھی ہندو مشتعل ہو گئے۔

انگریز سرکار نے لوگوں کی اراضی اور جاگیر پر قبضہ کر لیا۔ اس سے جاگیرداروں اور زمینداروں میں غم و غصے کی لہر پھیل گئی۔ انگریزوں کی فوج میں صرف انگریز اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ باقی سپاہی ہندو اور مسلمان تھے۔ ان ہی سپاہیوں نے اس وقت بغاوت کا آغاز کیا۔ جب انہیں کارتوس کو دانتوں سے کاٹنے کو کہا گیا۔ ان کارتوسوں میں گائے اور سور کی چربی لگی ہوئی تھی اور یہ بات ہندو اور مسلمانوں کے دین کی خلاف تھی۔

بیرک پور کی پلٹن کے صوبیدار منگل پانڈے نے سب سے پہلے باغیانہ قدم اٹھایا۔ اور میجر ہڈسن کو گولی مار دی۔ اس کے بعد لفٹیننٹ واگھ کو بھی ختم کر دیا۔ کتنے ہی مسلمان باغی سپاہی دریائے جمنا کو کشتیوں کے ذریعے پار کر کے دہلی میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے چوکی کو آگ لگا دی۔ وہاں کے داروغہ کو مار ڈالا۔ وہ تمام باغی سپاہی بہادر شاہ ظفر سے یہ کہنے آئے تھے کہ شاہی فوج کو از سر نو منظم اور مضبوط کیا جائے اور انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کیا جائے۔

بہادر شاہ ظفر کو اپنی مجبوریوں اور کمزوریوں کا بخوبی احساس تھا۔ وہ گورے بہادروں کو ناراض نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے خلاف قدم اٹھانے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا تھا۔ اس نے باغیوں سے کہا۔ ''سنو بھائیو! ہمیں بادشاہ کون کہتا ہے؟ بادشاہت تو بادشاہوں کے ہمراہ گئی۔ ہمارے باپ دادا بادشاہ تھے۔ جن کے قبضے میں ہندوستان تھا۔ سلطنت تو برسوں پہلے ہمارے محل سے جا چکی ہے۔ ہمارے پاس فوج نہیں ہے کہ ہم تمہاری مدد کر سکیں۔ لشکر کو نئے سرے سے ترتیب دینے کے لئے ہمارے پاس خزانہ نہیں ہے۔ ہم ایک سپاہی کو بھی تنخواہ دینے کے قابل نہیں ہیں۔''

بادشاہ نے ان باغیوں کو سمجھانے اور انگریزوں سے صلح کرانے کی بے حد کوشش کی۔ لیکن پورے ہندوستان میں بغاوت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ ان باغیوں نے دہلی شہر پر قبضہ کیا تو بادشاہ کو مجبور ہو کر ان کا ساتھ دینا پڑا۔

اب بہادر شاہ ظفر کی تاریخی رُوداد کے اس موڑ پر جھانسی کی رانی اور ٹیپو سلطان کا ذکر لازمی ہے۔ سب سے پہلے ان دو جانبازوں نے انگریزوں کو تگنی کا ناچ نچایا تھا۔ جھانسی کی رانی کا نام لکشمی بائی تھا۔ بچپن میں اسے منو بائی کہتے تھے۔ وہ گنگا دھر راؤ کی پتنی تھی۔ انگریز تمام دیسی ریاستوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لینا چاہتے تھے۔ جب راجہ گنگا دھر راؤ مر گیا اور رانی بیوہ ہو گئی تو انگریزوں نے اس ریاست پر قبضہ جما لیا اور جھانسی کی رانی لکشمی بائی کے لئے پانچ ہزار روپے ماہوار پینشن مقرر کر دی۔

رانی جھانسی انگریز سرکار کی زور و زبردستی پر اندر ہی اندر غصے سے کھول رہی تھی۔ لیکن اس نے انتقام کے شعلے کو اپنے دل میں دبائے رکھا۔ بڑی راز داری سے ان کے

خلاف جنگ لڑنے کی تیاریاں کرتی رہی۔ وہ بہت ہی ذہین اور حاضر دماغ تھی۔ حافظہ اتنا تیز تھا کہ ساڑھے سات سو سرداروں میں سے اگر کوئی ایک دن بھی دربار میں حاضر نہ ہوتا تو وہ دوسرے دن اسے جواب طلب کرلیتی تھی۔ ان میں سے ہر ایک کا نام اس کے ذہن میں محفوظ رہتا تھا۔

وہ مردانہ لباس پہنتی تھی۔ گہرے نیلے رنگ کا کوٹ پاجامہ اور ٹوپی اس کا پہناوا تھا۔ کمر پر دوپٹہ باندھتی تھی اور اس کے ساتھ شمشیر لٹکائے رہتی۔ تلوار بازی اور بندوق کا نشانہ لینے میں اسے مہارت حاصل تھی۔

وہ اتنی رحمدل تھی کہ ایک بار ہزاروں فقیروں کو سردی میں ٹھٹھرتا دیکھا تو شہر کے سارے درزی بلوائے اور چار دنوں کے اندر کپڑے اور کمبل بنوا کر ان میں تقسیم کردیئے۔ میدان جنگ میں وہ زخمیوں کی مرہم پٹی کی نگرانی خود کرتی تھی۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ اس نے اچھی خاصی فوجی قوت حاصل کرلی ہے تو اس نے اعلان جنگ کردیا۔ انگریز اس کی سرکوبی کے لئے جھانسی کی طرف بڑھے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ راستے کے تمام درخت کاٹ کر گرادیئے گئے تھے تاکہ انگریز سپاہیوں کو سایہ نہ ملے۔ وہ تیزی سے آگے نہ بڑھ سکیں اور نہ ہی پلٹ کر تیزی سے بھاگ سکیں۔

رانی نے خود ہی اپنی فوج کی قیادت کی۔ اس کی فوج میں عورتوں کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ عورتیں توپ خانے میں کام کرتی تھیں۔ اسلحہ اٹھا کر میدان جنگ میں لاتی تھیں اور زخمی سپاہیوں کی مرہم پٹی کرتی رہتی تھیں۔ رانی کی قیادت کوئی معمولی نہیں تھی۔ سرفروشی اور جانبازی کا یہ جذبہ تھا کہ عورتیں بھی میدان جنگ میں چلی آئی تھیں۔

جھانسی کی لڑائی قلعہ بند ہو کر نہیں لڑی گئی۔ بلکہ گلی کوچوں میں گھمسان کا رَن پڑا۔ انگریز سپاہیوں پر صرف گولہ باری نہیں کی گئی۔ ان پر پتھر اور لکڑیاں بھی پھینکی گئیں۔ رانی کے توپ خانے کا انچارج غلام غوث خان بہت ہی ماہر توپچی تھا۔ اس نے ایسی مہارت سے گولہ باری کی کہ انگریزی فوج کے قدم اکھڑنے لگے۔

انگریزوں کی حکمت عملی یہ تھی کہ وہ جنگ شروع کرنے سے پہلے سازشوں کا جال بچھاتے تھے۔ ان کے ہندو مخبر اور غدار رانی کی فوج میں تھے۔ ان کی غداری کے باعث

انگریزوں نے قلعے کے اندر صدر دروازے پر قبضہ کرلیا۔ رانی اپنے جانباز سپاہیوں کے ساتھ دشمنوں کی تلواروں اور سنگینوں کے درمیان کود پڑی۔ بڑی جی داری سے لڑتی رہی۔ کتنے ہی دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارتی رہی۔ ایسے وقت بہادر سرداررخدابخش اور غلام غوث شہید ہوگئے۔ ان کا توپ خانہ انگریزوں کے قبضے میں آگیا۔ ایسے میں رانی کو بچے کھچے سپاہیوں کے ساتھ وہاں سے فرار ہونا پڑا۔

وہ عورت تھی۔ لیکن مردانہ وار حالات کا مقابلہ کرتی تھی۔ وہ ایک رات اور ایک دن مسلسل چلتی ہوئی ایک سو دس میل کا فاصلہ طے کرکے کالپی پہنچی۔ وہاں شری راؤ صاحب پیشوا نے اس کا ساتھ دیا۔ وہ ازسرنو فوجی قوت حاصل کرنے لگی۔ کالپی سے چالیس میل دور کنچ گاؤں میں پھر ایک بار انگریز کی فوج سے زبردست لڑائی ہوئی۔

انگریز سرد آب وہوا کے عادی تھے اور ان دنوں وہاں سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ شام کو جنگ شروع ہو اور وہ تمام رات لڑتے رہیں۔ لیکن رانی صبح کا سورج نکلتے ہی ان پر حملہ کرتی تھی تو شدید گرمی اور پسینے کے باعث انگریزوں کی حالت بدتر ہو جاتی تھی۔ وہ بڑی مہارت سے لڑنا جانتی تھی۔ جہاں اپنے سپاہیوں کو کمزور ہوتا دیکھتی تھی۔ فوراً وہاں پہنچ جاتی تھی۔ پورے میدان میں گھوڑا دوڑاتی ہوئی ہر مورچے پر نظر آتی تھی۔

لیکن بات وہی تھی کہ اپنے اندر کمزوری ہو تو ہزار دلیری اور مہارت کے باوجود شکست کھانی پڑتی ہے اور کمزوری یہ تھی کہ اس کی فوج کے اندر جاسوس اور انگریز کے زرخرید ہندو غدار گھسے ہوئے تھے۔ وہاں بھی شکست کا سامنا ہونے لگا تو مجبوراً اسے فرار ہونا پڑا۔

اس پر جنون سوار تھا کہ وہ اپنی دھرتی سے انگریز کا وجود مٹا دے گی۔ وہ اپنی فوج اور مشیروں میں غداروں کو تلاش کرتی تھی۔ جہاں ان کا سراغ ملتا تھا انہیں موت کے گھاٹ اتار دیتی تھی۔ اس نے آخری بار گوالیار میں انگریزوں سے مقابلہ کیا۔ صبح سے شام تک گھوڑا دوڑاتی رہی اور ان سے مقابلہ کرتی رہی۔ آخر اسی میدان جنگ میں ماری گئی۔ دستور کے مطابق اس کی چتا جلائی گئی۔ چتا کے شعلے بھڑکتے رہے۔ پھر بجھ گئے۔ لیکن حریّت کا وہ شعلہ جو اس دلیر عورت نے بندیل کھنڈ کی پہاڑیوں پر بھڑکایا تھا۔ وہ کبھی نہ بجھ سکا۔ وہ آگ بھڑکتی ہوئی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک پہنچ گئی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا دوسرا جانباز مجاہد ٹیپو سلطان تھا۔ جس کا نام تاریخ میں تاقیامت زندہ اور پائندہ رہے گا۔ ارکاٹ کے مقام پر حضرت ٹیپو مستان ولی کا مزار ہے۔ حیدر علی اور اس کی شریک حیات نے ان بزرگ سے ایک فرزند کے لئے دعا مانگی اور جب فرزند پیدا ہوا تو انہوں نے ان ہی ولی اللہ کے نام پر اس کا نام ٹیپو سلطان رکھا۔

حیدر علی نے اپنے بیٹے کو علوم دینی کے ساتھ ساتھ فن حرب بھی سکھایا۔ جب وہ سترہ سال کا تھا تو اسے فوج کا اعلیٰ افسر بنا کر مدراس پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اب سے پہلے وہ اپنے والد حیدر علی کے ساتھ مختلف جنگوں میں شریک ہوتا رہا تھا۔ اس نے پہلی بار ایک سپہ سالار کی حیثیت سے مراہٹوں کے مقابلے میں فتح حاصل کی۔

چھ ستمبر ۱۷۸۰ء میں ٹیپو سلطان نے انگریزی فوج کا مقابلہ کیا۔ ان کے سامانِ رسد اور بار برداری کے جانوروں پر قبضہ کر لیا۔ اپنے خاص سوار فوج کا ایک دستہ لے کر انگریزی فوج کے قلب میں گھس گیا۔ ایسی جی داری سے لڑا کہ ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ کرنل بیلی کو قید کر لیا گیا۔ حیدر علی نے اپنے بیٹے کی اس دلیری اور نمایاں کارنامے کی بہت تعریفیں کیں اور اسے اپنی فوج کا بہترین جرنل قرار دیا۔

سر آلفرڈ لائل نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں پر ایسی مصیبت پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔ اس جنگ میں ان کے دو ہزار انگریزی سپاہ اسیر ہو گئے تھے اور سینکڑوں مارے گئے تھے۔

۱۷۸۲ء میں ٹیپو سلطان نے ایک اور شاندار کارنامہ انجام دیا۔ دریائے کالرون کے کنارے انگریز فوج سے مقابلہ ہوا۔ اس بار انگریزوں نے اپنی فوجی قوت بڑھانے کے لئے مراہٹوں سے صلح کر لی تھی اور ان سے متحد ہو کر ٹیپو سلطان کا مقابلہ کیا تھا۔ انہوں نے کتنی ہی سازشیں کیں۔ کئی طرح کے جنگی حربے اختیار کئے۔ جس طرح انہوں نے جھانسی کی رانی کو شکست دی تھی۔ اسی طرح اپنے جاسوسوں اور زر خرید مسلمانوں کے ذریعے ٹیپو کو اندر سے کھوکھلا کرنا چاہا۔ لیکن وہ بڑا ہی زیرک تھا۔ کہتے ہیں کہ سوتے وقت بھی ایک آنکھ کھلی رکھتا تھا۔ اس نے اس جنگ میں کرنل بریتھ ویٹ اور انگریز فوج کے بیشمار سپاہیوں کو قیدی بنا لیا۔ ایسے ہی وقت اسے حیدر علی کی وفات کی خبر ملی تو اس نے فوراً ہی سرنگا پٹن پہنچ کر عنانِ

حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

دو جنوری ۱۷۸۳ء کو خبر ملی کہ بمبئی سے ایک اور انگریزی فوج ساحل پر اتر کر حیدر نگر پر قبضہ کر چکی ہے۔ ٹیپو سلطان کرناٹک سے نکل کر حیدر نگر پہنچ گیا۔ وہاں کھلے میدان میں انگریزوں سے جنگ ہوئی۔ بعد میں وہ قلعہ بند ہو گئے۔ سترہ دن کے محاصرے کے بعد جرنل میتھوز نے ہتھیار ڈال دیئے۔ پھر تمام انگریزی فوج کو قیدی بنا لیا گیا۔ یہ ٹیپو سلطان کی ایسی فتوحات تھیں کہ وہ انگریزوں کے لئے ایک دہشت کی علامت بن گیا تھا۔ اگر کہیں سے کوئی گولی چلتی تو انگریز ایکدم سے یوں چونک جاتے اور دہشت زدہ ہو جاتے تھے' جیسے ٹیپو سلطان آ گیا ہو۔

وہ جانباز مجاہد ہر سال انگریزوں سے جنگ لڑتا رہا اور ان کے ہوش اڑاتا رہا۔ وہ جہاں جاتا تھا' وہاں سے ان کے قدم اکھاڑ دیتا تھا۔ ۱۷۹۸ء میں لارڈ ولزلی ہندوستان کا گورنر جرنل بن کر آیا۔ اس نے آتے ہی زبردست سازشوں کا جال بچھا دیا۔ نظام دکن کی آزادی کا خاتمہ کر دیا۔ نظام نے گھٹنے ٹیک دیئے اور اس کی یہ شرط منظور کر لی کہ وہ اپنی فوج نہیں رکھے گا' بلکہ انگریز کی فوج حیدر آباد میں اس کی حفاظت کے لئے موجود رہا کرے گی۔

لارڈ ولزلی نے ٹیپو سلطان کو بھی یہی مشورہ دیا اور کہا۔ ''تمہاری بڑھتی ہوئی قوتوں کے آگے زیادہ دن ٹھہر نہیں سکو گے۔ بہتر ہے' نظام دکن کی طرح ہماری شرائط قبول کر لو اور بڑے عیش و آرام سے اپنے علاقے میں حکومت کرتے رہو۔''

ٹیپو سلطان نے کہا۔ ''تمہارے ماتحت رہ کر حکومت کرنے والے اور بادشاہ کہلانے والے بزدل بے حس اور بے غیرت ہیں۔ ہم ایک ہی بات جانتے ہیں کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی ہزار سالہ زندگی سے بہتر ہے۔''

ٹیپو سلطان کا یہ فقرہ تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا گیا ہے اور آج بھی ہر خاص و عام کی زبان پر رہتا ہے۔

۱۷۹۹ء میں لارڈ ولزلی اپنی سازشوں میں کامیاب ہو گیا۔ سرنگا پٹم میں ٹیپو سلطان سے آخری معرکہ ہوا اور وہیں سلطان لڑتے لڑتے شہید ہو گیا۔ تاریخ عالم کے کتنے ہی مورخین نے اپنی کتابوں میں اس آزادی کے پروانے کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے

لکھا ہے۔

"اس کی لاش بہادروں کے انبار میں پائی گئی. جواہرات اور لباس کا کچھ حصہ نکال لیا گیاتھا. وہ تعویز جو وہ ہمیشہ باندھے رکھتا تھا. ابھی اس کے بازو پر بندھا ہوا تھا. اسے تین گولیاں لگی تھیں. دو جسم پر اور ایک کنپٹی پر مگر چہرہ بگڑا نہیں تھا. ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بالکل اطمینان کی نیند سو رہا ہے. جسم ابھی گرم تھا اور ایک لحظے کے لئے کرنل ولزلی کو یوں لگا جیسے وہ زندہ ہو. مگر وہ نبض جو اب تک ہندوستان کی آزادی کے لئے دھڑک رہی تھی. ساکت و صامت ہو چکی تھی."

جھانسی کی رانی اپنی ذہانت اور جنگی حکمت عملی کے باوجود غداروں اور جاسوسوں کے باعث انگریزوں سے بار بار شکست کھاتی رہی۔ لیکن آخری دم تک ان سے مقابلہ کرنے سے باز نہیں آئی۔ جاسوسوں مخبروں اور مسلمان غداروں نے ٹیپو سلطان کے خلاف بھی انگریزوں کا ساتھ دیا۔ لیکن سلطان بروقت ان سازشوں سے آگاہ ہوتا رہا اور ہر میدان میں دشمنوں کو شکست دیتا رہا۔ اس نے لڑتے لڑتے ایک فاتح کی حیثیت سے جان دی تھی۔

☆☆☆

اب بہادر شاہ ظفر کی باری تھی کہ وہ انگریز کے خلاف کس طرح جنگ کرے گا؟

وہ تو ان سے جنگ کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اسے بھیک میں جو بادشاہت ملی تھی۔ اسی پر اکتفاء کر رہا تھا۔ یوں بھی وہ ایک شاعر کی حیثیت سے قلم کے میدان کا ایک کامیاب سپاہی تھا۔ لیکن اس قلم پکڑنے والے نے کبھی تلوار نہیں پکڑی تھی۔ جوانی میں برائے نام فنِ سپہ گری کی تربیت حاصل کی تھی۔ پھر کبھی اس طرف مائل نہیں ہوا تھا۔ جنگ وجدل اور خون خرابہ اس کے مزاج کے خلاف تھا۔

اب حالات نے مجبور کر دیا تھا۔ باغیوں کی ایک بہت بڑی جماعت نے اسے گھیر لیا تھا۔ باغی اسے حب الوطنی کا واسطہ دے رہے تھے۔ سمجھا رہے تھے کہ پورا ہندوستان انگریز کے خلاف ہے۔ ایسی حالت میں مغلیہ سلطنت کے زوال کو عروج کی طرف لایا جا سکتا ہے۔

بہادر شاہ نے ان باغیوں کے تیور دیکھے تھے اور یہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ اس

نے ان کا ساتھ نہ دیا' انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی نہیں کی تو وہ اسے اور اس کے اہل خانہ کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

آخر اس نے مجبور ہو کر باغیوں کی فوج کی کمان سنبھال لی۔ مرزا مغل کو تمام افواج کا کمانڈر انچیف اور دوسرے شہزادوں کو بڑے بڑے عہدوں پر فائز کیا۔ فوج کے دوسرے تجربہ کار افسران اس سے تعاون کرنے کو تیار ہو گئے۔

اس باغی بادشاہی فوج میں حصہ لینے والے ایک تو وہ سپاہی تھے' جن میں والہانہ مذہبی جذبہ موجود تھا۔ اور وہ دہلی کی اسلامی سلطنت کو قائم رکھنا چاہتے تھے۔ دوسرے وہ سپاہی تھے' جو وقتی جذبے کے تحت فوج میں شامل ہو گئے تھے تاکہ انہیں لوٹ مار کا موقع ملتا رہے۔ تیسرے وہ لوگ تھے' جو جذبات سے عاری تھے اور مجاہدین کے روپ میں انگریزوں کے مخبر اور جاسوس تھے۔

اس آزادی کی تحریک میں زیادہ تر غدار اور موقع پرست لوگ شامل ہو گئے تھے۔ جس کی وجہ سے یہ تحریک نہ تو فعال ہو سکی اور نہ ہی منظم شکل اختیار کر سکی۔

ان دنوں بہادر شاہ ظفر ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو جایا کرتا تھا۔ اسے سب سے بڑا خطرہ یہی تھا۔ کہ انقلابی اگر ہار گئے تو انگریز اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اس تحریک میں فوجی تنظیم اور کامیابی کے لئے باقاعدہ اور سنجیدہ کوشش کرنے کے بجائے صرف جوش وخروش سے کام لیا جا رہا تھا۔

چند ماہ میں ہی آزادی کی اس تحریک نے اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کے باعث دم توڑ دیا۔ خزانہ خالی ہو گیا۔ سپاہی تنخواہوں کے چکر میں پڑ گئے۔ بہادر شاہ نے چاندی کے ظروف ان سپاہیوں میں تقسیم کئے تاکہ وہ اپنی تنخواہ پوری کر لیں۔

ان حالات میں مرزا مغل نے بادشاہ کو مشورہ دیا۔ "اس سے پہلے کے تمام سپاہی ساتھ چھوڑ دیں۔ آپ خود بہ نفس نفیس انگریزوں پر ہونے والے حملے کی کمان سنبھال لیں۔"

بادشاہ بری طرح الجھا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان حالات میں کیا کرنا چاہیے؟ انگریزی فوجیں شکستہ فصیلوں کے ذریعے شہر میں داخل ہو رہی تھیں اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو رہا تھا۔ انگریز فوج کوتوالی اور جامع مسجد تک پہنچ گئیں۔ انقلابیوں

نے ان کی پیش قدمی کو روکے رکھا۔ بہادر شاہ ظفر اپنی سواری پر لال ڈگی تک آیا۔ پھر انگریزوں کی گولیوں نے اسے قلعے کے اندر واپس جانے پر مجبور کردیا۔

اب اسے اپنی بیگمات شہزادے اور شہزادیوں کی فکر ہوگئی تھی۔ یہ بات سمجھ میں آرہی تھی کہ شکست ہوئی اور وہ گرفتار ہوگئے تو ان میں سے کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ لہٰذا وہ اپنے اہل خانہ کو باری باری بلا کر مشورہ دینے لگا کہ جتنی جلدی ممکن ہو وہ لوگ دہلی شہر چھوڑ کر کسی دور دراز علاقے میں چلے جائیں۔ آئندہ اسی میں ان سب کی سلامتی ہے۔

☆☆☆

ایسے بدترین حالات میں چند شہزادے اور شہزادیوں پر کیا گزرتی رہی؟ اُن کا دکھڑا بیان کرنا بھی ضروری ہے۔

لال قلعے کا شاہانہ وقار دم توڑتا چلا جارہا تھا۔ تخت کا تختہ ہو ہی چکا تھا۔ در و دیوار پر ایسی اداسی برس رہی تھی' جیسے وہ اپنے مکینوں کی بدحالی پر ماتم کناں ہوں۔ اُجلے اُجلے سنگ سنگ مرمر کی خوبصورت عمارتیں میلی میلی اور اجڑی اجڑی سی دکھائی دے رہی تھیں۔ قلعے کے وسیع و عریض باورچی خانے جہاں سالہا سال کا اناج ذخیرہ رہا کرتا تھا' اس وقت کسی غریب کی جھولی کی طرح خالی اور ویران پڑے ہوئے تھے۔

بہادر شاہ ظفر کی لاڈلی بیٹی کلثوم زمانی اپنے شوہر مرزا ضیاء الدین کے ساتھ خوابگاہ میں تھی۔ دودھ کے لئے روتی بلکتی بچی کو بار بار اپنی چھاتی سے لگا رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے بہلتی تھی مگر دودھ کی سوکھی ہوئی نہریں جب اس کے ننھے سے دہانے کو بھی سیراب نہیں کر پاتی تھیں تو وہ پھر بلک بلک کر رونے لگتی تھی۔ اس کی بھوک اور تڑپ ممتا کے سینے پر گھونسے برسا رہی تھی۔

مرزا ضیاء الدین نے بڑی بے بسی سے بیوی اور بیٹی کو دیکھا۔ پھر کہا۔ "اسے کب تک دھوکا دیتی رہیں گی؟ آپ نے تین وقت سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ دودھ کیسے اترے گا؟"

وہ بچی کو بہلاتے ہوئے بولی۔ "ان لمحات میں ہمیں سوکھی روٹی بھی مل جائے تو ہم اپنی ممتا کو سیراب کرنے کے لئے اسے نعمت خداوندی سمجھیں گے۔ خدارا کچھ کریں۔ ہم سے اس کی بھوک دیکھی نہیں جاتی۔"

وہ روتی بلکتی بچی کو بہلا رہی تھی۔ اپنے حالات پر خود بھی آنسو بہانے لگی۔ مرزا نے بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "آپ حوصلہ رکھیں۔ ہم کسی انّا کو بلاتے ہیں۔ شاید اس پریشانی کا کوئی حل نکل آئے؟"

اس نے جیسے ہی خوابگاہ کا دروازہ کھولا تو ٹھٹھک گیا۔ وہ کسی ایک انّا کو بلانے جا رہا تھا۔ وہاں تین کھڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے جھک کر فرشی سلام کئے۔ پھر دست بستہ کھڑی ہوگئیں۔ ایک نے آگے بڑھ کر کہا۔ "شہزادی زینب کی بھوک نے ہم سب کو بے چین کیا ہوا ہے۔ ہم کئی ساعتوں سے خوابگاہ میں بلائے جانے کی منتظر کھڑی ہیں۔ عین ممکن ہے ہم میں سے کسی کے ذریعے شہزادی صاحبہ کا مسئلہ حل ہوجائے؟"

وہ دروازے کو پوری طرح کھولتا ہوا باہر چلا گیا۔ ان تینوں نے خوابگاہ میں داخل ہوکر کلثوم زمانی کو فرشی سلام کئے۔ پھر ایک نے آگے بڑھ کر زینب کو اپنی آغوش میں بھر لیا۔ شاہی افراد کی بدحالی اور کسمپرسی کا یہ عالم تھا کہ جنہوں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی ایک پھل یا میوے کی کمی نہیں دیکھی تھی۔ اس وقت وہ فاقہ کشی پر مجبور ہوگئے تھے۔ ایسے یاس و ہراس کے عالم میں کسی انّا کا پیٹ کہاں سے بھر سکتا تھا؟

ان تین عورتوں نے بھی شہزادی زینب پر یکے بعد دیگرے ممتا کی بارش کرنی چاہی۔ لیکن پیاس بجھانے والا مینہ نہ برسا۔ کلثوم زمانی نے مایوس ہوکر اسے دوبارہ اپنے سینے سے لگا لیا۔ بھوک کی شدت اور مسلسل روتے رہنے کی وجہ سے بچی نڈھال ہوگئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہوئی جارہی تھیں۔ ایسے ہی وقت مرزا ضیاء الدین نے خوابگاہ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "ظلِ سبحانی (بہادر شاہ ظفر) کا خاص خواجہ سرا آیا ہے۔ آپ کے بابا جانی کا حکم ہے کہ ہمیں فوراً ان کی خدمت میں حاضر ہونا ہے۔"

باہر آدھی رات کے سناٹے میں توپوں کی گھن گرج سے دل سہمے جارہے تھے۔ لیکن حکم سلطانی ملتے ہی وہ دونوں بھوک سے نڈھال بچی سمیت حاضری کے لئے روانہ ہوگئے۔

قلعے میں پہنچتے ہی کچھ کھانا پینا نصیب ہوا۔ بچی کو دودھ بھی ملا۔ چونکہ بیٹی کو طلب کیا گیا تھا۔ لہٰذا وہ شوہر اور بچی کو وہیں چھوڑ کر باپ سے ملنے حجرے میں چلی آئی۔

اس وقت بادشاہ مصلّے پر دوزانو بیٹھا ہوا تھا۔ دائیں ہاتھ میں تسبیح گھوم رہی تھی۔

وہ آنکھیں بند کئے قرآنی آیتوں کا ورد کر رہا تھا۔ ایسے ہی وقت بیٹی کی آواز سن کر چونک گیا۔ ہاتھ میں گھومتی ہوئی تسبیح رک گئی۔ کلثوم بڑے ادب سے جھک کر تین مجرے بجالائی پھر بولی۔ ''حضور نے یاد فرمایا ہے...؟''

اس نے بڑی محبت سے بیٹی کو دیکھا۔ وہ لاڈوں میں پلی بڑھی شہزادی اس وقت اجڑی اجڑی اور پریشان حال دکھائی دے رہی تھی۔ ''آہ۔ یہ ہماری شہزادی نہیں ہوسکتی... یہ تو کوئی مفلوک الحال دکھائی دیتی ہے....''

باپ کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ وہ اپنے پہلو میں ایک نشست کو تھپکتے ہوئے بولا۔ ''یہاں آؤ.... ہمارے قریب بیٹھو۔''

وہ نپے تلے انداز میں چلتی ہوئی اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ وہ کچھ دیر بیٹی کے مغموم چہرے کو تکتا رہا پھر بڑی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''بنت بہادر شاہ پر یہ کیا وقت آیا ہے؟ ہم ندامت سے مرے جا رہے ہیں۔''

کلثوم زمانی تڑپ کر باپ کے شانے سے لگ گئی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ روتے روتے کہنے لگی۔ ''آپ کی بادشاہت کو کسی دشمن کی نظر لگی ہے بابا جانی.....!''

وہ اسے تھپکتے ہوئے بولا۔ ''یہ مکافاتِ عمل ہے۔ جانے انجانے میں ہم سے جو غلطیاں ہوئیں' ان کا خمیازہ ہم ہی نہیں... ہماری اولاد بھی بھگت رہی ہے۔ جب ہمارے ساتھ ہماری اولاد کو بھی سزا ملتی ہے' تب معلوم ہوتا ہے کہ ناقابلِ برداشت سزا کیا ہوتی ہے؟ ابھی تو ابتدا ہوئی ہے۔ ہمیں اچھی طرح اندازہ ہے' آئندہ ہمارے مصائب میں کمی نہیں' اضافہ ہی ہونے والا ہے۔''

''ہمارے دکھ سکھ آپ کی ذات سے منسوب ہیں بابا جانی....! ہم آپ کا خون ہیں اور یہ انگریز خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لینا چاہیں گے۔''

وہ اس کے سر کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''فی الوقت حالات کا تقاضہ ہے کہ لہو کے اس رشتے سے کٹ جاؤ۔''

کلثوم زمانی چونک کر اس سے الگ ہوگئی۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔ ''ہم آپ کی بات نہیں سمجھے....''

وہ بولا۔ ''ہم اپنی باتیں مرزا ضیاء الدین کے سامنے سمجھانا چاہتے ہیں۔ انہیں اندر بلاؤ۔''

مرزا ضیاء الدین کو بلایا گیا۔ بہادر شاہ ظفر نے بیٹی سے کہا۔ ''کلثوم...! ہم تمہیں خدا کو سونپ رہے ہیں۔ قسمت میں ہوگا تو پھر دیکھ لیں گے۔ اپنے خاوند اور بیٹی کو لے کر فوراً کہیں چلی جاؤ۔ ہم بھی جاتے ہیں۔ نواب نور محل بیگم اور ہماری سمدھن حافظ سلطان بیگم بھی تمہارے ہمراہ روانہ ہوں گی۔''

بیٹی نے تڑپ کر کہا۔ ''خدارا بابا جانی...! ایسا حکم صادر نہ فرمائیں۔ ہم مصائب کے اس عالم میں آپ کو تنہا چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔''

وہ شکستہ لہجے میں بولا۔ ''جی تو ہمارا بھی نہیں چاہتا کہ اس آخری وقت میں اپنے بچوں کو اپنی آنکھوں سے اوجھل ہونے دیں۔ مگر کیا کریں؟ ساتھ رکھنے میں تم سب کی جان جانے کا اندیشہ ہے۔ الگ رہوگی تو انشاء اللہ بہتری کا سامان پیدا ہو سکے گا۔''

کلثوم زمانی انکار میں سر ہلا کر کچھ کہنا چاہتی تھی۔ ایسے ہی وقت بہادر شاہ ظفر رعشہ سے لرزتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر بارگاہِ الٰہی میں عرض کرنے لگا۔ اس نے پریشان ہو کر اپنے شوہر کو دیکھا۔ بہادر شاہ ظفر باآوازِ بلند کہہ رہا تھا۔ ''خداوندا... ہم یہ بے وارث بچے تیرے حوالے کر رہے ہیں۔ یہ محلوں کے رہنے والے جنگلوں ویرانوں میں جاتے ہیں۔ دنیا میں کوئی ان کا یارو مددگار نہیں رہا۔ تیمور کے نام کی عزت اور ان بے کس عورتوں کی آبرو تیرے حوالے ہے۔ پروردگار! یہی نہیں... بلکہ ہندوستان کے سب ہندو' مسلمان ہماری اولاد ہیں۔ آج کل سب پر مصیبت چھائی ہوئی ہے۔ ہمارے اعمال کی شامت سے ان کو رسوا نہ کر۔ اے دنیا کے مالک! سب کو پریشانیوں سے نجات دے...... آمین۔''

نواب نور محل بیگم بہادر شاہ ظفر کی شریک حیات تھی۔ اسے اور حافظ سلطان بیگم کو حجرے میں طلب کیا گیا۔ بادشاہ کا فیصلہ سن کر وہ بھی تڑپ گئیں۔ نور محل نے کہا۔ ''آپ بادشاہِ وقت نہ رہے۔ مگر آج بھی ہمارے بادشاہ ہیں۔ آپ کا فیصلہ ہمارے لئے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ لیکن حضور سے عاجزانہ عرض ہے کہ بربادی کے اس عالم میں ہمیں خود سے جدا نہ کریں۔ ہم نے آپ کے ہمراہ شاہانہ زندگی گزاری ہے۔ اب مقدر میں دربدری کی زندگی لکھی ہے تو یہ

بھی ساتھ ہی گزرے گی۔"

وہ بولا۔ "ہم نے مصلحت اندیشی سے کام لیتے ہوئے اپنے اور آپ کے راستے الگ کئے ہیں۔ تقدیر کو تدبیر سے بدلا جا سکتا ہے اور ہم یہی کر رہے ہیں۔"

"ہماری تقدیر تو آپ سے وابستہ ہے۔"

"خدا نے چاہا تو یہ وابستگی ہمیں پھر سے ایک کرے گی۔ فی الحال ہمارے فیصلے کے مطابق فوراً یہاں سے روانگی اختیار کی جائے۔ اس سے زیادہ نہ ہم کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ نہ سننا چاہتے ہیں۔"

پھر اس نے مرزا ضیاء الدین کو ایک چھوٹا سا صندوقچہ دیتے ہوئے کہا۔ "بہ وقتِ ضرورت یہ جواہرات کام آئیں گے اور ہاں... ہمارے بہنوئی مرزا عمر سلطان بھی آپ کے ہمراہ رہیں گے۔"

وقتِ رخصت قریب آیا تو وہ سب ہی لال قلعے کے اجڑے ہوئے سوگوار ماحول کو گھوم گھوم کر دیکھنے لگے۔ نواب نور محل عمارت کے ایک ایک کونے کو بڑی حسرت سے دیکھ رہی تھی، انہیں چھوڑ رہی تھی۔ ان در و دیوار سے ہزاروں خوبصورت یادیں وابستہ تھیں۔

دربارِ خاص کی ویرانی میں کلثوم زمانی کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ سونے چاندی اور جواہرات سے مرصع وہ خوبصورت تختِ شاہی جس پر بہادر شاہ ظفر بیٹھا کرتا تھا۔ بیٹی اس اجاڑ تخت سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھی۔ مرزا ضیاء الدین نے اسے سنبھالتے ہوئے کہا۔ "صبر کریں... اور اپنے بابا جانی کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگیں۔"

وہ تخت کو بڑی حسرت سے سہلاتے ہوئے بولی۔ "کیسے صبر کریں؟ یہ تخت نہیں، ہمارے بابا جانی کا وقار ہے۔ اب یہ شاہانہ وقار قائم نہیں رہے گا۔ وہ بھی اسے چھوڑ کر جانے والے ہیں۔ یہ سوچ سوچ کر ہمارا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔"

وہاں دو چار خادمائیں اور خواجہ سرا رہ گئے تھے۔ وہ بھی اپنے آقاؤں کی بے بسی پر زار و قطار رو رہے تھے۔ ایسے ہی وقت بہادر شاہ ظفر کی طرف سے حکم ملا کہ دیر نہ کی جائے۔ فوراً وہاں سے کوچ کیا جائے۔

☆☆☆

ادھر کلثوم زمانی چھوٹے سے قافلے کے ساتھ کوچ کرنے والی تھی۔ اُدھر دوسری شہزادیاں بھی گھر سے بے گھر ہو رہی تھیں۔

ایک شہزادی نرگس نظر کا ذکر یوں ہے کہ وہ مرزا شاہ رُخ ابن بہادر شاہ کی بیٹی تھی۔ بہادر شاہ کی یہ پوتی بڑی حد تک آرام طلب اور نفاست پسند تھی۔ صبح سورج نکلنے کے بعد بیدار ہوتی تھی۔ گرمیوں کے موسم میں اس کا چھپر کھٹ محل کے وسیع دالان میں بچھا دیا جاتا تھا۔

جب وہ سونے کے لئے اپنی نرم گداز مسہری پر آتی تھی تو مخملی تکیوں کے پاس جوہی، مولسری اور چمپا کے پھول رکھ دیئے جاتے تھے۔ تاکہ شہزادی رات بھر ان کی خوشبوؤں سے مسرور ہوتی رہے۔ ممتا بھری لوریاں سننے کے دن گزر گئے تھے۔ لہٰذا جوانی کی ناز برداریاں یوں اٹھائی جاتی تھیں کہ جب تک شہزادی کو نیند نہیں آتی تھی، تب تک چار ناچنے والیاں ہلکے سروں میں اسے گیت سناتی رہتی تھیں۔

لال قلعہ میں دیوانِ خاص کے قریب ہی ایک وسیع و عریض تالاب تھا اور اس تالاب کے عین وسط میں مرزا شاہ رُخ کا وہ خوبصورت محل بنا ہوا تھا۔ چونکہ اس محل کو پانی کے بیچوں بیچ تعمیر کیا گیا تھا، اس لئے اسے "جل محل" کا نام دے دیا گیا تھا۔ وہاں سنگِ مرمر کی جھلملیاں اور چراغدان بنے ہوئے تھے۔ شمال کی جانب سے آنے والا نہری پانی جب ان چراغدانوں سے گزرتا ہوا تالاب میں آتا تھا تو بڑا دلکش نظارہ پیش کرتا تھا۔

نرگس نظر شام کے بعد تالاب کے کنارے بیٹھ کر گھنٹوں اس نظارے سے محظوظ ہوتی رہتی تھی۔ پھر وہاں پانی پر اترنے والے چاند کے پاس اپنے عکس کو تکتی رہتی تھی۔ جیسے اپنے اور اس کے حسن کا مقابلہ کر رہی ہو۔ ایسے وقت تالاب کی ننھی ننھی رنگ برنگی مچھلیاں جیسے اس سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دیتی تھیں۔ شفاف پانی میں پھدک پھدک کر چاند کو اور اس کے عکس کو درہم برہم کرتی چلی جاتی تھیں۔

بہادر شاہ ظفر نے شاہی افراد کو لالِ قلعے سے رخصت ہو کر روپوشی کا حکم دے دیا تھا۔ قلعے کی پُر بہار فضائیں خزاں رسیدہ سناٹے میں بدلتی جا رہی تھیں۔ جب بادشاہ کو یہ یقین ہو گیا کہ دوسری تج انگریزی فوج دہلی کو فتح کر لے گی تو وہ بھی قلعے سے نکل کر ہمایوں

کے مقبرے میں جانے کی تیاری کرنے لگا۔

جل محل میں نرگس نظر کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ سنگِ مرمر کی جھلملیاں اور چراغدانوں کی رونقیں بجھ گئی تھیں۔ وہ بڑی حسرت سے انہیں دیکھتی ہوئی تالاب کے کنارے آ گئی۔ بے چین ہو کر پانی میں ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے بولی۔ ''وہ تالاب کی مچھلیاں کیا ہوئیں؟ یہاں آ کر پانی میں ہلچل کیوں نہیں مچا رہی ہیں؟''

وہ نازک مزاج ننھی مچھلیاں بھرپور توجہ اور درست خوراک نہ ملنے کے باعث مر چکی تھیں۔ مرزا شاہ رُخ نے وہاں آ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''نرگس...! ہم بابا حضرت (بہادر شاہ ظفر) کے ہمراہ جانا چاہتے ہیں۔ تم بھی روانگی کی تیاری کرو۔''

باپ کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔ اٹھتے ہوئے بولی۔ ''نہیں۔ ہم دادا حضرت کے ساتھ نہیں جائیں گے۔ آپ کو بھی ان کے ہمراہ نہیں رہنا چاہیے۔ روپوشی کے بعد انگریزی فوج دادا حضرت کو تلاش کرے گی۔ ایسے میں شاہی افراد جو اُن کے ساتھ ہوں گے وہ بھی مجرم سمجھے جائیں گے۔ آپ ہمارے ساتھ غازی نگر چلیں۔ وہاں ہماری انا کے گھر میں ہم گمنامی اختیار کر سکتے ہیں۔ پھر جب حالات اجازت دیں گے تو ہم واپس یہاں چلے آئیں گے۔''

مرزا شاہ رُخ نے بڑی افسردگی سے کہا۔ ''حالات کے بگڑے ہوئے تیور سمجھا رہے ہیں اب ان سلطانی محلوں میں واپسی ممکن نہیں ہے۔''

نرگس نظر نے تڑپ کر اسے دیکھا۔ وہ بولا ''تو پھر ٹھیک ہے۔ ہم تمہاری رائے کے مطابق غازی نگر جانے کے لئے رَتھ کا بندوبست کرتے ہیں۔''

مرزا شاہ رُخ وہاں سے چلا گیا۔ نرگس ٹہلنے کے انداز میں ایک ایک قدم چلتی ہوئی محل کے اندر آ گئی۔ وہاں آ کر اس نے اپنی ایک خاص کنیز کو آواز دی۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ پھر ایک اور خادمہ کو پکارا۔ لیکن ویران محل کے سناٹے میں سوائے اپنی بازگشت کے کوئی دوسری صدا سنائی نہیں دے رہی تھی۔ راہداریوں میں شمعیں روشن تھیں مگر وہاں کوئی خادم، خادمہ، کنیز یا خواجہ سرا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

وہ محل کی ویرانی سے گھبرا کر دوڑتی ہوئی دوبارہ دالان میں آ گئی۔ اس وسیع و عریض قلعے کے دوسرے حصوں سے لوگوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ایسا معلوم

ہو رہا تھا، جیسے لال قلعے کے تمام رہائشی رختِ سفر باندھ رہے ہیں۔

وہ تالاب کے کنارے بیٹھ کر مرزا شاہ رُخ کا انتظار کرنے لگی۔ رات دھیرے دھیرے گزرتی چلی جا رہی تھی۔ تقریباً دو بجے ایک خواجہ سرا نے وہاں آ کر دست بستہ عرض کیا۔ ''صاحبِ عالم نے فرمایا ہے، وہ آپ کے ہمراہ غازی نگر نہیں جا سکیں گے۔''

وہ پریشان ہو کر اٹھتے ہوئے بولی۔ ''کیوں نہیں جا سکیں گے جبکہ ابھی ہم سے وعدہ کر کے گئے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''یہاں اُن کے لئے بہت خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ انگریزی فوج قلعے کے اندر باہر چاروں طرف صاحبِ عالم کو تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ باہر سواری تیار ہے۔ آپ بس چلنے کی تیاری کریں۔''

مرزا شاہ رُخ سائیس کا بھیس بدل کر انگریزوں سے چھپتا چھپاتا لال قلعے سے نکل گیا تھا۔ نرگس نظر جواہرات کا ایک صندوقچہ لے کر اس خواجہ سرا کے ساتھ محل سے باہر جانے لگی۔ ایسے وقت قدم ڈگمگا رہے تھے۔ وہ ایسے شکست خوردہ انداز میں آگے بڑھ رہی تھی، جیسے اپنے حسین ''جل محل'' کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی ہو۔

رات کے تین بج چکے تھے۔ وہ آنسو بہاتی ہوئی رَتھ پر آ کر بیٹھ گئی۔ ادھر وہ محل کو الوداعی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ دوسری طرف کلثوم زمانی اور نور محل بیگم نے اپنے بھرے پُرے گھر پر اور سلطانی محلوں پر الوداعی نظر ڈالی تو دل بھر آیا۔ ایسے ہی وقت مرزا ضیاء الدین کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ ''چلیں.... دیر ہو رہی ہے۔''

وہ دونوں آنکھیں پونچھتی ہوئی رنجیدہ دل کے ساتھ رَتھ میں سوار ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ ننھا سا قافلہ آگے بڑھتا ہوا قلعے کی فصیلوں سے دور جانے لگا۔

ادھر نرگس نظر بے گھر ہوئی، اِدھر کلثوم زمانی اور نور محل بیگم بد نصیبی کی راہ پر چل پڑی تھیں۔ راستے میں نواب نور محل نے داماد سے پوچھا۔ ''ہمیں جانا کہاں ہے؟''

وہ بولا۔ ''اِس رَتھ بان کا گھر کورالی گاؤں میں ہے۔ ظلِ سبحانی کے مشورے کے مطابق فی الحال وہیں قیام کیا جائے گا۔ پھر دوسرے روز اجاڑہ ضلع میرٹھ میں میر فیض علی شاہی حکیم صاحب کی طرف کُوچ کیا جائے گا۔''

رتھ کے چاق و چوبند گھوڑے بڑی سبک رفتاری سے انہیں کورالی گاؤں کی طرف لئے جا رہے تھے۔ دوپہر کے بعد وہ قافلہ رتھ بان کے گھر کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ وہ تینوں بیگمات سواری سے اتر کر مکان کے اندر داخل ہوئیں تو رتھ بان کی بیوی کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُن شاہی بیگمات کو اپنے کچے مکان کے کس حصے میں بٹھائے؟ کیا خاطر کرے؟ وہاں زرنگار مسند نہیں تھے۔ پھٹا بوریا بچھاتے شرم آ رہی تھی۔ نواب نور محل اس کے تذبذب کو بھانپتے ہوئے بولی۔ ''کیا بات ہے؟ کیا ہمیں بٹھاؤ گی نہیں...؟''

وہ بڑی عاجزی سے بولی۔ ''ملکہ معظمہ! اس گھر میں کچھ بھی آپ کے شایانِ شان نہیں ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا' آپ کو کہاں بٹھاؤں؟ آپ مخملی تخت پر بیٹھنے کی عادی ہیں اور اس گھر میں بوریا بھی ہے تو پھٹا پرانا...''

پھر جیسے وہ ایکدم سے چونک گئی۔ فوراً ہی سر کی چادر اتار کر کچی زمین پر بچھاتے ہوئے بولی۔ ''اس گھر میں بچھانے کو اس سے زیادہ بہتر کچھ اور نہیں ہے۔''

نور محل اور کلثوم زمانی نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا کر رہی ہو؟''

''خدمت کا موقع ملا ہے۔ جو بن پڑے گا' وہ کرتی رہوں گی۔ آپ یہاں آرام کریں۔ میں کھانے پینے کا انتظام کرتی ہوں۔''

کلثوم زمانی نے فوراً ہی چادر اٹھا کر اس کے سر پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ہر چیز اپنی جگہ اچھی لگتی ہے۔ وہ پھٹا بوریا بچھاؤ۔ ہم اسی پر آرام کریں گے۔''

اس نے ایک ذرا ہچکچا کر انہیں دیکھا۔ نور محل نے کہا۔ ''ہم شاہی نفاست اور عادات واطوار سلطانی محلات میں چھوڑ آئے ہیں۔ لہٰذا کسی تکلف میں نہ الجھو۔''

اس نے فوراً ہی بوریا بچھا دیا۔ پھر کھانے کا انتظام کرنے رسوئی میں چلی گئی۔ کلثوم کو رہ رہ کر اپنے بابا جانی کی یاد ستا رہی تھی۔ حافظ سلطان بیگم نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''خدا نے چاہا تو وہ بہت جلد ہم سے آملیں گے۔''

نواب نور محل نے کہا۔ ''آہ... جو کبھی سوچا نہ تھا' وہ ہو گیا ہے۔ ہم جیتے جی اُن سے بچھڑ گئے ہیں۔ سلطان بیگم...! کیا یہ قیامت نہیں ہے...؟''

سلطان بیگم تسلی دینے کے انداز میں اس کے شانے کو تھپکنے لگی۔ نور محل نے بڑے صدمے سے کہا۔ ''افسوس تو یہ ہے کہ اس قیامت کے بعد بھی ہم زندہ ہیں۔ خدا کی قسم...! خودکشی حرام نہ ہوتی تو ہم وہیں بادشاہ سلامت کے قدموں میں اپنی جان دے دیتے۔''

وہ بولی۔ ''ایسی مایوسی کی باتیں نہ کریں۔ اس دربدری کو عارضی پریشانی سمجھ کر قبول کرتی رہیں۔ اللہ مسبب الاسباب ہے۔ بہتری کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور نکالے گا۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''اسی امید پر جی رہے ہیں۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔''

تھوڑی دیر بعد ہی جب ان کے سامنے مٹی کے برتنوں میں چھاچھ اور باجرے کی روٹی لا کر رکھی گئی تو بھوک اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ لیکن شاہی محلوں کی نرم گرم خوراک کھانے والوں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کڑک روٹی کو اور دودھ کے دھوون جیسی چھاچھ کو کس طرح کھایا پیا جائے؟

رتھ بان کی بیوی ان کی پریشانی کو بھانپتے ہوئے بولی۔ ''ہم اس روٹی کو چھاچھ میں بھگو کر کھاتے ہیں۔ پھر ایک گھونٹ چھاچھ کا لے کر اسے حلق سے اتار لیتے ہیں۔''

وہ تینوں اس کی ہدایت کے مطابق کھانے لگیں۔ ان حالات میں یہ کہاوت سچ ثابت ہو رہی تھی کہ بھوک کو کیا روکھا سوکھا اور نیند کو کیا بچھونا...؟ اس وقت وہ سخت روٹی شاہی بریانی اور متنجن سے زیادہ مزے دار معلوم ہو رہی تھی۔

اس روز کا سورج شاہی افراد کی بے کسی اور بدحالی کو دیکھتے دیکھتے آخر کار منہ چھپانے لگا تو کچے گھروندوں میں اندھیرا چھا گیا۔ ان غریبوں کے پاس تیل جلا کر گھروں میں روشنی کرنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ یوں بھی سورج ڈھلتے ہی گاؤں کی زندگی تھم جاتی تھی۔ دن بھر کے تھکے ماندے افراد فوراً ہی نیند کی آغوش میں دبک جاتے تھے۔ لہٰذا اندھیرا پھیلتے ہی ہر طرف ہُو کا عالم چھا گیا۔

وہ شاہی مہمان پچھلی رات سے جاگتے رہے تھے۔ بے رحم حالات کے ساتھ ساتھ سفر کی تکان بھی تھی۔ کچھ دیر تو انہیں وہ کھردرا بچھونا چبھتا رہا' مخملی نرم وگداز بستر یاد آتے رہے۔ لیکن پھر جلد ہی نیند نے آلیا۔ وہ رات امن سے بسر ہوئی۔ مگر دوسرے روز

جیسے پورے گاؤں میں قیامت برپا ہوگئی۔

گردونواح کے جاٹ گوجر جمع ہوکر کورالی گاؤں کو لوٹنے چلے آئے تھے۔ ان کے ہمراہ سینکڑوں عورتیں بھی تھیں۔ ان کے حلیے اس قدر گندے اور غلیظ تھے کہ انہیں دور سے دیکھ کر ہی گھن آرہی تھی۔ وہ عورتیں چڑیلوں کی طرح شاہی بیگمات سے چمٹ گئیں اور اپنے موٹے موٹے میلے کچیلے ہاتھوں سے اُن کے زیورات نوچنے کھسوٹنے لگیں۔ اُن کے بدنما لہنگوں سے ایسی ناگوار بو اٹھ رہی تھی کہ سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔

حالات کی یہ کیسی ستم ظریفی تھی کہ نہ سلطانی محلوں میں سکون میسر تھا' نہ کسی غریب کے کچے گھروندے میں..... بدبختی جیسے ان کا تعاقب کرتی ہوئی رتھ بان کے گھر تک پہنچ گئی تھی۔ شاہی گھوڑوں کے ساتھ ساتھ اس غریب کے گھر میں جو تھوڑا بہت راشن پڑا تھا' وہ لوٹنے والیاں اُسے بھی کپڑے کے تھیلوں میں بھر کر لے گئی تھیں۔ اس لوٹ مار کے بعد اتنا بھی باقی نہ رہا کہ ایک وقت کی روٹی کا بندوبست کیا جاسکتا۔

کلثوم زمانی نے بڑی مایوسی سے روتے ہوئے کہا۔ ''ہائے بابا جانی! آپ کہاں ہیں؟ یہاں آکر ہمارا حال دیکھیں۔ آپ نے فرمایا تھا' ہم آپ سے الگ رہیں گے تو اللہ بہتری کی راہیں دکھائے گا۔ مگر یہاں تو ہر طرف مایوسی ہی مایوسی دکھائی دے رہی ہے۔ جب بربادی ہمارا مقدر بن ہی گئی ہے تو آپ نے ہمیں خود سے دور کیوں کیا؟ ہم آپ کے ساتھ یہ صدمات جھیلتے تو شاید اتنی تکلیف نہ ہوتی۔''

نورمحل بیگم نے پریشان ہوکر مرزا ضیاء الدین سے کہا۔ ''وہ لوٹ مار کرنے والے رتھ کے گھوڑے بھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ اب میرٹھ تک کا سفر کیسے کیا جائے گا؟''

وہ اپنے لباس کی اندرونی جیب سے ایک جڑاؤ انگوٹھی نکال کر اسے دکھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ اُن لٹیروں کی نظروں سے بچ گئی ہے۔ ہم اسے بیچ کر سواری کا انتظام کرسکیں گے۔''

رتھ بان نے کہا۔ ''حضور! یہ بہت قیمتی ہے۔ اس چھوٹے سے گاؤں کا کوئی جوہری اسے خرید نہیں سکے گا۔ ہاں۔ یہاں کا زمیندار اچھا کھاتا پیتا آدمی ہے۔ اس کا نام بستی خاں ہے۔ شاید وہ اس کا مول چکا سکے گا؟''

''ہمیں اس کے پاس لے چلو۔''

وہ رتھ بان کے ساتھ زمیندار کے گھر پہنچا تو وہ مرزا ضیاء الدین کا شاہی لباس دیکھ کر فوراً ہی سمجھ گیا کہ وہ لال قلعے کا کوئی لعل ہے۔ بھٹکتا ہوا اس کے دروازے پر چلا آیا ہے۔ رتھ بان نے اس کا تعارف کرایا تو زمیندار نے بڑی خوش دلی سے اس کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔ ''جی فرمایئے... یہ خادم آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہے؟''

مرزا نے اپنے تمام حالات سنانے کے بعد وہ جڑاؤ انگوٹھی نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں آج ہر حال میں میرٹھ روانہ ہونا ہے۔ ہم اسے فروخت کرکے سواری کا انتظام کرنا چاہتے ہیں۔ کیا.آپ اسے خرید کر ہماری مدد کرسکتے ہیں؟''

وہ انگوٹھی واپس کرتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کی مدد تو کروں گا۔ لیکن یہ انگوٹھی نہیں خریدوں گا۔ آپ جاکر روانگی کی تیاری کریں۔ یہ خادم بیل گاڑی لے کر ابھی رتھ بان کے دروازے پر حاضر ہوجائے گا۔ پھر آپ جہاں جانا چاہیں گے' وہاں پہنچادے گا۔''

مرزا ضیاء الدین کے بے حد اصرار کے باوجود اس نے وہ انگوٹھی قبول نہیں کی۔

تھوڑی دیر بعد وہ ننھا سا قافلہ بستی خاں کی بیل گاڑی میں میرٹھ کے لئے روانہ ہوگیا۔ انگریز فوجی شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے ایک ایک فرد کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر موت کے گھاٹ اتار رہے تھے۔ راستے بھر یہ دھڑکا لگا رہا کہ اُن گوروں کو اگر سن گن بھی مل گئی کہ شاہی خاندان کا ایک ننھا سا قافلہ اجاڑہ کی طرف جارہا ہے تو وہ فوراً ہی حملہ کرکے انہیں راستے میں ہی نابود کردیں گے۔

طویل مسافت طے کرنے کے بعد وہ اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچے تو میر فیض علی شاہ انہیں دیکھتے ہی ٹھٹھک گیا۔ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''آ.....آپ.....سب یہاں.....؟''

اس کے سوال پر وہ سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ سوچا تھا' بڑی خوش دلی سے استقبال کیا جائے گا۔ لیکن میر فیض علی نے تو انہیں اندر آنے کی بھی دعوت نہیں دی تھی۔ اس کے شاہی خاندان سے خاص مراسم رہے تھے۔ مگر اس وقت اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق برسوں کی جان پہچان کو یکسر بھول رہا ہے۔ اس کی ایسی بے اعتنائی کے باوجود نورمحل بیگم نے سوچا کہ اس پر بادشاہ سلامت کے بہت سے احسانات ہیں۔ وہ صلے کے طور پر دو چار دنوں کے لئے [illegible]..... شاہی خاندان کے ستم رسیدہ

افراد کو اپنے گھر میں پناہ ضرور دے گا۔

اس نے میر فیض علی سے کہا۔ "ہمیں ظلِ سبحانی نے یہاں بھیجا ہے۔ ہم آپ کے گھر میں چند روز قیام کرنا چاہتے ہیں۔"

یہ سنتے ہی وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "آپ کے پیچھے انگریزی فوج لگی ہوئی ہے۔ وہ شاہی افراد کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ پناہ دینے والے کو بھی معاف نہیں کرتے۔ میں آپ لوگوں کی خاطر اپنا گھر بار تباہ نہیں کرنا چاہتا۔ آپ کوئی دوسرا ٹھکانہ تلاش کر لیں۔"

یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔ زندگی میں پہلی بار ایسی ذلت کا سامنا ہو رہا تھا۔ نواب نور محل چکرا کر وہیں دہلیز پر گر پڑی۔ کیسا برا وقت آیا تھا؟ وہ ملکہ معظمہ کہلانے والی' دربار خاص میں بادشاہِ وقت کے برابر بیٹھنے والی اس وقت بے سروسامانی کی حالت میں ایک بے مروت شخص کی دہلیز پر پڑی ہوئی تھی۔ یہ وہی شخص تھا' جوان شاہی افراد کی آنکھوں کے اشاروں پر چلتا پھرتا تھا' جو حکم دیا جاتا تھا' اسے فوراً پایہء تکمیل تک پہنچانا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ مگر اس وقت ان کی صورت سے بیزار تھا۔

ایسے کڑے حالات میں بستی خاں نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ میرٹھ شہر سے دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ دوسری طرف یہ خوف بھی تھا کہ انگریزی فوج پیچھا کرتی ہوئی وہاں تک پہنچ سکتی ہے۔ لہٰذا باہمی فیصلے کے مطابق فوراً ہی اجازہ سے رخصت ہو کر حیدر آباد کا رُخ کیا گیا۔

گاڑی میں صرف ایک بیل جُتا ہوا تھا۔ مرد حضرات کبھی گاڑی پر سوار ہوتے تھے' کبھی بیل کو ذرا آرام دینے کے لئے پیدل چلنے لگتے تھے۔ تیسرے روز وہ قافلہ ایک ندی کے کنارے پہنچا تو وہاں کوئل کے نواب کی فوج انگریزوں کے خلاف محاذ بنائے ہوئے تھی۔ جب یہ معلوم ہوا کہ وہ شاہی خاندان کا قافلہ ہے تو انہوں نے بڑی خوشدلی سے ان کا استقبال کیا۔ فوج کے سپہ سالار نے بیگمات کو خیمے میں بٹھانے کے بعد مرزا ضیاء الدین سے پوچھا۔ "ایسی کسمپرسی کی حالت میں آپ سب کہاں سے آرہے ہیں اور کدھر جا رہے ہیں؟"

وہ بولا۔ "حالات جہاں لے جا رہے ہیں' اُسی کو منزل بنا لیا ہے۔ تین روز پہلے

میرٹھ پہنچے تھے۔ اب حیدر آباد ہماری منزل ہے۔ مگر اس بیل گاڑی کے ذریعہ ہم یہ ندی پار نہیں کر سکتے۔ کیا آپ ہماری مدد کریں گے؟"

اس نے فوراً ہی سواری کے لئے ایک ہاتھی تیار کرایا اور بیل گاڑی کو پار اتارنے کے لئے ایک ناؤ کا بندوبست کیا۔ پھر ضیاء الدین سے کہا۔ "آپ لوگوں کا زیادہ دیر یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ انگریزی فوج کسی وقت بھی حملہ کرنے والی ہے۔ آپ بیگمات کو لے کر فوراً یہاں سے روانہ ہو جائیں۔"

سورج سر پر تھا۔ جیسے آگ برسا رہا تھا۔ محلوں میں سکھ چین کی دوپہریں گزارنے والوں کو اس وقت دو گھڑی کا آرام بھی میسر نہ ہوا۔ فوراً ہی ہاتھی پر سوار ہو کر ندی پار کرنے لگے۔ ابھی دوسرے کنارے اترے ہی تھے کہ سامنے سے انگریزوں کی فوج بلائے ناگہانی کی طرح وہاں پہنچ گئی۔ انہیں دیکھتے ہی وہ سب ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے جنگ شروع ہو گئی۔ مرزا ضیاء الدین اور عمر سلطان بھی نواب کے لشکر میں شامل ہو کر فرنگیوں سے مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن سپہ سالار نے پیغام بھجوایا کہ وہ بیگمات کو لے کر فوراً اس علاقے سے دور چلے جائیں۔

دور کیسے جاتے؟ جبکہ بستی خاں اپنی بیل گاڑی سمیت ندی کے دوسرے کنارے پر ہی رہ گیا تھا۔ انگریزی بندوقوں کی آوازیں' گھوڑوں کی ٹاپیں اور بھاری بھر کم ہاتھیوں کی دھم دھم دل دہلائے دے رہی تھی۔ ذرا دیر بعد ہی وہ میدانِ جنگ لہولہو ہونے لگا۔ نشانہ بننے والوں کی آہ و بکا اور جاں کنی کے عذاب میں مبتلا ہونے والوں کی فریادیں دل کی دھڑکنیں بڑھا رہی تھیں۔

عجیب وحشت ناک صورتحال تھی۔ جدھر نظریں اٹھاؤ' رقصِ اجل دکھائی دے رہا تھا۔ اُن بیگمات نے کبھی کسی جنگ میں شرکت نہیں کی تھی۔ زندگی کا یہ نیا تجربہ بہت ہی ہولناک تھا۔ وہ حواس باختہ سی ہو کر ایک دوسرے سے لپٹ گئی تھیں۔ ایسے میں ننھی زینب بھی بندوقوں اور توپوں کی گھن گرج سے سہم گئی تھی۔ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اس شور ہنگامے میں اُس کی ریں ریں کسی انگریزی فوجی کو متوجہ نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن وہ گردشِ حالات سے گزرنے والے بری طرح سہمے ہوئے تھے۔ مرزا عمر سلطان نے پریشان ہو کر بچی کو دیکھتے

ہوئے کہا۔ ''یہاں چھپے رہنے میں عافیت نہیں ہے۔ ہم کسی بھی وقت کسی بھی فرنگی کی نظروں میں آسکتے ہیں۔''

فوجیوں سے ذرا دور کھیتوں میں پکی ہوئی قدآور فصلیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ضیاء الدین نے ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بیل گاڑی کے بغیر یہاں سے دور جانا ممکن نہیں ہے۔ جنگ رُکنے تک ہم وہاں کھیتوں میں چھپ کر رہ سکتے ہیں۔''

دشمنوں کی آدھی فوج ندی پار کر کے نواب کے لشکر سے جا ٹکرائی تھی۔ باقی جو آدھے فوجی اس کنارے رہ گئے تھے' وہ بندوقوں اور توپوں کے ذریعہ دور ہی دور سے حملے کر رہے تھے۔ اُن سب کی نظریں نواب کے لشکر پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ شاہی افراد اس مڈبھیڑ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے' اُن فرنگیوں سے نظریں بچاتے ہوئے کھیت میں آکر چھپ گئے۔ قد آور فصل کی پناہ میں بیٹھ کر نہ انہیں میدانِ جنگ نظر آرہا تھا' نہ دشمنوں کو وہ روپوش ہو جانے والے دکھائی دے سکتے تھے۔

لیکن گردشِ حالات کا کیا کہنا...؟ وہ آنکھوں والے دشمن انہیں نہ دیکھ پائے۔ مگر ایک اندھی گولی نے اُن خانماں بربادوں کو تاڑ لیا۔ ناگہانی طور پر ایک بارودی گولی آکر کھیت میں گری اور کھڑی ہوئی فصل میں یکایک آگ بھڑک اٹھی۔

کہیں نہیں ہے آغوشِ اماں....
یہ خانماں برباد جائیں کہاں

آگ کی رفتار اور بھڑکتے شعلوں کی للکار سمجھا رہی تھی کہ پناہ گاہ بھسم ہو رہی ہے۔ روپوشی کا پردہ چاک ہونے والا ہے۔ دشمنوں کی نظروں میں آنے سے پہلے کسی دوسری سمت بھاگنا ہوگا۔

یہ حالات دیکھ کر وہ تینوں بیگمات ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں۔ جیسے نگاہوں ہی نگاہوں میں پوچھ رہی ہوں۔ ''کیسے بھاگیں....؟ ہمیں تو بھاگنا بھی نہیں آتا....''

انہیں اب تک سلطانی محلوں کی راہداریوں میں بڑے نازو انداز سے ٹہلنے کی عادت تھی۔ کیا معلوم تھا' یہ وقت بھی آئے گا کہ دشمنوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے دوڑنا پڑے گا؟ ہائے ری قسمت....! کیسی مصیبت میں الجھایا تھا...؟ ان شاہی بیگمات کو

بھاگنا نہیں آتا تھا۔

لیکن وقت بہت بڑا استاد ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی فوری طور پر کچھ سکھاتا نہیں ہے' مگر سمجھا ضرور دیتا ہے۔ اُن کی جانوں پر بن آئی تھی۔ ایسے وقت کیسے بھاگتے ہیں؟ یہ سمجھ میں آگیا اور وہ کھیت سے نکلنے کے لئے مرزا عمر سلطان کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگیں۔ راستے کی رکاوٹ بننے والی خودرو جھاڑیوں نے اور اونچی نیچی پگڈنڈیوں نے انہیں کچھ دیر بعد ہی ہلکان کر دیا۔ ایک پاؤں کہیں پڑتا تھا تو دوسرا کہیں پڑ رہا تھا۔

وہ شاہانہ باغیچوں کی مخملی گھاس پر چہل قدمی کرنے والیاں جنگلی گھاس کے تیور نہیں جانتی تھیں۔ لہٰذا ہر دو قدم کے بعد الجھ الجھ کر گر رہی تھیں۔ گرتے گرتے سنبھل رہی تھیں۔ کہیں کانٹے دار جھاڑیاں دامن تھام رہی تھیں۔ آگے عمر سلطان رہنمائی کر رہا تھا... پیچھے مرزا ضیاء الدین ننھی زینب کو سینے سے لگائے ڈگمگاتی' لڑکھڑاتی بیگمات کو سنبھالتا جا رہا تھا۔

حالات کی ایسی مار پڑ رہی تھی کہ نواب نور محل بیگم کھیت سے نکلتے ہی چکرا کر گر پڑی اور بے ہوش ہوگئی۔ ضیاء الدین اور عمر سلطان اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگے۔ ایک طرف نور محل بے ہوش پڑی تھی' دوسری طرف ننھی زینب بھوک سے بلبلا رہی تھی۔ کلثوم زمانی بری طرح ہانپتی ہوئی ایک طرف بیٹھ گئی۔ بیٹی کو سینے سے لگا کر ممتا کے خزانے لٹانے لگی۔

دل ہی دل میں روتے ہوئے کہنے لگی۔ ''الٰہی...! ہم کہاں جائیں....؟ کہیں کوئی سہارا نظر نہیں آرہا ہے۔ قسمت نے ایسا پلٹا کھایا ہے کہ شاہی سے گدائی ہوگئی۔ فقیروں کی زندگی میں چین واطمینان ہوتا ہے۔ مگر یہاں وہ بھی نصیب نہیں ہے.... یا اللہ...! ہمارے حال پر رحم کر....''

فوجیں آپس میں لڑتی ہوئی دور نکل گئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد بستی خاں بھی کسی طرح جان بچاتا ہوا اُن کے پاس پہنچ گیا۔ مگر اس کی بیل گاڑی دوسرے کنارے پر ہی رہ گئی تھی۔ ایسے ہی وقت نور محل ''ہائے'' کی ایک ماتمی کراہ کے ساتھ ہوش میں آگئی۔ ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے بولی۔ ''کلثوم.....!''

کلثوم زمانی فوراً ہی اس کی طرف لپکتے ہوئے بولی۔ ''یا اللہ.....! خیر....''

نورمحل نے روتے ہوئے کہا۔ ''ابھی ہم نے آپ کے بابا حضرت ظلِ سبحانی کو دیکھا ہے۔''

باپ کا ذکر سن کر کلثوم بے چین ہوگئی۔ نورمحل نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ...وہ طوق وزنجیر پہنے کھڑے تھے اور فرمارہے تھے کہ آج ہم غریبوں کے لئے یہ کانٹوں بھرا خاک کا بچھونا فرشِ مخمل سے بڑھ کر ہے۔ نورمحل...! گھبرائیں نہیں...ہمت سے کام لیتی رہیں۔ تقدیر میں لکھا تھا کہ ہم بڑھاپے میں یہ سختیاں برداشت کرتے رہیں...لہٰذا کررہے ہیں۔ ذرا ہماری کلثوم کو دکھادو۔ قیدوبند سے پہلے اسے دیکھنا چاہتے ہیں.....''

اس کی یہ باتیں سن کر کلثوم زمانی بلک بلک کر رونے لگی۔ روتے روتے کہنے لگی۔ ''کیسے سامنا ہوگا بابا جانی.....! آپ نے ہمیں خود سے بہت دور کردیا ہے۔ ہم ان جنگلوں ویرانوں میں بھٹکتے پھررہے ہیں۔ یہ بھی نہیں جانتے' وہاں آپ کے ساتھ کیسا سلوک کیا جارہا ہے؟''

وہ باپ کی یاد میں سسک رہی تھی۔ نورمحل نے مرزا ضیاء الدین کا بازو تھام کر جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔ ''مرزا...! کیا سچ مچ ہمارے بادشاہ سلامت کو زنجیروں میں جکڑا گیا ہوگا؟ کیا واقعی وہ قیدیوں کی طرح جیل خانے بھیجے گئے ہوں گے؟''

عمر سلطان نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''بند آنکھوں کے پیچھے نظر آنے والے خواب سچے نہیں ہوتے۔ کھلے ذہن سے سوچیں' یہ اطمینان رکھیں کہ وہ ہندوستان کے بادشاہ رہے ہیں اور بادشاہوں کے ساتھ ایسی بدسلوکیاں نہیں کی جاتیں۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ وہ اچھے حال میں ہوں گے۔''

حافظ سلطان بیگم نے کہا۔ ''یہ موئے فرنگی بادشاہوں کی قدر کیا خاک جانیں گے؟ نورمحل بیگم...! آپ نے تو انہیں طوق وزنجیر پہنے دیکھا ہے۔ ہم کہتے ہیں' وہ دشمن اس سے بھی زیادہ برا سلوک کرسکتے ہیں۔ ان سے کچھ بعید نہیں ہے۔''

ایسی باتیں سن کر دل ڈوبنے لگا۔ ندی کے دونوں کناروں پر امن ہوگیا تھا۔ لہٰذا بستی خاں بیل گاڑی کو ایک ناؤ میں رکھ کر اس پار لے آیا۔ اس نے کہا۔ ''ادھر نواب صاحب کی فوج میں ایک سپاہی دہلی سے آیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ پوری دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو

چکا ہے اور وہ بادشاہ سلامت کو گرفتار کرنے والے ہیں۔''

یہ خبر سنتے ہی وہ سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ان کے سینوں سے آہیں نکل رہی تھیں اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ ایک دوسرے کو یہ کہہ کر تسلیاں دے رہے تھے کہ بادشاہ سلامت کو گرفتار کرنے کی بات ہورہی ہے۔ ابھی گرفتار نہیں کیا گیا ہے۔ ابھی انہیں زنجیریں نہیں پہنائی گئی ہیں۔ اللہ کرے' خواب جھوٹا ہو۔

عمر سلطان نے ہتھیلی کا چھجا بنا کر دور تک نظریں دوڑاتے ہوئے کہا ''ی دیر میں شام ہوجائے گی۔ فی الحال یہاں کسی گاؤں میں قیام کرنا ہوگا۔''

پھر وہ سب بیل گاڑی میں سوار ہوکر ایک قریبی گاؤں کی طرف چل دیئے۔

وہاں راجپوتوں کی آبادی تھی۔ جب وہ ننھا قافلہ کچے پکے راستوں سے گزرتا ہوا گاؤں میں داخل ہوا تو آسمان پر شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ وہاں کے نمبردار کو جب یہ معلوم ہوا کہ وہ شاہی خاندان کے افراد ہیں تو اس نے فوراً ہی ان کے لئے کھانے پینے کا انتظام کیا اور رات گزارنے کے لئے ایک چھپر خالی کروادیا۔ اس کے اندر خشک لیکن قدرے نرم گھاس پھوس کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔

نمبردار نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ''یہاں شاہی نرم گرم بستر اور تکیے نہیں ہیں۔ یہ گھاس پھوس ہی ہمارا اوڑھنا بچھونا ہے۔''

یہ سوچ کر ہی دل الجھنے لگا تھا کہ تمام رات اُس گھاس کچرے میں پڑے رہنا ہوگا۔ مگر اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ نواب نورمحل نے نمبردار سے کہا۔ ''تمہاری میزبانی کا بہت بہت شکریہ۔ تم نے ایسی کسمپرسی کی حالت میں ہماری مدد کی ہے۔ رات گزارنے کے لئے یہ چھت دی ہے۔ ہم تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھولیں گے۔''

دن بھر پہاڑ جیسے مصائب سے گزرنے اور طویل مسافت کی سختیاں جھیلنے کے بعد ایک ذرا اطمینان اور آسودگی نصیب ہوئی تھی۔ وہ سب کچھ دیر تو اُس بچھونے پر کروٹیں بدلتے رہے۔ پھر گہری نیند میں ڈوب گئے۔

تقریباً آدھی رات کے بعد وہ سب ہی بے چین ہوکر اٹھ بیٹھے۔ گھاس کے تنکے سوئیوں کی طرح بدن میں چبھ رہے تھے۔ پورے وجود میں جیسے آگ سی لگ گئی تھی۔ ننھی

زینب کا رورو کر برا حال تھا۔ کلثوم زمانی نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''یا اللہ...! یہ کیا ہو رہا ہے؟ گھاس کو بچھونا سمجھ کر سوئے تھے۔ یہ بھی فرنگی دشمنوں کی طرح ہمیں کاٹ رہی ہے۔''

بستی خاں نے چاند تاروں کی روشنی میں اپنے ہاتھوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس گھاس میں پسّو ہیں....''

''یا خدا...! پسّو...؟'' یہ سنتے ہی وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ اُن پسّوؤں کا کوئی علاج نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہاں شاہی دواخانہ نہیں تھا کہ فوراً ہی حکم دے کر دوائیں چھڑک دی جاتیں اور اُن کیڑوں سے نجات حاصل کر لی جاتی۔ قسمت پلٹتے دیر نہیں لگتی۔ خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ شہنشاہِ ہند کے بال بچے کبھی یوں خاک پر بسیرے لیتے پھریں گے۔

ایک طرف پسّوؤں کی چھیڑ چھاڑ نے بے کل کیا ہوا تھا تو دوسری طرف اندھیری رات کے سناٹے میں گیدڑوں کی ماتمی صدائیں سن کر دل سہمے جا رہے تھے۔

وہ حالات کے مارے مقدر کی ٹھوکروں میں رُل رہے تھے۔ منزل بہ منزل تقدیر کی گردشوں کا تماشہ دیکھتے ہوئے آخر کار حیدرآباد پہنچ گئے۔ انجانے شہر میں کھانے پینے اور رہائش کا مسئلہ تھا۔ مرزا ضیاء الدین نے لوٹ کھسوٹ سے بچ جانے والی اس جڑاؤ انگوٹھی کو ایک جوہری کے ہاتھوں فروخت کر کے تازہ ترین مسائل کا حل نکال لیا۔ سیتارام پیٹھ میں کرائے کا ایک بوسیدہ سا مکان حاصل کیا گیا۔

مگر گردشِ حالات کے چکر ابھی باقی تھے۔ اس کرائے کے مکان میں سکون کے چند روز بھی نہ گزرے تھے کہ پورے حیدرآباد میں یہ خبر پھیل گئی کہ کوئل کے نواب کا لشکر شہزادوں کو پناہ دینے کے جرم میں انگریزوں کے عتاب میں آ گیا ہے۔ اس خبر کے ساتھ ہی یہ اعلان شہر بھر کے گلی کوچوں میں گونجنے لگا کہ اب کوئی شخص دہلی کے شہزادوں کو پناہ نہیں دے گا۔ بلکہ جس شہزادے کی خبر ملے گی' اُسے فوراً گرفتار کرانے کی کوشش کرے گا۔ انگریز سرکار سے غدّاری کی سزا موت سے کم نہ ہوگی۔

یہ اعلان سنتے ہی اُن کے ہوش اُڑ گئے۔ نور محل بیگم نے پریشان ہو کر عمر سلطان اور ضیاء الدین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''شاہی افراد اپنے تیوروں سے اور عادات و اطوار سے لاکھوں میں پہچانے جاتے ہیں۔ کسی دشمن کی مخبری سے گرفتاری کی نوبت آ سکتی

ہے۔ لہٰذا آپ دونوں گھر سے باہر ہرگز قدم نہیں نکالیں گے۔''

لیکن ایسی روپوشی میں جلد ہی فاقوں کی نوبت آ گئی۔ مرزا ضیاء الدین نے کہا۔ ''ملازمت کے بغیر اب کوئی چارہ نہیں ہے۔''

کلثوم زمانی نے بڑے صدمے سے اپنے شوہر کو دیکھا۔ یہ سن کر دل پر ایک گھونسہ سا لگا تھا کہ شہنشاہِ ہند کا داماد اب نوکریاں کرتا پھرے گا؟ وہ سب حالات سے مجبور ہو گئے تھے۔ آخر کار باہمی رائے کے مطابق یہ فیصلہ کیا گیا کہ عمر سلطان اور ضیاء الدین نوکری کے لئے گھر سے نکلیں گے لیکن باہر ملنے جلنے والوں سے لاتعلقی روا رکھیں گے۔ اس طرح وہ شاہی افراد معاشرتی میل جول بڑھائے بغیر روپوشی کی زندگی گزارنے لگے۔

کچھ عرصہ بعد میاں نظام الدین کو خبر ملی کہ وہ شاہی افراد حیدرآباد میں ایسی کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں تو وہ فوراً ہی اُن کی خبر گیری کے لئے وہاں چلے آئے۔

وہ چشتی نظامی فخری کے صاحبزادے تھے۔ بہادر شاہ ظفر انہیں اپنا پیر مانتے تھے۔ جب وہ قلعے میں تشریف لاتے تھے تو انہیں مسندِ زرنگار پر بٹھایا جاتا تھا۔ مگر اس وقت وہ ان کے مہمان بنے تو بیٹھنے کو چٹائی بھی نصیب نہ ہوئی۔

انہوں نے تمام حالات سننے کے بعد کہا۔ ''بادشاہت فنا ہو گئی ہے۔ فرنگی شاہی افراد کو خاص طور پر شہزادوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر جہانِ عدم کی جانب رخصت کر رہے ہیں۔ اب اس سلطنت میں کہیں جائے عافیت نہیں رہی ہے۔ آپ سب یہاں سے ہجرت کر کے کسی دوسرے ملک چلے جائیں۔''

نور محل بیگم نے ایک ذرا ہچکچا کر انہیں دیکھا۔ وہ بولے۔ ''اخراجات کی پرواہ نہ کریں۔ ہم سارا انتظام کروا دیں گے۔''

کسی دوسرے ملک جانے کی بات آئی تو سب ہی سوچ میں پڑ گئے کہ کہاں جانا چاہئے؟ میاں صاحب نے کہا۔ ''مکّہ معظمہ سے بہتر کوئی دوسری جگہ نہیں ہو سکتی۔''

مکّہ مکرمہ کا نام سنتے ہی سب کے چہرے کھل گئے۔ خدا کے گھر کی زیارت نصیب ہونے والی تھی۔ لیکن سلطنتِ ہندوستان سے جدائی کا غم اپنی جگہ تھا۔ دوسرے روز وہ حیدرآباد سے بمبئی پہنچ گئے۔ پھر وہاں سے بحری جہاز کے ذریعہ مکّہ معظمہ کی سمت روانہ

ہوگئے۔

دورانِ سفر جو مسافر یہ سنتا تھا کہ وہ شاہِ ہند کے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں تو وہ اُن کے ساتھ دو گھڑیاں گزارنے کے لئے بے چین ہو جاتا تھا۔ انہوں نے درویشانہ رنگین ملبوسات پہنے ہوئے تھے۔ ایک ہندو نے اُن کا حلیہ دیکھ کر عمر سلطان سے پوچھا۔ ''تم لوگ کس پنتھ کے جوگی اور جوگن ہو؟''

اس کے سوال نے زخموں پر نمک چھڑک دیا تھا۔ وہ سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ کلثوم زمانی نے بڑی افسردگی سے کہا۔ ''ہم مظلوم شاہ کی اولاد ہیں۔ ظالموں نے اُن کا گھربار چھین لیا ہے۔ ہمیں اُن سے جدا کر کے جنگلوں میں نکال دیا ہے۔ اب وہ ہماری صورت کو ترستے ہیں اور ہم اُن کے درشن کئے بغیر بے چین ہیں۔''

اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ وہ ہندو اُن کی اصلیت سے بے خبر تھا۔ جب دوسرے مسافروں کے ذریعہ یہ معلوم ہوا کہ وہ شہنشاہِ ہند کے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں تو وہ اُن کی بدحالی پر دلبرداشتہ ہو گیا۔ روتے ہوئے بولا۔ ''بہادر شاہ ہم سب کے باپ اور گرو ہیں۔ اُن کی بربادی ہمیں خون کے آنسو رُلاتی ہے۔ انگریز سرکار بڑی ظالم ہے۔ رام جانے ہمارے ہندوستان کا اب کیا ہوگا؟''

جو ہونا تھا' وہ ہو رہا تھا۔ سلطنت ہندوستان میں گوروں نے اپنا رنگ خوب جما لیا تھا اور ان کے آگے تیموریہ بادشاہت کا رنگ ایسا پھیکا پڑ گیا تھا کہ آئندہ وہاں کسی مسلمان کی تو کیا ایک ہندو کی حکومت بھی قائم ہونے کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

☆☆☆

کلثوم زمانی کے ساتھ ساتھ بہادر شاہ کی پوتی نرگس نظر ان دنوں کن حالات سے گزرتی رہی اس کا ذکر بھی ضروری ہے۔

وہ شہزادی لال قلعے سے کوچ کر کے غازی نگر اپنی انا کے گھر پہنچ گئی تھی۔ دو روز تک وہاں آرام و سکون سے رہی۔ مگر تیسرے روز یہ ہولناک خبر مشہور ہو گئی کہ بادشاہ عالم گرفتار ہو گئے ہیں اور کئی شہزادے قتل کر دیئے گئے ہیں۔ سکھ فوج اب غازی نگر کو لوٹنے آ رہی ہے۔

نرگس نظر نے جواہرات کے صندوقچے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم یہ جواہرات مشکل وقت کے لئے اپنے ہمراہ لائے تھے۔ اگر انہیں لوٹ لیا گیا تو ہم خالی ہاتھ رہ جائیں گے۔ نہ جانے آئندہ کیسے حالات کا سامنا کرنا ہوگا؟ ہم انہیں لٹیروں سے کیسے بچائیں..؟''

انا نے مشورہ دیا کہ اس صندوقچے کو زمین کھود کر دبا دینا چاہئے۔ مشورہ قابل قبول تھا۔ نرگس نے فوراً ہی اپنے صندوقچے کو زمین میں دفن کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی سکھ فوج غازی نگر میں داخل ہو گئی۔ باغیوں کی تلاش کے ساتھ ساتھ لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا۔ خاص مخبروں کے ذریعہ جب یہ معلوم ہوا کہ بادشاہ کی ایک پوتی اپنی انا کے گھر میں موجود ہے تو دو سکھ سردار چار سپاہیوں کے ساتھ اس گھر میں گھس آئے۔ انا کو اور اس کے گھر والوں کو ڈرا دھمکا کر بادشاہ کی پوتی کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے لگے۔

نرگس نظر کو کوٹھڑی میں چھپا دیا گیا تھا۔ وہ اندر سامان میں دبکی' سہمی ہوئی سی ان دشمنوں کی آوازیں سن رہی تھی۔ چاروں سپاہی گھر کا کونا کونا چھان رہے تھے۔ انہوں نے کوٹھڑی کا دروازہ کھولنا چاہا تو پتہ چلا' اسے اندر سے بند کیا گیا ہے۔ شبہ یقین میں بدل گیا۔ سپاہیوں نے فوراً ہی اس دروازے کو توڑ ڈالا۔ تھوڑی دیر بعد ہی نرگس نظر کو برآمد کر کے سکھ سرداروں کے سامنے پہنچا دیا۔

ایک سردار نے اس کا بغور جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تم بہادر شاہ کی پوتی ہو؟''

وہ بولی۔ ''اگر میرا تعلق کسی شاہی خاندان سے ہوتا تو میں اس غریب گھرانے میں کیوں آتی؟ بادشاہ کی پوتی ہوتی تو تم اس طرح مجھے بے پردہ اپنے سامنے لانے کی جرات نہ کرتے۔ تم ہندوستانی ہو۔ تمہیں اپنے ملک کی عورتوں پر ظلم کرتے ہوئے شرم آنی چاہئے۔''

''زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ اگر تم شاہی خاندان سے تعلق نہیں رکھتی ہو تو یہاں کوٹھڑی میں کیوں چھپی ہوئی تھیں؟ تمہارا لباس' تمہارے تیور بتا رہے ہیں' تم بہادر شاہ کی پوتی ہو۔''

نرگس نظر نے نظریں جھکا لیں۔ سردار نے کہا۔ ''تمہارے باپ نے بہت سی سکھ عورتوں اور بچوں کو قتل کرایا ہے۔''

وہ بولی۔ ''جو کرتا ہے' وہی بھرتا ہے۔ ہم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے' کسی سکھ کو قتل نہیں کیا ہے۔ ہمیں تلواریں چلانی نہیں آتیں۔ اگر ہمارے [illegible] جانی کے تیر و تلوار سے

سکھوں کی خونریزی ہوئی ہے تو اُن سے جا کر پوچھو۔ ہمارے پاس کیا لینے آئے ہو؟"

دوسرے نوجوان سردار نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں تلواروں اور ہتھیاروں سے مارنے کی کیا ضرورت ہے؟ تم تو آنکھوں سے قتل کرتی ہو۔"

نرگس نظر اندر سے سہمی ہوئی تھی۔ مگر اس نوجوان کی بات سنتے ہی غصے سے بھڑک اٹھی۔ ایک ذرا دیر کے لئے یہ بھول گئی کہ اس وقت "جل محل" میں اپنے غلاموں کے سامنے نہیں ہے۔ بلکہ انا کے غریب خانے میں دشمنوں کے روبرو کھڑی ہے۔ وہ اس نوجوان کو گھورتے ہوئے کڑک دار لہجے میں بولی۔ "خاموش رہو بے ادب.....! بادشاہوں کے ساتھ ایسی بدتمیزی سے بات نہیں کی جاتی۔ ہم تمہاری زبان گدی سے کھنچوا کر ہتھیلی پر رکھ دیں گے۔"

وہ اس کی بات سن کر طیش میں آ گیا۔ فوراً ہی آگے بڑھ کر اُس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر ایک جھٹکا دیا۔ پھر اس کی پٹائی کرتے ہوئے بولا۔ "یہ شاہی تیور تمہارے غلام برداشت کرتے تھے۔ میں نہیں کروں گا۔"

دوسرے سردار نے فوراً ہی اسے نرگس نظر سے دور کرتے ہوئے کہا۔ "اوئے کیا کرتا ہے؟ عورتوں کے ساتھ ایسی زیادتی مناسب نہیں ہے۔"

نرگس نظر کے جیسے ہوش اڑ گئے تھے۔ آج تک کسی نے اسے پھول کی چھڑی سے بھی نہیں مارا تھا۔ وہ اپنا بدن سہلاتے ہوئے رونے لگی۔ زندگی میں پہلی بار ایسی ذلت کا سامنا ہو رہا تھا۔ سردار نے اپنے سپاہیوں کو حکم دے کر ایک بیل گاڑی منگوائی تھی۔ وہ اُن کے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن من مانی بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس بے عزتی نے یہ سمجھا دیا تھا کہ شاہانہ تیور دکھائے گی تو اور لات جوتے کھائے گی۔ لہٰذا نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر جانے لگی۔

اسے دہلی کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ راستے میں ایک گاؤں کے جاٹوں اور گوجروں نے اُن پر حملہ کر دیا۔ گاڑی میں جتنے سکھ تھے' وہ سب مارے گئے۔ حملہ آوروں نے ان کا تمام مال و اسباب لوٹ لیا۔ نرگس نظر ایسی خونریزی دیکھ کر گھبرا اٹھی تھی۔ پے در پے بدلتے ہوئے حالات نے اس کے اعصاب شل کر ڈالے تھے۔ حملہ کرنے والے وہ گنوار

اسے قیدی بنا کر اپنے گاؤں میں لے آئے۔ اس کی قیمتی شال اور لباس چھین لیا گیا۔ پھر اس کے ساتھ جیسا سلوک کیا گیا' یہ وہی جانتی ہے۔ اسے پہننے کے لئے کسی چماری کا میلا لہنگا' کرتا اور پیوند لگی ہوئی اوڑھنی دے دی گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی قریبی گاؤں کے چند مسلمان گنوار وہاں آ گئے۔ وہ رانگھڑ ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں چند نگا قوم کے مسلمان بھی تھے۔ ان کے نمبردار نے نرگس نظر کو دیکھتے ہوئے گوجروں اور جاٹوں سے کہا۔ "یہ مسلمان لڑکی ہے۔ اسے ہمارے حوالے کر دو۔"

ایک گوجر نے کہا۔ "یہ ہمارے کسی کام کی نہیں ہے۔ قیمت چکاؤ اور لے جاؤ۔"

وہ محلوں سے نکلنے والی' ہاتھ سے بے ہاتھ ہوتی ہوئی کہیں سے کہیں پہنچ گئی تھی۔ نمبردار اُسے گوجروں سے خرید کر اپنے گھر لے آیا۔ گھر کیا تھا؟ سرکنڈوں اور جھاڑیوں سے بنا ہوا بڑا سا چھپر تھا۔ چونکہ وہ وہاں کا نمبردار تھا' اس لئے اس کا چھپر گاؤں کی دوسری جھونپڑیوں سے بڑا اور کسی حد تک مضبوط بنا ہوا تھا۔

نمبردار کے جواں سال بیٹے اور بیوی نے بڑی خوشدلی سے اس کا استقبال کیا تھا۔ نرگس نظر چپ چپ سی ایک ایک کے چہرے کو تک رہی تھی۔ دل میں یہ خوف سمایا ہوا تھا کہ نہ جانے آئندہ کیسے حالات پیش آنے والے ہیں؟ پہلے سکھوں نے اغوا کیا تھا' پھر گوجروں اور جاٹوں نے اپنا قیدی بنا لیا تھا اور اب یہ گاؤں کے گنوار اسے خرید کر اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ مگر بڑی محبت سے پیش آ رہے تھے۔

دو روز بعد نمبردار نے اپنے بیٹے اور بیوی کی موجودگی میں نرگس سے کہا۔ "میں نے اور میری بیوی نے تمہیں اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ایک ہفتے بعد نکاح پڑھا دیا جائے گا۔"

نرگس اس کی بات سن کر اچھل پڑی۔ حیرانی اور پریشانی سے ان کے چہرے تکنے لگی۔ "گنوار گھرانے سے رشتہ داری.....؟"

دل پر جیسے گھونسے سے پڑ رہے تھے۔ نمبردار کچھ بول رہا تھا۔ وہ سن رہی تھی۔ مگر سمجھ نہیں رہی تھی۔ بس ایک ٹک اس گنوار نوجوان کو تک رہی تھی' جسے اُس کا مجازی خدا اور

سرتاج بنانے کا فیصلہ کیا جا رہا تھا۔

کیا وہ اس کے سر کا تاج بننے کے لائق تھا؟ اگرچہ صورت شکل کا اچھا تھا' مردانہ وجاہت سے بھرپور تھا لیکن.... گنوار تو گنوار ہی ہوتا ہے۔ اس کے نطفے سے پیدا ہونے والے بچے شاہی کوکھ میں پرورش پانے کے باوجود گنوار ہی کہلائیں گے۔

وہ رات گزر گئی۔ دوسرا دن بھی گزر گیا۔ اس کا دماغ کسی بھی طرح اس رشتہ داری کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ جی میں آیا' وہاں سے فرار ہو جائے۔ لیکن کہاں جائے...؟ اس جھونپڑے کی محفوظ چار دیواری کے باہر خطرہ ہی خطرہ تھا۔ کہیں سکھ دشمن تھے' کہیں انگریزی فوج تھی اور کہیں گوجر جاٹ لٹیرے تھے۔ اس جھونپڑے سے باہر جاتی تو مالِ غنیمت بن کر رہ جاتی۔

نمبردار اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ کچے صحن میں چٹائی بچھا کر سوتا تھا۔ نرگس نظر کو کھلے آسمان تلے نیند نہیں آتی تھی۔ لہٰذا اس کی چٹائی اندر بچھائی جاتی تھی۔ ایسے وقت وہ اپنے خوبصورت چھپر کھٹ کو یاد کرتی رہتی تھی۔ خادماؤں کی مترنم اور سریلی آوازیں سن کر سونے جاگنے والی کو اب زندگی کی تھکن ایسی لوریاں سناتی تھی کہ وہ جلد ہی گہری نیند میں ڈوب جاتی تھی۔

ایک رات اچانک ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اندر آنے والا سایہ سایہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے فوراً ہی خود کو اوڑھنی میں چھپاتے ہوئے پوچھا۔ "کک... کون ہے؟"

جواب میں مردانہ سرگوشی سنائی دی۔ "گھبراؤ نہیں... میں ہوں۔"

وہ نمبردار کا بیٹا تھا۔ نرگس نظر سہم گئی۔ گھبرا کر سوچنے لگی۔ "یا اللہ! ہمارا مقدر ہمیں یہ کیسے سنگین تماشے دکھا رہا ہے؟"

وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھتا ہوا اس کی طرف آ رہا تھا۔ نرگس نے بڑی ہمت سے کام لیتے ہوئے ایک ذرا سخت لہجے میں کہا۔ "وہیں رُک جاؤ۔ نہیں تو میں شور مچا کر پورے گاؤں کو جگا دوں گی۔"

وہ جہاں تھا' وہیں رُک گیا۔ دھیمی آواز میں بولا۔ "میری نیت میں کھوٹ نہیں ہے۔"

"کھوٹ نہیں ہے تو' رات کے اندھیرے میں چوروں کی طرح کیوں آئے ہو؟"

"تم سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

"ضروری باتیں دن کے اُجالے میں بھی ہو سکتی ہیں۔"

وہ ایک ذرا ہچکچایا۔ پھر بولا۔ "جب سے ابا نے ہماری شادی کی بات کی ہے۔ تب سے تم خاموش ہو۔ نہ اپنا کوئی فیصلہ سنا رہی ہو' نہ صاف انکار کر رہی ہو۔"

اس نے کہا۔ "میرے انکار یا اقرار سے کیا ہوتا ہے؟ تمہارے ماں باپ شادی کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ تم بھی جشن مناؤ۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "میں اپنی خوشیوں سے پہلے تمہاری رضا مندی چاہتا ہوں۔"

اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بول رہا تھا۔ "تم ابا کے فیصلے کے آگے جبراً سر نہ جھکاؤ۔"

وہ اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر بولی۔ "تو پھر کیا کروں...؟"

"تم یہاں کسی رشتے کے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ اپنی مرضی سے کہیں جا بھی نہیں سکتیں۔ ابا نے تمہیں خریدا ہے۔ تم وہ پیسے انہیں لوٹا کر کہیں بھی جا سکتی ہو۔"

اس نے شکستہ لہجے میں کہا۔ "پیسے...؟ نہ پیسے ہوں گے' نہ میں یہاں سے جا سکوں گی۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "تم راضی خوشی میری منکوحہ بنو گی تو ٹھیک ہے۔ ورنہ...."

اس نے لباس کی اندرونی جیب سے کپڑے کی ایک پوٹلی نکالی۔ اشرفیوں کی جھنکار سنائی دی۔ نرگس نظر نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ پوٹلی دکھاتے ہوئے بولا۔ "صبح یہ پیسے ابا کو لوٹا کر تم یہاں سے جا سکتی ہو۔"

اس نے اشرفیوں کی وہ پوٹلی اس کے پیروں کے قریب کچی زمین پر رکھ دی۔ نرگس حیران پریشان سی اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ شکستہ قدموں سے چلتا ہوا باہر چلا گیا۔ وہ سر جھکا کر اس پوٹلی کو تکنے لگی۔ ان لمحات میں فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ وہ نوجوان اسے آزادی کا پروانہ دے گیا ہے یا انسانی محبت کو سمجھنے کا نسخہ بتا گیا ہے؟

سہاگ کی سیج پر زندگی مہکنے لگی۔ مجازی خدا کی چاہت اور قربت نے اجڑی ہوئی

زندگی میں رونقیں بھر دیں۔ وہ میکے کے خوبصورت محلوں سے نکلنے والی پیا کے کچے آنگن میں ہنسنے، کھلکھلانے لگی۔

انگریزوں نے ہندوستان پر پوری طرح قبضہ جمالیا۔ ان کے جاسوس شاہی افراد کی خبریں لیتے پھر رہے تھے۔ چار مہینے بعد ہی یہ خبر ملی کہ ایک گاؤں کے نمبردار نے مرزا شاہ رخ کی بیٹی کو اپنے گھر میں پناہ دے رکھی ہے اور اس سے اپنے بیٹے کی شادی بھی کروادی ہے۔ انگریز حاکم نے فوراً ہی اُن کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا۔

میرٹھ کی پولیس نرگس نظر کو اور ان باپ بیٹے کو گرفتار کر کے دہلی لے آئی۔ انگریز حاکم مرزا شاہ رُخ کے بارے میں جاننا چاہتا تھا لیکن نرگس نظر سے کوئی معلومات حاصل نہ ہوسکیں۔

ایک باغی کی بیٹی کو پناہ دینے کے جرم میں نمبردار اور اس کے بیٹے کو دس سال کے لئے جیل بھیج دیا گیا۔ پھر حاکم نے نرگس نظر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں دہلی شہر میں کسی مسلمان کے حوالے کیا جائے گا۔ بولو...! کس کے پاس جانا چاہتی ہو؟“

وہ سر جھکا کر بولی۔ ”اگر میرے خاندان کے افراد یہاں ہیں تو مجھے ان کے پاس بھیج دیا جائے۔“

حاکم نے کہا۔ ”تیمور یہ خاندان کے تمام افراد ابھی تک روپوش ہیں۔ کسی نے دہلی شہر کا رُخ نہیں کیا ہے۔ تمہاری طرح جنگلوں اور دیہاتوں میں زندگی گزار رہے ہیں۔“

نرگس نظر کو ایک بار پھر مایوسیوں نے گھیر لیا تھا۔ انگریز بہادر کے حکم سے اسے ایک مسلمان سپاہی کے حوالے کر دیا گیا۔ وہ اسے بہن بنا کر اپنے گھر میں لایا تو اس کی بیوی نے ناگواری سے کہا۔ ”منہ بولی بہن ہمیشہ بہن بن کر نہیں رہتی۔ یہ خوبصورت ہے، جوان ہے۔ میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہوں گی۔ اسے ابھی اور اسی وقت یہاں سے چلتا کردو۔ نہیں تو میں چلی میکے... جب تک یہ اس گھر سے نہیں جائے گی۔ میں یہاں قدم نہیں رکھوں گی۔“

وہ ایک منہ بولی بہن کی خاطر اپنی بیوی کو خفا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا نرگس نظر کو اپنے ایک عمر رسیدہ دوست کے گھر لے آیا۔ اس گھر میں ایک رات آرام سے بسر ہوئی۔

لیکن دوسری رات اسے وہاں سے اغوا کر لیا گیا۔

وہ ایک بار پھر حالات کی چکی میں پس رہی تھی۔ اغوا کرنے والے اسے دہلی کے ایک قریبی گاؤں میں لے آئے تھے۔ وہاں آ کر معلوم ہوا کہ وہ لوگ اس کے سسر اور شوہر کے رشتہ دار ہیں۔ اس کے خیر خواہ ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ جب تک وہ دونوں جیل میں قید رہیں گے، تب تک نرگس نظر ان رشتہ داروں کے پاس رہے گی۔ پھر رہائی ملتے ہی اسے اس کے شوہر کے حوالے کر دیا جائے گا۔ وہ محبوب شوہر کی یاد میں دن رات کبھی آنسو بہاتی تھی، کبھی آہیں بھرتی تھی۔ اس کی رہائی کے لئے دعائیں مانگتی رہتی تھی۔

دل سے نکلنے والی سچی دعاؤں نے شرفِ قبولیت حاصل کی۔ چار سال بعد ہی برٹش سرکار نے ان باپ بیٹے کو رہائی کا حکم دے دیا۔

اس چار سالہ جدائی نے محبت میں مزید شدت پیدا کر دی تھی۔ کوئی اس سے پوچھتا کہ اس گنوار رانگھڑ میں اس کے لئے کشش کیوں پیدا ہوگئی ہے تو شاید وہ جواب نہ دے پاتی۔ کیونکہ یہ ایک نفسیاتی معاملہ تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ دن بھر محنت و مشقت کرنے والا جب شام کو آ کر اسے بازوؤں میں بھر لیتا ہے تو اس محنتی شوہر کا پسینہ اس کے حواس پر کیوں چھانے لگتا ہے؟

جب وہ موجود نہ ہوتا اور ہوا کا کوئی جھونکا اسے چھو کر گزرتا تو اسے اپنے گبرو کے پسینے کی مہک کا احساس ہوتا۔ شاہی محل کے مخملی بستر میں بسی ہوئی مولسری، جوہی اور چمپا کی خوشبو ایک مرد کے پسینے کے آگے ماند پڑ گئی تھی۔

☆☆☆

بہادر شاہ اپنی بیگم زینت محل اور شہزادے جواں بخت کے ساتھ اس قلعے سے نکل کر نظام الدین چلا آیا۔ وہاں ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لی۔ ان حالات کے پیش نظر غالب نے لکھا ہے۔ ”دو تین دن تک کشمیری دروازے تک تمام راستے میدان جنگ بنے رہے۔ دہلی دروازہ، ترکمان دروازہ، اجمیری دروازہ، یہ تینوں دروازے انگریز فوج کے قبضے میں رہے۔ مجھ مُردہ دل کا خاک کدہ وسط شہر میں کشمیری دروازے اور دہلی دروازے کے درمیان ہے اور میرے مکان سے دونوں کا فاصلہ برابر ہے۔ اگرچہ قلعے کا دروازہ بند کر دیا

گیا لیکن ابھی اتنا حوصلہ باقی تھا کہ باہر چلے جاتے تھے اور کھانے پینے کا سامان لے آتے تھے۔ بادشاہ ظفر کا اس سے بھی برا حال تھا۔ وہ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ ہمایوں کے مقبرے میں بے سروسامانی کی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔''

ہائے رے مظلوم بادشاہ! نہ بچھونا تھا' نہ تکیہ تھا۔ وہ قالین پر لیٹا ہوا سوچ رہا تھا۔ ''ہمارا یہ حال ہے تو پتہ نہیں بے گھر ہونے والی شہزادیوں اور شہزادوں کا کیا حال ہو گا؟ وہ کہاں ہوں گے؟ کن حالات سے گزر رہے ہوں گے؟''

بادشاہ کی بیٹی کلثوم زمانی اور پوتی نرگس نظر کی دربدری کا ذکر ہو چکا ہے۔ شاہی خاندان کی بپتا بہت طویل اور عبرت ناک ہے۔ آئندہ اختصار سے ایک ایک شہزادی اور ایک شہزادے کا ذکر کیا جائے گا۔

بہادر شاہ ظفر کی بیٹی کلثوم زمانی اپنے شوہر مرزا ضیاء الدین اور نواب نور محل بیگم وغیرہ کے ہمراہ مکہ معظمہ پہنچ چکی تھی۔ وہاں بھی دربدری مقدر بننے والی تھی۔ مگر ایسے وقت اس کا ایک غلام بہت کام آیا۔ اس کا نام عبدالقادر تھا۔ کلثوم نے کئی برس پہلے اسے آزاد کیا تھا اور اس کی خواہش کے مطابق اسے مکہ معظمہ بھیج دیا تھا۔

عبدالقادر نے جب یہ خبر سنی کہ وہ اپنے شوہر اور خاندان والوں کے ساتھ وہاں پہنچی ہوئی ہے تو وہ فوراً ہی اس کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور اُن خانماں بربادوں کو اپنے گھر لے گیا۔ پردیس میں انہیں بہت بڑا سہارا مل گیا تھا۔ زندگی کی سختیاں بڑی حد تک ختم ہو گئی تھیں۔ مگر اپنے وطن کی یاد بے چین کئے رکھتی تھی۔

ان دنوں سلطانِ روم کا نائب مکہ معظمہ رہتا میں تھا۔ جب اسے کلثوم زمانی اور اس کے اہل وعیال کے بارے میں معلوم ہوا تو وہ بھی ملاقات کے لئے چلا آیا۔ پھر اس نے ان شاہی افراد کے اخراجات کے لئے ایک معقول رقم مقرر کر دی۔ وہ نو برسوں تک وہاں مقیم رہے۔ اس کے بعد بغداد شریف آگئے۔ وہاں ایک برس قیام کیا۔ پھر ایک برس نجف اشرف و کربلائے معلیٰ میں بسر ہوا۔ اس کے بعد وہ لوگ واپس مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ کلثوم زمانی اپنے بابا جانی کی یاد میں تڑپتی رہتی تھی۔ وطن کی مٹی جیسے اسے پکارنے لگی تھی۔

اس نے ہندوستان سے آنے والے حاجیوں سے وہاں کے حالات دریافت

کئے۔ ایک حاجی نے کہا۔ ''وہاں کا حال کیا پوچھتی ہیں؟ فرنگی سلطنت ہندوستان پر پوری طرح قابض ہو چکے ہیں۔''

اس نے تڑپ کر پوچھا۔ ''اور ہمارے بابا جانی...؟ وہ کہاں ہیں؟ کس حال میں ہیں؟''

وہ بولا۔ ''انہیں ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ عدالت میں ان پر مقدمہ چلتا رہا۔ پھر جھوٹے سچے الزامات لگا کر انہیں مجرم قرار دے دیا گیا اور جلاوطنی کی سزا سنائی گئی۔''

وہ دل تھام کر بولی۔ ''جلاوطنی...؟ یعنی وہ بھی ہماری طرح اپنے ہندوستان سے دور ہو گئے ہیں؟''

پھر اس نے حاجی سے پوچھا۔ ''انہیں کہاں بھیجا گیا ہے؟''

''عدالت کے فیصلے کے بعد انہیں اور زینت محل بیگم کو رنگون روانہ کیا گیا تھا۔ وہاں پردیس میں ان پر کیا گزری؟ یہ کسی کو علم نہیں ہے۔''

کلثوم زمانی ہندوستان جانے کے لئے مچل گئی تھی۔ لہٰذا رخت سفر باندھا گیا اور وہ خود ساختہ جلاوطنی کی زندگی گزار کر اپنے مختصر سے خاندان کے ساتھ دہلی پہنچ گئی۔

وہاں کی مٹی میں گوروں کی ملاوٹ ہو چکی تھی۔ بہت کچھ بدل گیا تھا۔ مسجدوں اور مندروں کے علاوہ کئی کلیسا بھی وجود میں آگئے تھے۔ شاہی افراد کی قتل وغارت گری کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ وہاں کلثوم پر یہ انکشاف ہوا کہ شہنشاہ ہندوستان جلاوطنی کی زندگی گزارتے گزارتے اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں تو اس نے اپنا کلیجہ تھام لیا۔

انگریزی سرکار کو جب علم ہوا کہ بادشاہ کی ایک بیٹی مکہ معظمہ سے ہندوستان آئی ہے تو انہوں نے ترس کھا کر اس کے لئے دس روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی۔ کلثوم زمانی یہ سن کر تھوڑی دیر تک ہنستی رہی۔ پھر بڑے صدمے سے بولی۔ ''دس روپیہ ماہوار.....؟ کیا یہ سلطنت ہندوستان کی توہین نہیں ہے؟''

پھر اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دیکھ رہے ہیں بابا جانی...! آپ کے اتنے بڑے ملک کی کیا قیمت لگائی گئی ہے؟ دس روپیہ ماہوار..... آئندہ ہمیں اسی خیرات میں گزارہ کرنا ہوگا۔''

ملک تو خدا کا ہوتا ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے' دیتا ہے۔ جس سے چاہتا ہے' چھین لیتا ہے۔ وہ ملک خداد تیموریہ خاندان کے ہاتھوں سے پھسل کر انگریزوں کی جھولی میں آ گیا تھا۔

☆☆☆

وہاں رہ کر کلثوم زمانی کو اپنے بابا جانی کے بارے میں بڑے تفصیلی حالات معلوم ہوئے۔ اس کی المناک رُوداد کچھ یوں تھی۔

بادشاہ قلعے سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے میں روپوش ہو گیا تھا۔ دوسری طرف انگریزوں کو یہ فکر لاحق ہو گئی تھی کہ بہادر شاہ ظفر باغیوں کے ساتھ فرار ہونے کے لئے قلعہ خالی کر چکا ہے۔ لہٰذا میجر ہڈسن نے میجر جنرل سے کہا۔ ''سر! وہ زیادہ عرصے تک مقبرے میں روپوش نہیں رہے گا۔ آپ مجھے وہاں جانے کی اجازت دیں۔ میں کسی نہ کسی طرح اسے فرار ہونے سے روک لوں گا یا اسے اس بات پر راضی کر لوں گا کہ وہ خود کو میرے حوالے کر دے۔''

اس سلسلے میں مرزا الٰہی بخش کو طلب کیا گیا۔ اس کے ذریعہ زینت محل اور اس کے والد احمد قلی خاں سے گفت و شنید کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ ایسے موقع پر زینت محل نے اپنا مطالبہ پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم وعدہ کرتے ہیں' بادشاہ سلامت باغیوں کے ساتھ فرار نہیں ہوں گے۔ اپنی گرفتاری پیش کر دیں گے۔ مگر ایک شرط پر.....''

میجر ہڈسن نے پوچھا۔ ''کیسی شرط...؟''

وہ بولی۔ ''شرط یہ ہے کہ ہم اپنے بیٹے جواں بخت کو ولی عہد بنانا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں تخت شاہی کی وراثت کی ضمانت دی جائے۔''

وہاں جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ ایسے میں زینت محل بیٹے کو ولی عہد بنانے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ دوسری طرف بادشاہ نے کہا۔ ''ہم بڑی کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزار رہے ہیں۔ ہمارا ایک ہی مطالبہ ہے کہ ہماری مقرر کردہ پنشن فوری طور پر بحال کی جائے اور گزشتہ تین ماہ کے بقیہ جات کی بھی ادائیگی کی جائے۔''

میجر ہڈسن نے کہا۔ ''آپ اپنے حالات کو سمجھ نہیں رہے ہیں۔ ایسے میں کھوئی ہوئی شان و شوکت کسی صورت بحال نہیں ہو سکتی۔ تخت شاہی کے اور پنشن کے خواب دیکھنے

کے بجائے اپنی جان کی فکر کریں۔ آپ کی اور آپ کے خاندان کی صرف آزادی ہی نہیں.... جان بھی خطرے میں ہے۔''

ہڈسن نے زینت محل اور اس کے بیٹے کو سلامتی کی ضمانت دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ بادشاہ کو قائل کریں۔ گرفتاری کے سوا بچاؤ کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ اگر آپ لوگ اپنی طبعی عمر جینا چاہتے ہیں تو بادشاہ کو راضی کر کے ہماری پناہ میں آ جائیں۔''

وہ ماں بیٹے اور احمد قلی خاں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ جان ہے تو جہان ہے۔ بادشاہ کی گرفتاری سے سب کو سلامتی ملنے والی تھی۔ اگلے روز مرزا الٰہی بخش یہ مژدہ لے کر میجر ہڈسن کے پاس پہنچا کہ بہادر شاہ ظفر جاں بخشی کی شرط پر گرفتاری پیش کرنے کے لئے راضی ہے۔ لہٰذا میجر ہڈسن نے دوسرے ہی دن مرزا الٰہی بخش کو مولوی رجب علی اور گھوڑ سواروں کے ایک مختصر دستے کے ساتھ وہاں روانہ کر دیا۔

بادشاہ کی گرفتاری کی خبر نے اس کے عقیدت مندوں کو مشتعل کر دیا تھا۔ وہ دشمنوں کو روکنے کے لئے مقبرے کے باہر جمع ہو گئے تھے۔ جب مولوی رجب علی اپنے گھڑ سواروں کے ساتھ وہاں پہنچا تو اس کے لشکر پر حملہ کیا گیا۔ چار گھڑ سوار زخمی ہو گئے۔ اس ہنگامے کی خبر فوراً ہی میجر ہڈسن تک پہنچائی گئی۔ وہ بادشاہ کی گرفتاری کے سلسلے میں ناکام نہیں ہونا چاہتا تھا۔ لہٰذا ایسی اطلاع ملتے ہی اس نے رسالدار مان سنگھ کو مسلح سپاہیوں کے ساتھ مقبرے کی طرف روانہ کر دیا اور یہ حکم دیا کہ بادشاہ کو اغوا کرنے کی کوشش کی جائے تو فوراً ہی مجھے خبر دی جائے اور جو شخص مقبرے سے باہر جانے کی کوشش کرے اسے گولی سے اڑا دیا جائے۔

دوسری طرف بادشاہ تک میجر ہڈسن کا یہ پیغام پہنچا دیا گیا تھا کہ وہ خاموشی سے باہر آ کر خود کو اس لشکر کے حوالے کرے گا۔ میجر ہڈسن اس کی سلامتی کا ضامن ہے۔ اگر وہ فرار ہونا چاہے گا تو مقبرے کے دروازے کی کمان ہڈسن کے ہاتھ میں ہے۔ وعدہ خلافی کی صورت میں وہ اسے اور اس کے لواحقین کو گولی مارنے کا حکم دے دے گا۔

دو تین گھنٹے کے طویل انتظار کے بعد رسالدار نے باہر آ کر اطلاع دی کہ بادشاہ آ رہے ہیں۔ ایسے وقت میجر ہڈسن بھی موقع پر موجود تھا لیکن عمارتوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی شاہی سواریاں مقبرے سے باہر آنے لگیں۔ ایسے وقت مرزا الٰہی بخش اور

مولوی رجب علی بذات خود بادشاہ کی پالکی کے ہمراہ چل رہے تھے۔ اس کے پیچھے زینت محل
کی پالکی تھی اور ان شاہی سواریوں کے پیچھے بادشاہ کے ملازمین اور قلعے سے بھاگے ہوئے
پناہ گزینوں کا جم غفیر تھا۔

مقبرے سے باہر آ کر وہ پالکیاں رک گئیں۔ بادشاہ نے میجر ہڈسن کے نام یہ
پیغام بھیجا کہ وہ خود میجر کی زبان سے اپنی جاں بخشی کے الفاظ سننے کا خواہش مند ہے۔
بادشاہ کا یہ پیغام سن کر وہ چند سپاہیوں کے ہمراہ اس کے روبرو آتے ہوئے بولا ”میں اپنی
شرط کا پابند رہوں گا۔ آپ کو جاں بخشی کی ضمانت پر گرفتار کیا جا رہا ہے۔“

بادشاہ کی گرفتاری کے بعد مولوی رجب علی اور مرزا الٰہی بخش نے میجر ہڈسن کو یہ
اطلاع دی کہ مرزا مغل، مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر جو انگریز عورتوں اور بچوں کے قتل کے
ذمہ دار ہیں، ابھی تک ہمایوں کے مقبرے میں چھپے ہوئے ہیں۔ لہٰذا جنرل ولسن کی اجازت
سے ہڈسن دوبارہ ہمایوں کے مقبرے میں پہنچ گیا۔ اس نے بغیر کسی شرط کے ان تینوں
شہزادوں سے مطالبہ کیا کہ وہ خود کو اس کے حوالے کر دیں۔ وہ شہزادے بھی جاں بخشی کا وعدہ
لینا چاہتے تھے مگر ان کی یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ انہیں گرفتار کر کے ایک بیل گاڑی میں
سوار کیا گیا۔ جب وہ سواری ہڈسن کی نگرانی میں دہلی کی طرف بڑھنے لگی تو ایسے وقت لوگوں کا
ایک ہجوم بھی ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

دہلی کے دروازے پر پہنچ کر ہڈسن نے ان تینوں شہزادوں کو گولیوں سے
بھون ڈالا اور ان کی لاشوں کو سر بازار لٹکا دیا۔ اس کے بعد بیس شہزادوں پر بوائڈ کی عدالت
میں مقدمہ چلا کر پھانسی کی سزا دی گئی اور ان کی لاشوں کو ایک چھکڑے میں لاد کر پورے شہر
میں گھمایا گیا تاکہ لوگوں کو عبرت حاصل ہو سکے۔

بہادر شاہ ظفر کو ناظر حسین مرزا کے مکان میں مقید کر دیا گیا تھا۔ اس کے پہرے
دار سنتریوں کو حکم تھا کہ بادشاہ فرار ہونے کی کوشش کرے تو فوراً ہی اسے گولی مار دی جائے۔
وہ اس مکان میں چار ماہ اور چھ دنوں تک بے بسی اور مجبوری کے عالم میں مقید رہا۔

☆☆☆

۲۷ جنوری کو کرنل ڈیوس کی عدالت میں بہادر شاہ ظفر کے خلاف ان چار الزامات

کی بنیاد پر مقدمہ کی کارروائی شروع ہوئی۔

(۱) برٹش گورنمنٹ ہند کے پنشن خوار ہونے کے باوجود انہوں نے ۱۰ مئی اور یکم
اکتوبر ۱۸۵۷ء کے درمیان ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم سپاہیوں محمد بخت خان صوبیدار
رجمنٹ توپ خانہ اور دیسی کمیشنڈ افسران کو حکومت کے خلاف بلوہ بغاوت کرنے کی ترغیب
دی اور بھڑکایا۔

(۲) مورخہ ۱۰ مئی سے یکم اکتوبر ۱۸۵۷ء کے درمیان انہوں نے اپنے فرز[ند]
مغل کو اور دیگر باشندگان شمال مغربی صوبہ جات کو جن کے نام معلوم نہیں ہیں اور [س]پاہیوں
کو جو سب کے سب گورنمنٹ برطانیہ کی رعایا تھے۔ انہیں حکومت کے خلاف جنگ کرنے
کے لئے اشتعال دلایا اور جنگ کرنے پر آمادہ کیا۔

(۳) باوجود برٹش ہند کی رعایا ہونے کے اپنی فرمانبرداری کا خیال نہ رکھا جو کہ
ان کا فرض تھا۔ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء یا اس کے کچھ بعد سلطنت کے خائن ہوئے۔ اپنے آپ کو
بادشاہ دہلی مشہور کیا اور شہر دہلی پر خلاف قانون قبضہ کر لیا۔ نیز مرزا مغل اور محمد بخت خان
صوبیدار توپ خانہ اور دیگر فتنہ پردازوں سے سازش کی۔ ۱۰ مئی تا یکم اکتوبر ۱۸۵۷ء کو باغی
سلطنت ہوئے اور گورنمنٹ سے لڑنے کے لئے دہلی میں فوج جمع کی۔

(۴) ۱۶ مئی ۱۸۵۷ء یا اس سے قبل یا بعد شہر دہلی میں ۴۹ انگریز جن میں عورتیں
اور بچے بکثرت شامل تھے، قتل کرائے یا ان کے قتل میں حصہ لیا۔

متذکرہ چارٹ شیٹ کا بادشاہ کی جانب سے جو جواب دیا گیا۔ وہ اس طرح تھا۔
”حقیقت یہ ہے کہ روز اول ہمیں کچھ خبر نہ تھی۔ قریب پہر دن چڑھے کہ دفعتاً
سوار باغی آئے اور انہوں نے آن کر زیر جھروکہ شور مچایا اور کہا کہ ہم میرٹھ سے انگریزوں کو
قتل کر کے آئے ہیں۔ اس واسطے کہ وہ ہمیں ایسے کارتوس دانتوں سے کاٹنے کو کہتے ہیں،
جن میں گائے اور سؤر کی چربی لگی ہوئی تھی۔ اس سے ہندو اور مسلمان کا دین بگڑتا تھا۔

بعد اس کے باغی فوج دیوان خاص میں گھس آئی۔ سوار اور پیادوں سے صحن
دیوان خاص، اندر دیوان خاص اور تسبیح خانہ بھر گیا۔ وہ ہمارے گرد کھڑے ہو گئے اور جابجا
پہرہ بندی کر دی۔ ہم نے پوچھا، تمہارا کیا مقصد ہے؟ تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ۔ انہوں

نے کہا کہ آپ چپکے بیٹھے رہیں۔ ورنہ ہم تو اپنی جانوں سے سیر ہیں۔ جو کچھ ہم سے ہو سکے گا‘ کر گزریں گے۔

اس وقت ہم بخوف جان اپنی خاموش رہے اور محل میں چلے گئے۔ بعد اس کے قریب شام وہ باغی کئی انگریز عورتوں اور مردوں کو میگزین میں سے پکڑ لائے اور چاہا کہ انہیں قتل کریں۔ ہم نے بہت فہمائش کی‘ تب ان کی جاں بخشی ہوئی۔ پھر فوج نے انہیں قید کر لیا۔ بعد اس کے دوبارہ ان لوگوں کو قتل کرنا چاہا۔ ہم نے بہ منت فہمائش کی اور ان کو بچانا چاہا لیکن باغیوں نے نہ مانا۔ ان غریبوں کو قتل کر دیا۔ ہم نے ان کے قتل کا حکم نہیں دیا تھا۔

مرزا مغل‘ مرزا خضر سلطان‘ مرزا ابو بکر اور بسنت خواجہ سرا نے اس فوج سے سازش کر لی۔ اگر انہوں نے ہمارا نام لیا ہے تو ہمیں اس کی خبر نہیں اور اگر ہمارے خاص بردار ہمارے حکم کے بغیر ان کے قتل میں شریک ہوئے ہوں‘ بہ سازش فوج باغی یا بادشاہ مرزا مغل تو اس کی بھی ہمیں کچھ خبر نہیں ہے اور نہ بعد اس کے کسی نے تا حال ہمیں اطلاع دی۔

بڑے صاحب اور قلعے دار بہادر کے قتل ہونے میں گواہوں نے جو بیان کیا۔ اشتراک ہمارے ملازموں کا تو اس کا بھی یہی جواب ہے کہ ہم نے انہیں حکم نہیں دیا تھا۔ اگر وہ لوگ بہ خوشی مرتکب ایسے امر کے ہوتے ہوں تو ہمیں اس کی خبر نہیں ہے اور نہ ہمیں کسی نے اس حال کو بیان کیا۔ حاشا وکلا ہم نے نہ بڑے صاحب کے قتل اور نہ کسی اور صاحب لوگوں کے قتل کا حکم دیا تھا۔

مکند لال وغیرہ گواہوں نے صرف جھوٹ ہمارا نام لیا ہے۔ مرزا مغل اور خضر سلطان نے اگر حکم دیا ہو تو تعجب نہیں ہے کہ انہوں نے باغی فوج سے سازش کر لی تھی۔ بعد اس کے وہ فوج مرزا مغل‘ خضر سلطان اور ابو بکر کو لائی تھی۔ انہوں نے کہا کہ ہم ان کو اپنا افسر بنانا چاہتے ہیں۔ اوّل ہم نے قبول نہ کیا۔ بعد جب اس فوج نے بہت اصرار کیا اور مرزا مغل ہم سے خفا ہو کر اپنی والدہ کے گھر جا بیٹھے‘ تب اس فوج کے خوف سے ہم خاموش رہے اور مرزا مغل بہ اصلاح ہم دُلرافسر فوج مقرر ہو گئے۔

حال ہماری مہری شقوں کا اور دستخطی کا یہ ہے کہ جس دن سے وہ فوج آئی اور حکام کو قتل کیا اور ہمیں قید کیا تو وہ جو چاہتے تھے‘ لکھوا کر لاتے تھے اور ہم سے زبردستی مہر کروا لیتے

تھے۔ ایسے مسودے باختلاف خط مثل میں موجود ہیں اور اکثر سادے خالی لفافوں پر مہر کروا لیتے تھے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ان کے اندر کس مضمون کے شقے کس کو بھیجا کرتے تھے؟

پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے بدون حکم اور بدون اطلاع جو کوئی چاہتا تھا‘ شقہ لکھواتا تھا اور ہمیں ان کے مضمون کی اطلاع بھی نہیں کرتا تھا۔ ہم بہ خوف جان یا ہمارا منشی کچھ ان سے بول نہ سکتے تھے۔ وہ ہمارے اہل کاروں کو خصوصاً حکیم احسن اللہ خان‘ محبوب علی خاں اور بیگم زینت محل کو کہتے تھے کہ یہ انگریزوں کو چٹھیاں بھیجتے ہیں اور ان سے ملے ہوئے ہیں۔ ہم انہیں مار ڈالیں گے۔

چنانچہ حکیم احسن اللہ کا ایک دن گھر لوٹ لیا اور اسے قید کر لیا۔ بلکہ چاہا تھا کہ قتل کر دیں۔ لیکن بعد فہمائش اور منت کے قتل سے در گزرے۔ بعد اس کے اور اہل کاروں کو بھی قید کر لیا۔ یہ بھی اکثر افسران فوج ہم سے کہتے تھے کہ بیگم زینت محل کو ہمارے حوالے کریں۔ ہم انہیں قید کریں گے کہ وہ انگریزوں سے ملی ہوئی ہیں۔ پس اگر ہمارا اختیار ہوتا تو ہم حکیم احسن اللہ خان کو کیوں قید ہونے دیتے؟ بیگم زینت محل کے والد کو کیوں قید ہونے دیتے اور حکیم کے گھر کو کیوں لٹنے دیتے؟

اس فوج نے ایک کورٹ مقرر کیا تھا۔ اس میں صلاح مشورے کر کے جو کچھ ان کے صلاح میں مقرر ہوتا تھا‘ کرتے تھے۔ ہم ان کے مشوروں میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ ہمارے حکم کے بغیر اکثر لوگوں کو اور بازاروں کو لوٹ لیا گیا۔ اکثر مہاجنوں سے اور اہل شہر ذی عزتوں سے زبردستی بدون اجازت ہماری جس قدر روپیا چاہا‘ لیا... اور اپنے خرچ میں لائے۔

جو کچھ کیا‘ اُس فوج نے کیا۔ ہم ان کے بس میں تھے۔ وہ جو کہتے تھے‘ بہ مجبوری ہم وہی کرتے تھے۔ وگرنہ وہ فوراً ہمیں قتل کر دیتے۔ یہ بات سب صاحبوں کو معلوم ہے۔ ہم اُن سے ایسے تنگ تھے کہ ہماری جان پر نوبت تھی اور ہمارے اہل کاروں کی جان بچنے کی توقع نہیں تھی۔

چنانچہ ہم نے فقیری اختیار کی۔ گیروے کپڑے پہنے اور چاہا کہ قطب صاحب کو چلے جائیں اور وہاں سے اجمیر شریف چلے جائیں۔ اس کے بعد مکہ شریف کو... لیکن اس

فوج نے جانے نہ دیا۔ انہوں نے میگزین سرکاری اور خزانہ لوٹا۔ ہم نے اس میں سے کچھ نہیں لیا اور نہ ہمارے پاس وہ لائے۔

پھر ایک دن بیگم زینت محل کے گھر پر چڑھ گئے اور چاہا کہ لوٹ لیں مگر دروازہ نہ ٹوٹ سکا۔ پس خیال کرنا چاہئے کہ اگر وہ ہمارے تابعدار ہوتے یا ہم ان سے ملے ہوئے ہوتے تو یہ باتیں کاہے کو ہوتیں؟ یہ سوائے جائے غور ہے کہ کوئی کسی غریب آدمی کی زوجہ کو بھی نہیں مانگتا' یہ نہیں کہتا کہ اسے ہمیں دے دو۔ ہم قید کریں گے۔

جب وہ فوج بھاگنے کی مستعد ہوئی۔ ہم موقع پا کر خفیہ زیر جھروکہ سے چلے گئے اور ہمایوں کے مقبرے میں جا بیٹھے۔ جب سرکار نے ہمیں با اقرار جاں بخشی بلا بھیجا تو ہم امان میں سرکار کی چلے آئے۔ فوج باغی نے چاہا کہ ہمیں اپنے ساتھ لے جائے لیکن ہم ان کے ساتھ نہ گئے۔

یہ سب جو ہم نے لکھوایا ہے۔ اپنی زبانی اس میں مطلق سرمو کذب و دریغ نہیں۔ واللہ باللہ راست جو حال تھا' ہم نے وہی لکھوایا ہے اور ہم نے پہلے ہی قسم کھا کر کہا تھا کہ جو حال ہے' اسے سچ سچ لکھوائیں گے۔ نہ اس میں کم ہوگا' نہ بیش... سو لکھوا دیا۔''

اس قدر وضاحت سے اپنی صفائی پیش کرنے کے باوجود ۹ مارچ ۱۸۵۸ء کو عدالت نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے بہادر شاہ ظفر کو ان تمام جرائم کا مرتکب قرار دیا جو اس پر عائد کئے گئے تھے۔ اسے جلاوطنی کی سزا سنائی گئی اور رنگون بھیجنے کے احکامات صادر کئے گئے۔

☆☆☆

مقدمے کے فیصلے کے سات ماہ بعد ۱۷ اکتوبر ۱۸۵۸ء کو شام چار بجے دہلی کو خیر باد کہتے ہوئے قیدیوں کا یہ قافلہ ٹامکتھ لانسری کی نگرانی میں دہلی سے الہ آباد روانہ ہوا اور ۱۳ نومبر ۱۸۵۸ء کو الہ آباد پہنچا۔ اس قافلے کی کل تعداد ۱۳۱ تھی۔

یہ قافلہ تین روز تک الہ آباد میں رہا۔ ۱۹ نومبر کو مرزا پور روانہ ہوا پھر وہاں سے ٹیمز نامی ایک اسٹیمر کے ذریعہ ہگلی پہنچا۔ ۲۰ نومبر کو کلکتہ' ۲۲ نومبر کو بکسر' ۲۳ نومبر کو دینا پور' ۲۵ نومبر کو منگیر' ۲۷ نومبر کو راج محل' ۲۸ نومبر کو رام پور بلیا' ۲۹ نومبر کو دامودر کلی' یکم دسمبر کو کھلنا اور ۴ دسمبر کو صبح نو بجے ڈائمنڈ ہار بر اور شام کو کیڈ گری پہنچا۔

۹ دسمبر ۱۸۵۸ء کو یہ جہاز رنگون کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ قیدیوں کو مین گارڈ کے

احاطے میں ٹھہرایا گیا۔ پھر ۲۹ اپریل ۱۸۵۹ء کو انہیں نئی قیام گاہ پر لایا گیا۔

یہ قیام گاہ دس فٹ اونچی دیواروں کے درمیان سولہ فٹ مربع کی شکل میں چار کمروں پر مشتمل تھی۔ جن میں ایک کمرہ بہادر شاہ ظفر کا تھا۔ دوسرے میں بیگم زینت محل تھی۔ تیسرے کمرے میں جواں بخت اور اس کی بیوی اور چوتھے میں شاہ عباس اور اس کی والدہ مبارک النساء بیگم کو رکھا گیا۔ نوکروں کو برآمدے میں ٹھہرایا گیا۔ غسل خانے الگ الگ بنائے گئے تھے۔ باورچی خانہ بھی موجود تھا۔

یکم اپریل سے یہ قیدی کیپٹن نیلسن ڈیوس کی نگرانی میں رہے۔ قیدیوں کو قلم دوات اور کاغذ رکھنے کی سخت ممانعت تھی۔ البتہ شہزادوں کی تعلیم کا مناسب انتظام تھا اور قیدیوں کو گھر سے نکلنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع دیئے جاتے تھے۔

اکتوبر ۱۸۶۲ء میں بہادر شاہ ظفر کی حالت زیادہ خراب ہوگئی۔ ۲۳ اکتوبر ۱۸۶۲ء تک وہ لگاتار بیمار رہا اور کمزور ہوتا چلا گیا۔ ۳ نومبر کو حلق پر فالج کا حملہ ہوا۔ ۶ نومبر کو اس کی آخری آرام گاہ کا بندوبست کیا گیا۔

وہ جلاوطن بادشاہ ۷ نومبر کی صبح بیماریوں سے لڑتے لڑتے تھک گیا۔ زندگی کے آخری بستر پر چاروں شانے چت ایسا گرا کہ پھر اٹھ نہ سکا۔ اس ابدی نیند سونے والے کو شام چار بجے سپرد خاک کیا گیا۔ جنازے کے ساتھ بادشاہ کے دونوں بیٹے اور خادم احمد بیگ تھے۔ دیگر افراد کو جنازے میں شرکت کی اجازت نہ دی گئی۔ مسلمانوں کے ہجوم کو احاطے سے ایک مخصوص فاصلے پر رکھا گیا تھا۔

تدفین کے لئے ایسا طریقہ کار اختیار کیا گیا کہ بادشاہ کی قبر کا نشان بھی نہ مل سکے۔ کافی عرصہ بعد بہادر شاہ ٹرسٹ نے مزار کی تعمیر کے لئے چندہ اکٹھا کیا اور موجودہ شکل میں رنگون میں موجود مزار تعمیر کرایا۔

تاریخ وفات کے بارے میں جو کتبہ نصب ہے اس پر درج ذیل عبارت تحریر ہے۔

حالت قید بے کسی تھی یہ گھڑی بہت کٹھن
وقت نے شاہ ہند سے عرض کیا وطن سے دور
خلد ہے آپ کا وطن اے ظفر جلا وطن

اس مقام پر اس آخری تاجدار کا ماتم نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ خاتمہ دراصل اس کا نہیں' مغلیہ سلطنت کا ہوا تھا۔ اورنگزیب کے بعد تمام نااہل حکمران خود تو ڈوبتے رہے' اپنے مغل آباؤ اجداد کے اقتدار' رعب ودبدبے اور شان وشوکت کو بھی لے ڈوبے۔

سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہندوستان سے مسلمانوں کی حکمرانی اور برتری ختم ہوگئی۔ یہ تو پرانی کہاوت ہے کہ جیسا بوؤ گے' ویسا کاٹو گے۔ لیکن ہند کے مسلمان بونے والوں کی فصل آج تک کاٹ رہے ہیں۔ پاکستان کے نام پر ایک چھوٹا سا خطہ لے کر وہی چال بے ڈھنگی چل رہے ہیں۔ جو ۱۸۵۷ء تک رہی تھی۔ آخری مغل حکمران برطانوی انگریزوں کے غلام بن گئے تھے اور پاکستانی امریکہ کی غلامی قبول کر چکے ہیں۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔

جب رسّی کا ایک سرا جلتا ہے تو وہ آگ جلتی ہوئی دوسرے سرے تک ضرور پہنچتی ہے۔ بہادر شاہ ظفر نے جو سزا بھگتی' وہ سزا شہزادے اور شہزادیاں اگلے پچاس برسوں تک بھگتتے رہے۔ ان میں سے کئی ایسے تھے جو پچاس برسوں تک بوڑھے ہو کر کسمپرسی کی زندگی گزارتے ہوئے اور لاعلاج بیماریوں کے باعث ایڑیاں رگڑتے رگڑتے مر گئے۔

کئی شہزادے خوف کے مارے کہیں روپوش ہوگئے یا شہر سے بھاگ گئے۔ پھر بھی دہلی کے اردگردان کی کمی نہ تھی۔ دوسری طرف انہیں پکڑنے کے لئے مخبروں کی بھی کمی نہ تھی۔ خود ایک شہزادہ مرزا کالے خاں انگریزوں کا مخبر تھا۔ وہ شہزادوں کو پکڑواتا اور انہیں یہ سکھا دیتا کہ حاکموں کے سامنے کہنا' تم سب بادشاہ کے قریبی رشتہ دار ہو۔ پھر وہ تمہیں بادشاہ کے پاس بھیج دیں گے۔ وہاں تمہاری پلاؤ کی رکابی کہیں نہیں گئی۔

وہ کم بختی کے مارے یہی بیان دے کر خود کو شہزادہ ثابت کرتے تھے اور سزائے موت پاتے تھے۔ دِلی کے آس پاس ۲۹ شہزادے پکڑے گئے۔ ان میں بوڑھے' اپاہج' بیمار سب کے سب پھانسی پر لٹکائے گئے۔

وہ شہزادے بڑی بے رحمی کے ساتھ پھانسی پاتے تھے۔ یا جیل خانے میں جنم قیدی بنا کر بھیجے جاتے تھے۔ وہاں چکی پیستے پیستے اور مار کھاتے کھاتے بہت جلد مر جاتے تھے۔ اکثر شہزادے جیل خانے میں جا کر چند روز ہی جیتے تھے۔

مرزا غالب نے بھی ان عبرت انگیز واقعات کے متعلق لکھا ہے۔

"شہزادگان خاندان تیموری میں سے کچھ لڑائی میں مارے گئے۔ کچھ گرفتار ہو کر قید خانوں میں پڑے ہوئے اپنے دن پورے کر رہے ہیں۔ معدودے چند ایسے ہیں جو جان بچا کر بھاگ گئے ہیں۔ ضعیف العمر بادشاہ کی گرفتاری کا حکم صادر ہے کہ باز پرس کی جائے۔ جھجر بلب گڑھ اور فرخ نگر کے والیان کو مختلف اوقات میں پھانسی دی گئی ہے۔"

ایک شہزادی احمدی بیگم کا شوہر مرزا منجھو جو غدر میں کام آیا۔ بڑے دبدبے کا آدمی تھا۔ اس کی سرکار سے بنی ہوئی تھی۔ بیسیوں آدمی اس کے دسترخوان پر بیٹھتے تھے۔ دروازے پر پالکی موجود رہتی تھی۔ جب مرزا منجھو مارا گیا اور شہر کی حالت بگڑی تو احمدی بیگم نے اپنا اور بہو بیٹیوں کا تمام زیور بازار والی حویلی میں گاڑنے کا ارادہ کیا۔ دو پتیلیاں زیورات سے بھری ہوئی تھیں۔ ہزاروں کا مال تھا۔

شہر کی کیفیت لحہ بہ لحہ بگڑتی چلی جارہی تھی۔ عین شب برات کے روز وہ سب شہزادیاں حویلی سے نکل کھڑی ہوئیں۔ پھر تقدیر ایسی ٹھوکریں مارتی رہی کہ ہاتھوں ہاتھ کھلونا بنتی رہیں۔ پھر کبھی اپنے مدفون خزانے تک پہنچنا انہیں نصیب نہ ہوا۔ کتنی ہی شہزادیاں ایسی تھیں جو طوائف اور کسبی بن گئی تھیں۔

☆☆☆

نازونعم میں پلنے بڑھنے والے شہزادوں کو کوئی کام نہیں آتا تھا۔ وہ دلال بن گئے تھے یا بھیک مانگتے پھرتے تھے۔ ایک شہزادہ بازار حسن میں للچائی ہوئی نظروں سے رنڈیوں کو دیکھتا تھا' یاد کرتا تھا کہ اس کے محل ایسی کتنی ہی نازو انداز والیاں آیا کرتی تھیں اور اس کے پہلو گرماتی تھیں۔

ایک نائکہ نے اس سے پوچھا۔ "تجھے روٹی کی بھوک ہے یا عورت کی....؟"

وہ بولا۔ "دونوں کی...."

نائکہ نے کہا۔ "تو پھر ٹھیک ہے۔ تُو ان کسبیوں کے لئے گاہک پھانس کر لایا کر۔ دو پھانس کر لائے گا تو رات کو روٹی دوں گی چار لائے گا تو کسی ایک کسبی کے ساتھ سونے دوں گی۔"

وہ بڑی مشکلوں سے کسی طرح دوگاہک پھانس کرلاتا تھا تو رات کی روٹی نصیب ہوتی تھی۔مگر دوسرے دن کی بھوک نڈھال کرتی رہتی تھی۔وہ سوچتا تھا کہ رات کی روٹیوں میں ایک روٹی دوسرے دن کے لئے بچایا کرے گا۔لیکن بھوکے پیٹ میں تمام روٹیاں اتر جاتی تھیں۔دوسرے روز پھر وہی فاقے.....

ایک دن قسمت مہربان ہوگئی۔وہ چار گاہک پھانس کرلایا۔نائکہ نے اسے روٹیاں دیتے ہوئے کہا۔"آج تُو ایک کسبی کا مستحق ہوگیا ہے۔بول...! کس کے ساتھ رات کالی کرے گا؟"

وہ بہت خوش تھا۔مستی میں جھوم رہا تھا۔مگر ناچتے ہوئے مور کو جب اپنے بھدے پاؤں دکھائی دیئے تو وہ ناچنا بھول گیا۔اس نے کسبیوں کو بڑی حسرت سے دیکھا۔پھر نائکہ سے کہا۔"مجھ سے تمام دن کی بھوک برداشت نہیں ہوتی۔تم...تم عورت کے بدلے مجھے دوسرے دن کی روٹیاں دے دو۔"

ہائے رے پیٹ...! ہائے ری بھوک.....! شہزادوں کی ساری مستیاں اور ساری چربیاں پگھل چکی تھیں۔

☆☆☆

ایک قبول صورت عورت پھٹا ہوا کمبل اوڑھے رات کے وقت درگاہ حضرت چراغ دہلی کے ایک گوشے میں پڑی ہائے ہائے کر رہی تھی۔سردی میں دھواں دھار بارش ہو رہی تھی۔تیز ہوا کے جھونکوں سے بوچھاڑ اس جگہ کو تر کر رہی تھی' جہاں اس عورت کا بستر تھا۔

وہ آخری سلاطین میں سے کسی کی بیٹی تھی۔اس شہزادی نے اپنا نام اور شجرہ کسی کو نہیں بتایا تھا۔وہ سخت بیمار تھی۔پسلی کے درد' بخار اور بے کسی کے عالم میں اکیلی پڑی تڑپ رہی تھی۔بخار کی تیزی میں آوازیں دے رہی تھی۔"گلبدن...! اری او گلبدن...! مردار! کہاں مرگئی؟ جلدی آ..... مجھے دوشالہ اوڑھا دے۔دیکھ... بوچھاڑ اندر آرہی ہے۔پردہ چھوڑ دے۔روشنک.....! تُو ہی آجا..... یہ گلبدن تو کہیں غارت ہوگئی ہے۔میرے پاس کوئلوں کی انگیٹھی رکھ دے۔پسلی پر تیل مالش کر۔ارے درد سے میرا سانس رُکا جاتا ہے....."

جب اس کی آہیں اور کراہیں سن کر کوئی نہ آیا تو اس نے چہرے سے کمبل ہٹایا۔

چاروں طرف دیکھا۔وہ اندھیرے دالان میں خاک کے بچھونے پر تنہا پڑی ہوئی تھی۔چاروں طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔دھواں دھار بارش میں بجلی چمکتی تھی تو اس لمحاتی روشنی میں اسے اپنے والد کی قبر دکھائی دیتی تھی۔

اپنی بے کسی دیکھ کر شہزادی نے بڑے کرب سے کہا۔"بابا جانی...! میں تمہاری گل بانو ہوں۔دیکھو...! اکیلی ہوں۔اٹھو... مجھے بخار چڑھ رہا ہے۔آہ...! میری پسلی میں شدت کا درد ہو رہا ہے۔مجھے سردی لگ رہی ہے۔میرے پاس اس بوسیدہ کمبل کے سوا اوڑھنے کو کچھ نہیں ہے۔میری اماں مجھ سے بچھڑ گئیں۔میں محلوں سے نکل کر دربدر ہوگئی۔

بابا...! مجھے اپنی قبر میں بلالو.... یہاں بہت ڈر لگتا ہے۔کفن سے منہ نکالو اور مجھے دیکھو... میں نے پرسوں سے کچھ نہیں کھایا ہے۔میرے بدن میں اس گیلی زمین کے کنکر چبھتے ہیں۔میں اینٹ پر سر رکھ کر سوتی ہوں۔میرا چھپر کھٹ کیا ہوا؟ میرا دوشالہ کہاں گیا؟ میری سیج کیا ہوئی؟ بابا جانی...! اٹھو... ہائے... درد کے مارے میری سانس رکی جاتی ہے۔"

یہ کہتے کہتے اس پر غفلت طاری ہوگئی۔اس نے دیکھا کہ وہ مرگئی ہے اور اس کے والد مرزا دارا بخت اسے قبر میں اتار رہے ہیں۔رو رو کر کہہ رہے ہیں۔"یہ اس بے چاری کا خاکی چھپر کھٹ ہے۔"

جب شہزادی کی آنکھ کھلی تو وہ ایڑیاں رگڑنے لگی۔سکرات کے عالم میں تھی۔رُک رُک کر کہہ رہی تھی۔"لو صاحب! میں مرتی ہوں.... کون میرے حلق میں شربت ٹپکائے گا.....؟ کون مجھے یٰسین سنائے گا....؟ کس کے زانو پر میرا سر رکھا جائے گا....؟ الٰہی تیرے سوا میرا کوئی نہیں ہے...."

سینکڑوں باندیاں اور کنیزیں کہاں گئیں؟ جب اس شہزادی کا دم نکلا تو کوئی ہمدم و دم ساز نہیں تھا۔گیلی زمین پر اس کے آس پاس کیڑے مکوڑے کلبلا رہے تھے۔

☆☆☆

غدر سے ایک برس پہلے ایک جنگل میں چند شہزادے شکار کھیلتے پھر رہے تھے اور بے پروائی سے چھوٹی چھوٹی چڑیوں اور فاختاؤں کو غلیل سے مار رہے تھے۔ایک گدڑی پوش فقیر نے وہاں سے گزرتے ہوئے انہیں دیکھا۔اس نے بڑے ادب سے شہزادوں کو

سلام کرتے ہوئے عرض کیا۔ ''میاں صاحبزادو.....! ان بے زبان جانوروں کو کیوں ستارہے ہیں؟ انہوں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟ یہ جاندار ہیں۔ آپ کی طرح دکھ اور تکلیف کی خبر رکھتے ہیں۔ انہیں نہ ماریں۔''

شہزادہ نصیرالملک بگڑ کر بولا۔ ''جارے جا... دو ٹکے کا آدمی ہمیں نصیحت کرنے نکلا ہے؟ تُو کون ہوتا ہے ہمیں سمجھانے والا؟ سیر وشکار سب ہی کرتے ہیں۔ ہم نے کیا تو کون سا گناہ ہوگیا؟''

فقیر نے کہا۔ ''صاحب عالم! ناراض نہ ہوں۔ شکار ایسے جانوروں کا کرنا چاہئے کہ ایک جان جائے تو دس پانچ آدمیوں کا پیٹ بھرے۔ ان ننھی ننھی چڑیوں کو مارنے سے کیا ملے گا؟ بیس ماریں گے' تب ایک آدمی کا شکم سیر نہ ہوگا۔''

وہ شہزادہ فقیر کے دوبارہ بولنے پر آگ بگولہ ہوگیا۔ اس نے ایک غلہ غلیل میں رکھ کر فقیر کے گھٹنے میں اس زور سے مارا کہ وہ بے چارہ اوندھے منہ گر پڑا۔ تکلیف سے چلانے لگا۔ ''ہائے... میری ٹانگ توڑ ڈالی۔''

اس کے گرتے ہی وہ تمام شہزادے گھوڑوں پر سوار ہو کر قلعے کی طرف چلے گئے اور فقیر گھسٹتا ہوا جنگل کے سامنے ایک قبرستان کی طرف جانے لگا۔ وہ گھسٹتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا۔ ''وہ تخت کیونکر آباد رہے گا' جس کے وارث ایسے سفاک ظالم ہیں۔ لڑکے! تو نے میری ٹانگ توڑ دی۔ خدا تیری بھی ٹانگیں توڑ دے اور تجھے بھی اسی طرح زمین پر گھسٹنا نصیب ہو۔''

مظلوم دل سے نکلی ہوئی بددعائیں دیر سے سہی مگر اثر ضرور دکھاتی ہیں۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد توپیں گرجنے لگیں۔ گولے برسنے لگے۔ زمین پر چاروں طرف لاشوں کے ڈھیر نظر آنے لگے۔ شہر دہلی ویران اور سنسان ہوتا جا رہا تھا۔ لال قلعے سے پھر وہی شہزادے گھوڑوں پر سوار بدحواسی کے عالم میں بھاگتے ہوئے دکھائی دیئے۔ وہ پہاڑ گنج کی طرف جا رہے تھے اور بیس پچیس گورے سپاہی ان کا تعاقب کر رہے تھے۔

یک لخت انہوں نے شہزادوں پر بندوقوں کی باڑ ماری۔ گولیوں نے گھوڑوں اور سواروں کو چھلنی کر دیا اور وہ سب شہزادے زمین پر گر کر تڑپنے لگے۔ گورے جب قریب

آئے تو دیکھا' دو شہزادے جاں بحق ہو چکے ہیں۔ لیکن مرزا نصیرالملک سانس لے رہا ہے۔ انہوں نے اسے زندہ دیکھ کر گھوڑے کی باگ ڈور سے شہزادے کے ہاتھ باندھ دیئے اور حراست میں لے کر اسے کیمپ پہنچا دیا۔

کیمپ میں جب بڑے صاحب کو معلوم ہوا کہ وہ زخمی شہزادہ بہادر شاہ ظفر کا پوتا نصیرالملک ہے تو وہ بہت خوش ہوا اور حکم دیا کہ اسے حفاظت سے رکھا جائے۔

باغیوں کی فوجیں شکست کھا کر بھاگنے لگی تھیں اور انگریزی لشکر یلغار کرتا ہوا شہر میں گھس رہا تھا۔ ایسے میں شریف شہزادیوں کے برہنہ سروں اور کھلے چہروں سے جنگل آباد ہونے لگے۔ باپ اپنے بچوں کے سامنے ذبح ہو رہے تھے اور مائیں اپنے جوان بیٹوں کو خاک و خون میں لوٹتا دیکھ کر بے ہوش ہوئی جا رہی تھیں۔

اسی دار و گیر میں پہاڑی کیمپ پر مرزا نصیرالملک رسی سے بندھا بیٹھا تھا۔ ایسے ہی وقت ایک پٹھان سپاہی دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا اور اس کی رسی کھولتے ہوئے بولا۔ ''میں نے آپ کی رہائی کے لئے صاحب سے اجازت حاصل کر لی ہے۔ آپ فوراً یہاں سے بھاگ جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی دوسری مصیبت میں پھنس جائیں۔''

شہزادہ بھلا پیدل چلنا کیا جانے؟ پریشان تھا' کیا کرے؟ مرتا کیا نہ کرتا...؟ پٹھان کا شکریہ ادا کر کے جنگل کی طرف چل دیا۔ نہ راستہ معلوم تھا' نہ کوئی منزل تھی۔ ایک میل چلا ہوگا کہ پیروں میں چھالے پڑ گئے۔ زبان خشک ہوگئی۔ حلق میں کانٹے پڑنے لگے۔ وہ نڈھال سا ہو کر ایک درخت کے سائے میں گر پڑا۔

بھیگی ہوئی آنکھوں سے آسمان کو تکتے ہوئے بولا۔ ''الٰہی...! یہ کیا غضب ہم پر ٹوٹا ہے؟ ہم کہاں جائیں؟ ہمارا ٹھکانہ کہاں ہے؟''

ایسے وقت درخت پر نظر گئی تو دیکھا' وہاں فاختہ کا گھونسلہ بنا ہوا ہے۔ وہ بڑے آرام سے اپنے انڈوں پر بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کی آزادی اور آسائش پر شہزادے کو بڑا رشک آیا۔ اس نے کہا۔ ''بی فاختہ...! ہم سے تو تم لاکھ درجے بہتر ہو۔ آرام سے اپنے گھونسلے میں بے فکر بیٹھی ہو۔ ہمارے لئے تو آج زمین آسمان میں کہیں جگہ نہیں ہے۔''

چاندنی چوک بازار میں پھانسیاں گڑی ہوئی تھیں۔ انگریز افسر جسے سزائے موت

کا حکم سناتے تھے۔ اسے فوراً ہی پھانسی مل جاتی تھی۔ ہر روز سینکڑوں افراد دار پر لٹکائے جاتے تھے۔ گولیوں سے اڑائے جاتے تھے اور تلواروں سے ذبح کیے جاتے تھے۔ ہر طرف اس خونریزی سے تہلکہ مچا ہوا تھا۔

ایک برس بعد دہلی کے بازار چتلی قبر، کمرہ بنگش وغیرہ میں ایک چنگیزی نسل کا پیر مرد دکھائی دیا۔ وہ کولہوں کے بل گھسٹتا پھرتا تھا۔ اس کے پاؤں فالج کے باعث بے کار ہو گئے تھے۔ اس لئے وہ ہاتھوں کو ٹیک کر کولہوں کو گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھتا رہتا تھا۔ اس کے گلے میں ایک جھولی لٹکی ہوئی تھی۔

وہ راہگیروں کو حسرت سے دیکھتا تھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی محتاجی ظاہر کرتے ہوئے بھیک مانگتا تھا۔ جن لوگوں کو اس کا حال معلوم تھا۔ وہ ترس کھا کر اسے دیکھتے تھے اور اس کی جھولی میں بڑے فخر سے یوں سکے ڈالتے تھے، جیسے کسی بادشاہ کو خیرات دے رہے ہوں۔

جو نہیں جانتے تھے، انہیں بتایا جاتا تھا کہ وہ بادشاہ کا پوتا مرزا نصیر الملک ہے۔ سرکاری پنشن قرضے میں برباد کردی اور اب خاموش گداگری پر گزارہ کرتا ہے۔ اُس کے اس انجام سے عبرت ہوتی تھی۔

بازار کی ایک گلی میں چند بچے غلیل سے کھیل رہے تھے۔ شہزادہ گھسٹتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ایسے ہی وقت ایک بچے نے ایک غلّہ غلیل میں رکھ کر اس شہزادے کے گھٹنے پر اس زور سے مارا کہ وہ تکلیف سے بلبلا اٹھا۔ ہاتھ اٹھا کر اسے بددعائیں دینے لگا۔ پھر بولتے بولتے اچانک ہی چپ ہوگیا۔

اس بچے نے جیسے ماضی کو آواز دے دی تھی۔ نصیر الملک کو شہزادگی کا وہ وقت یاد آگیا تھا، جب اس نے ایک گدڑی پوش فقیر کو غلیل کا نشانہ بنا کر زخمی کردیا تھا۔ مکافات عمل اسی کو کہتے ہیں۔ اس فقیر کی بددعائیں پوری ہوگئی تھیں۔ وہ شہزادگی کی طمطراق دکھانے والا اب گلیوں میں گھسٹتا پھرتا تھا۔

دیکھا جائے تو وہ ایک شہزادہ ہی نہیں، بلکہ تمام ہندوستانی مسلمانوں کی عزت اور غیرت بازاروں میں گھسٹتی پھرتی تھی۔

☆☆☆

جو کبھی خواب میں بھی سوچا نہ تھا، وہ ہو رہا تھا۔ اونچے محلوں میں پلنے بڑھنے والی شہزادیوں کی قیمت چند روٹیاں یا سیر دو سیر آٹا رہ گیا تھا۔ کیسا نازک وقت آپڑا تھا؟ اُن نازک اندام شہزادیوں کو بھوک اور مفلسی نے نڈھال کر ڈالا تھا۔

بہادر شاہ ظفر کی ایک بیٹی ربیعہ بیگم کھانے پینے کی بہت شوقین تھی۔ جتنی شوقین تھی، اتنی ہی مین میخ بھی نکالتی تھی۔ تمام باورچی ہاتھ باندھے سہمے ہوئے اس کے سامنے کھڑے رہتے تھے۔ پکوان کی لذت میں ایک ذرا سی کمی بیشی ہوتی تو وہ شدید غصہ میں اس پلیٹ کو اٹھا کر باورچی کے منہ پر دے مارتی تھی۔ اُس کے لئے خاص طور پر نت نئے اور لذیذ پکوان تیار کرائے جاتے تھے۔

غدر کے بعد عمدہ پکوان تو دور کی بات ہے۔ سوکھی روٹی بھی نصیب نہیں ہو رہی تھی۔ متواتر فاقے یہ رنگ دکھا رہے تھے کہ کچھ شہزادیاں بدترین حالات سے گزرتے ہوئے بازارِ حسن کی زینت بن گئی تھیں۔ کچھ بھیک مانگ کر گزارہ کرنا چاہتی تھیں۔ مگر جوان اور خوبصورت فقیرنیوں کی جھولی میں صرف پیسے نہیں گرتے۔ جھک کر سکے ڈالنے والے خود بھی گر جایا کرتے ہیں۔

اچھی صورت بھی کیا بری شے ہے
جس نے ڈالی، بری نظر ہی ڈالی

شاہی خاندان کے سب ہی افراد دربدر ہوگئے تھے۔ جان بچانے کے لئے انگریزی سپاہیوں سے چھپتے پھر رہے تھے۔ ربیعہ بیگم کے ایک خاص باورچی حسینی نے کہا۔ ”آپ میرے ساتھ چلیں۔ ایسے برے وقت میں میرے گھر سے زیادہ محفوظ کوئی دوسرا ٹھکانہ نہیں ہوگا۔“

اچھے دنوں میں وہ باورچی اس کے لئے طرح طرح کے لذیذ پکوان تیار کرتا رہا تھا۔ ربیعہ نے ایک ذرا جھجکتے ہوئے کہا۔ ”مگر.... تم تو وہاں تنہا رہتے ہو۔“

باورچی نے کہا۔ ”اس وقت صرف اپنی سلامتی کے بارے میں سوچیں۔ وہ گورے شاہی افراد کو پکڑ پکڑ کر موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں۔ آپ میرے گھر میں رہیں گی تو کسی گورے کو شبہ نہیں ہوگا۔ وہاں فاقوں کی نوبت بھی نہیں آئے گی۔ میں محل سے مرغن

پکوان لایا کروں گا۔"

کھانے کا ذکر سن کر شہزادی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ فاقہ زدہ چہرے پر ذرا رونق آگئی۔ بدترین حالات کے تھپیڑے آخر اسے باورچی کے گھر میں لے آئے۔ وہ محل سے بچا ہوا مرغن کھانا لا کر اسے کھلانے لگا۔ اس کی بھوک مٹنے لگی۔ مگر باورچی کی بھوک بڑھنے لگی۔ وہ کب تک فرشتہ بن کر رہتا؟ وہ حسین شہزادی پکے ہوئے پھل کی طرح اسے للچانے لگی تھی۔ وہ پھل ہاتھ بڑھاتے ہی اس کی جھولی میں آسکتا تھا۔

ایک رات وہ گھر آیا تو شہزادی اس کے خالی ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "کھانا نہیں لائے؟"

وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ "کھانا تمہاری ضرورت ہے اور تم میری ضرورت بن گئی ہو۔"

وہ چونک کر پیچھے سرکتے ہوئے بولی۔ "یہ... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

وہ اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "سچ کہہ رہا ہوں۔ میں تمہارے ساتھ فرشتہ بن کر نہیں رہ سکتا۔"

وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر غصے سے بولی۔ "ہم سے دور رہو بدذات...! کیا اپنی اوقات بھول رہے ہو؟"

وہ بپھر کر بولا۔ "شاہانہ تیور نہ دکھاؤ۔ وہ دن ہوا ہوئے' جب تم دسترخوان سے رکابیاں اٹھا کر ہمارے منہ پر مارا کرتی تھیں۔ سوچو اور سمجھو کہ مقدر نے کیسا پلٹا کھایا ہے؟ اگر اس پناہ گاہ میں رہ کر مرغن کھانوں سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہو تو مجھ سے راضی ہو جاؤ۔ ورنہ باہر جانے کا دروازہ کھلا ہے۔"

شہزادی اس کے تیور دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ سہم کر سوچنے لگی۔ "باہر پھر وہی فاقے ہوں گے۔ فاقوں سے بچیں گے تو گوروں کے ہتھے چڑھ جائیں گے۔ یا اللہ! یہ کیسا وقت دکھایا ہے؟ ہم تو مال غنیمت بن کر رہ گئے ہیں۔"

پھر اس نے بڑی عاجزی سے کہا۔ "خدا کے لئے ہم پر رحم کرو۔ اپنے ارادوں سے باز آجاؤ۔"

وہ منہ پھیر کر بولا۔ "اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ سودا مہنگا نہیں ہے۔"

اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ باز آنے والا نہیں ہے۔ شہزادی نے گرفتاری کے خوف سے اور بھوک سے شکستہ ہو کر کہا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ حالات نے ہمیں گرادیا ہے۔ مگر ہم اتنے بھی گرے ہوئے نہیں ہیں۔ اگر تم ہمیں حاصل ہی کرنا چاہتے ہو تو جائز راستہ اختیار کرو۔ ہم سے نکاح پڑھواؤ۔"

وہ باورچی کھانے پینے کی شوقین شہزادی کو شاہی دسترخوان سے گھسیٹ کر اپنی چھٹی پرانی بوسیدہ سیج پر لے آیا۔ بے شک.... حالات بلندی سے نیچے گراتے ہیں۔ مگر ایسے بھی نہیں گراتے.....

ان ہی کے بزرگ ایک دن حکمران تھے
ان ہی کے پرستار پیرو جواں تھے
یہی حاوی عاجز و ناتواں تھے
یہی مرجع معین و اسفہاں تھے
یہی کرتے تھے ملک کی گلہ بانی
ان ہی کے گھروں میں تھی سحر گرانی
یہ اے قوم اسلام! عبرت کی جا ہے
کہ شاہوں کی اولاد در در گدا ہے
جسے سنئے افلاس میں مبتلا ہے
جسے دیکھئے وہ مفلس و بے نوا ہے
نہیں کوئی ان میں کمانے کے قابل
اگر ہیں تو ہیں مانگ کھانے کے قابل

شہنشاہ ظہیر الدین بابر سے لے کر اورنگزیب عالمگیر تک جتنی شان و شوکت اور برتری قائم رہی۔ اتنی ہی کمتری اور ذلت مسلمانوں کا مقدر بن گئی۔ اودھ کے امراء صوبیدار اور نوابوں نے بھی اپنی عاقبت نااندیشی کے باعث زوال پذیر ہوتے ہوتے انگریزوں کو خود پر مسلط کرلیا۔

مسلمان روشنی کا مینار تھے۔ پھر تاریکی میں کیسے چلے گئے؟ پوری مسلم قوم کو زوال کی طرف لانے والے صرف مغل خاندان کے مسلمان حکمراں ہی نہیں تھے۔ بلکہ اودھ کے نوابین بھی تھے۔ لہٰذا ان کا ذکر بھی لازمی ہے۔ آئندہ ان ہی نوابوں کے سلسلے میں تاریخ اودھ کے دلچسپ واقعات پیش کئے جا رہے ہیں۔

☆☆☆

لکھنؤ اور اس کے اطراف کے علاقوں کو اودھ کہا جاتا ہے۔ ہندو اس مقام کو اجودھیا کہتے ہیں۔ یہ نام ان کے خالق برہما کا ہے۔ یوں اجودھیا کے معنی یہ ہیں۔ ''نہ مغلوب ہونے والا خالق۔'' اور اودھ کے معنی ہیں۔ وعدہ.... رام چندر جی نے چودہ سال کی جلاوطنی اختیار کی تھی اور چودہ برس کے بعد واپس آنے وعدہ کیا تھا۔ اس وجہ سے اس مقام کو اودھ کہا جاتا ہے۔

مغلیہ دور میں اودھ کے حکمراں نواب وزیر کہلاتے تھے۔ یہ سیاسی طور پر آزاد اور خودمختار ہوتے تھے۔ لیکن قانونی طور پر مغل بادشاہوں کے اقتدار اور برتری کو تسلیم کرتے تھے۔ ان کی خدمت میں نذرانے اور تحائف بھیجتے رہتے تھے۔ انگریز جب مغل بادشاہوں پر حاوی ہونے لگے۔ تو وہ نواب وزیر کہلانے والے افراد بھی برطانوی قوت کے زیر اثر آ گئے۔

برہان الملک اودھ کے شاہی خاندان کا بانی تھا۔ دہلی کے بادشاہ محمد شاہ نے اسے وہاں کا صوبیدار بنایا تھا۔ ان دنوں نادر شاہ نے قزلباش سردار کو قاصد بنا کر برہان الملک کے پاس روانہ کیا۔

نادر شاہ نے ایک خط برہان الملک کے نام اور دوسرا بادشاہ محمد شاہ کے نام روانہ کیا تھا۔ جب وہ سفیر ہندوستان کی سرحد میں داخل ہوا تو ڈاکوؤں نے اسے گھیر لیا۔ اسے اتنا مارا کہ وہ بیہوش ہو گیا۔ ڈاکو اسے مردہ سمجھ کر اس کا مال واسباب لے کر چلے گئے۔ اس کے لباس کے اندر وہ دو خطوط رہ گئے تھے۔

وہ بیچارہ زخموں سے چور تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد گھسٹتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد ایک بیل گاڑی والے نے ترس کھا کر اسے اپنے ساتھ بٹھا

لیا اور دہلی دربار تک پہنچا دیا۔ اس نے بادشاہ کے پاس پہنچ کر نادر شاہ کا خط اس کے حوالے کیا۔ بادشاہ نے اپنے خاص حکیموں کے ذریعے اس کے زخموں کی مرہم پٹی کرائی۔

حکیموں نے کہا کہ زخم کچے ہیں۔ انہیں بھرنے میں بڑا وقت لگے گا۔ لہٰذا تمہیں یہاں مسلسل کئی دنوں تک آرام کرنا چاہئے۔ وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا۔ ''افسوس۔ میں آرام نہیں کر سکتا۔ مجھے یہاں سے جانا ہی ہوگا۔''

انہوں نے پوچھا۔ ''ایسی کیا مجبوری ہے؟''

''آپ حضرات نادر شاہ کو نہیں جانتے۔ اگر میں نے اپنا فرض ادا نہ کیا تو وہ قہرو غضب ڈھانے والا میری گردن اڑا دے گا۔''

وہ زخموں سے چور ہونے کے باوجود سفر کرنے پر مصر تھا۔ اس کے لئے سواری کا انتظام کیا گیا۔ تقریباً چالیس کوس کی مسافت طے کرنے کے بعد اس نے اپنا دوسرا فرض بھی ادا کر دیا اور وہ خط برہان الملک تک پہنچا دیا۔ پھر اس قابل نہ رہا کہ واپس جا سکتا۔ اس کی آخری سانسیں وہیں پوری ہو گئیں۔

دہلی کا بادشاہ محمد شاہ تھا۔ وہ عرف عام میں رنگیلا راجہ کہلاتا تھا۔ سابقہ سلاطین کی طرح دن رات عیاشی میں مست رہتا تھا۔ اس کے اِندر سبھا میں ایک سے ایک کافر اداؤں والی حسینائیں تھیں۔ اس کی خلوت میں آنے جانے والی حسینائیں کیا تھیں، طرفہ قیامت تھیں۔ ان کے ناز و انداز شہوانی جذبات میں آگ لگاتے اور سفلی جذبات کو بھڑکاتے تھے۔ وہ مہاجنوں، ساہوکاروں اور انگریزوں سے قرضے اور پینشن لے کر بادشاہت کرنے والا بڑا ہی رنگین مزاج تھا۔ اس کے اطراف حسینوں کا میلا لگا رہتا تھا۔

اس میلے میں ایک حسینہ کا بدن انتہائی خوبصورت اور جاذب نظر تھا۔ وہ اس کی محفل میں اکثر برہنہ آتی تھی۔ کمال یہ تھا کہ اس کے برہنگی بالکل ہی واضح نہیں ہوتی تھی۔ اس کے بدن کے مخصوص حصوں پر رنگ و روغن سے ایسے بیل بوٹے بنائے جاتے تھے، جیسے وہ پھولدار لباس پہنے ہوئے ہو۔ اس طرح بے لباس ہوتے ہوئے بھی وہ ملبوس لگتی تھی۔

جب رقص کرتی اور سازوں کی دھن پر اپنے بدن کے زاویئے پیش کرتی تو بادشاہ کی نظریں اس کے بدن پر ادھر سے ادھر بھٹکتی رہتیں۔ وہ گھورتا رہتا اور دیکھتا رہتا کہ ایسے

انوکھے انداز میں جلوہ دکھانے والی کہاں کہاں سے ملبوس ہے اور کہاں سے نہیں ہے؟

عیاشی کے حوالے سے محمد شاہ رنگیلے کے عجیب عجیب سے شوق اور مطالبات ہوا کرتے تھے۔ کبھی راگ ملہار سننے کو جی چاہتا تو گرمی کے موسم میں بھی حکم صادر فرماتا کہ برسات کا موسم لایا جائے.....

برسات کے موسم میں راگ ملہار گایا جاتا ہے۔ لیکن موسم تو قدرتی اصولوں کے مطابق آتے جاتے ہیں۔ وہ کہتا تھا۔ ''وہ بادشاہ ہی کیا جس کے حکم سے موسم نہ بدلے؟ ہمارا حکم ہے کہ بادل گرجنے چاہئیں اور بارش ہونی چاہیئے۔''

حکم کی تعمیل ہوتی' بارش کا اہتمام کیا جاتا۔ اس کے عیش کدے کے باہر ہرا بھرا باغیچہ تھا۔ بیشمار خدام چھت پر چڑھ کر شاور کے ذریعے یوں پانی برساتے کہ باغیچے میں بارش ہوتی دکھائی دیتی۔ چھجوں سے بارش کی بوندیں ٹپکتی رہتیں۔ لوہے کے بڑے بڑے گولے چھت پر لڑھکائے جاتے تھے۔ جن سے ایسی گڑگڑاہٹ کی آوازیں گونجتیں' جیسے بادل گرج رہے ہوں۔ ایسے میں درباری گویا ملہار گاتا اور حسینائیں رقص کرتی رہتیں۔

عیش وعشرت میں مست رہنے والے بادشاہ نے نادر شاہ کے خط کو اہمیت نہ دی۔ فی الحال وہ نہیں جانتا تھا کہ نادر شاہ کس سیلانی بلا کا نام ہے؟

اودھ کا صوبیدار برہانُ الملک اپنے علاقے کے مسائل میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے بھی خط کا جواب نہ دیا۔ نادر شاہ کو یوں نظر انداز ہونے پر غصہ آ رہا تھا۔ اس نے پھر ایک ایلچی کو ان کے پاس روانہ کیا۔ وہ دوسرا ایلچی بھی بد بخت نکلا۔ ہندوستان تک نہ پہنچ سکا، سرحدی پٹھانوں نے اس کا مال واسباب چھین کر اسے ٹھکانے لگا دیا۔

نادر شاہ کی سمجھ میں یہی آیا کہ ہندوستانی حکمران سفارتی آداب کو بالائے طاق رکھ کر اس کے سفیروں کو مار ڈالتے ہیں۔ ان حالات میں اس کا طیش میں آنا ایک فطری امر تھا۔ وہ اپنے لشکر کے ساتھ ایران سے نکلا، پھر کابل کو فتح کرتا ہوا پشاور میں جھنڈے گاڑتا ہوا دریائے اٹک تک پہنچ گیا۔ دہلی اور اودھ تک خبر پہنچی کہ وہ ایک جنگجو درندہ ہے۔ جس علاقے کو فتح کرتا ہے وہاں حکومت قائم نہیں کرتا' لوٹ مار اور قتل وغارت گری کا بازار گرم کرتا ہے۔ پھر جو مال غنیمت ہاتھ آتا ہے سمیٹ کر لے جاتا ہے۔

وہ پنجاب کے علاقوں میں لوٹ مار کرتا ہوا دہلی کی طرف آ رہا تھا۔ یہ سن کر بادشاہ محمد شاہ کے ہوش اڑ گئے۔ کیونکہ اس بلائے جان کے لشکر میں ستر ہزار سپاہی ایک لاکھ سے زیادہ بندوقیں اور چالیس توپیں ہیں۔ دہلی کے شاہی لشکر میں برائے نام سپاہی رہ گئے تھے۔ کیونکہ انہیں تنخواہیں نہیں دی جاتی تھیں۔ اس لئے وہ روزگار کی تلاش میں فوج سے نکل کر کہیں چلے جاتے تھے۔

رنگیلے راجہ کو ذرا ہوش آیا کہ دہلی کا تخت ہاتھ سے جائے گا تو پریوں کا یہ میلا بھی نہیں رہے گا۔ وہ دن کو عید اور رات کو دیوالی نہیں منا سکے گا۔ اس نے آس پاس کے راجاؤں سے فوجی قوت حاصل کی۔ برہان الملک بھی اپنا لشکر لے کر بادشاہ کی مدد کے لئے دہلی پہنچ گیا۔

قندھار کے علاقے میں نادر شاہ کی فوج سے مقابلہ ہوا، یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ لاپرواہ اور غافل رہنے والے حکمرانوں کا انجام کیا ہوتا ہے؟ اس جنگ کا انجام بھی جلد ہی سامنے آ گیا، شاہی فوج کو شکست ہوئی اور برہان الملک کو گرفتار کر لیا گیا پھر اسے ایک قیدی کی حیثیت سے نادر شاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔

برہان الملک نے اس فاتح سے کہا۔ ''آپ لوٹ مار کا بازار گرم کریں گے تو دہلی شہر اجڑ جائے گا۔ ہم آپ کو دو کروڑ روپے ادا کریں گے، اتنی بڑی رقم آپ کو لوٹ مار سے حاصل نہیں ہوگی۔''

نادر شاہ نے اپنے مشیروں اور سرداروں سے مشورے کئے، انہوں نے کہا۔ ''ہمارے سپاہی مسلسل خون خرابے سے بیزار ہو چکے ہیں۔ اگر بیٹھے بٹھائے اتنی بڑی رقم مل رہی ہے تو اسے قبول کر لینا چاہیئے۔''

اس نے برہان سے کہا۔ ''ہم بھی انسان ہیں۔ اور ناحق انسانوں کا خون بہانا نہیں چاہتے۔ امن امان سے اتنی بڑی رقم ملے گی تو ہم واپس چلے جائیں گے۔'

اس کے راضی ہونے پر برہان الملک نے اس سمجھوتے کی تفصیلات لکھ کر بادشاہ کو بھیج دیں۔ محمد شاہ چاہتا تھا کہ کسی طرح صلح ہو جائے اور نادر شاہ واپس چلا جائے۔ اس نے وہ مطلوبہ رقم اپنے معتمد خاص آصف جاہ کے ذریعے نادر شاہ تک پہنچا دی۔

ایسے وقت امیر الامراء شمش الدولہ کا انتقال ہو گیا۔ برہان الملک اس کی جگہ خود

امیر الامراء کا منصب حاصل کرنا چاہتا تھا۔لیکن بادشاہ نے وہ منصب آصف جاہ کو عطا کر دیا۔ برہان الملک اس ناانصافی پر جھنجھلا گیا۔اس نے نادر شاہ سے پوچھا۔"کیا حضور! دو کروڑ روپے سے زیادہ دولت حاصل کرنا چاہیں گے؟"

وہ بولا۔"ہاتھ آنے والی دولت کو کون چھوڑتا ہے؟ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

اس نے کہا۔"دو کروڑ روپے کی کیا حقیقت ہے؟ ہم اتنی رقم تو اپنے گھر سے دے سکتے ہیں اور یہ رقم آپ کو مل بھی چکی ہے۔"

اس وقت نادر شاہ اودھ میں تھا۔ برہان الملک نے کہا۔"دہلی یہاں سے چالیس کوس پر ہے۔زیادہ دور نہیں ہے۔آپ وہاں چلیں۔شاہی خزانے میں آپ کی سوچ سے زیادہ دولت ہے۔پھر وہاں کے امیروں' مہاجنوں اور ساہوکاروں سے بھی کروڑوں روپے حاصل ہو سکیں گے۔"

نادر شاہ نے خوش ہو کر برہان الملک کو خلعت فاخرہ عطا کیا۔اسے اپنی خاص محفل میں حاضر ہونے کی اجازت دی اور صاحب اختیارِ کل مقرر کیا۔پھر اپنے لشکر کے ساتھ دہلی پہنچ گیا۔قلعہ میں داخل ہو کر بادشاہ کو حراست میں لے لیا۔اس کے بعد اپنی فوج کے سپاہیوں کو شہر میں گشت کرنے اور حتی الامکان امن وامان قائم رکھنے کا حکم دیا۔

ہندوستانی عوام اور شاہی لشکر کے سپاہی نادر شاہ سے راضی نہیں تھے۔اسے مار بھگانا چاہتے تھے۔انہوں نے یہ افواہ پھیلائی کہ نادر شاہ مر گیا ہے۔افواہیں بڑی برق رفتار ہوتی ہیں۔دیکھتے ہی دیکھتے دور دور تک پھیل جاتی ہیں۔

اس افواہ کے نتیجے میں نادر شاہ کے ایرانی سپاہی پریشان ہو گئے۔ہندوستانیوں کے حوصلے بڑھ گئے۔وہ ایرانی سپاہیوں کو سڑکوں اور گلیوں کوچوں میں قتل کرنے لگے۔اگرچہ نادر شاہ کے سپاہی مسلح تھے۔لیکن منظم نہیں تھے۔شہر میں جگہ جگہ پھیل گئے تھے۔اس بے ترتیبی اور بدنظمی کے باعث مارے جا رہے تھے۔نادر شاہ کو قلعے میں اطلاع ملی تو وہ گھوڑے پر سوار ہو کر شہر میں آیا۔لوگ اس پر پتھراؤ کرنے اور تیر چلانے لگے۔اس کے آس پاس جو محافظ تھے' وہ زخمی ہو رہے تھے' مارے جا رہے تھے۔نادر شاہ نے طیش میں آکر قتلِ عام کا حکم صادر کر دیا۔

وہ ایرانی سپاہی جیسے پلک جھپکتے ہی منظم ہو گئے۔پھر انہوں نے جو قتل وغارت گری شروع کی تو پھر کیا عورتیں' کیا مرد' کیا بوڑھے اور بچے سب کو گولیوں سے بھونتے اور تلواروں سے کاٹتے چلے گئے۔مکانوں اور دکانوں کو آگ لگا دی۔پورے دہلی شہر کو اجاڑ کر رکھ دیا۔

نادر شاہ کے تقریباً سات سو سپاہی مارے گئے تھے۔جب اس نے ہندوستانیوں سے اچھی طرح انتقام لے لیا تو واپسی کا قصد کیا۔وہ دہلی میں حکومت کرنے نہیں آیا تھا۔وہاں سے جاتے وقت تخت طاؤس' ہیرے جواہرات' پانچ سو ہاتھی' دو ہزار گھوڑے اور تقریباً بیس ہزار روپے لے گیا۔

برہان الملک کی پیشانی پر یہ داغ رہ گیا کہ اس نے نادر شاہ کے ہاتھوں دہلی شہر کو تباہ و برباد کر دیا اور ایک لٹیرے کو ہندوستان کی دولت لوٹ کر لے جانے کی ترغیب دی۔وہ سازش کرنے والا خود کوئی فائدہ نہ اٹھا سکا۔نہ امیر الامراء کا منصب ملا' نہ عزت ملی۔نادر شاہ کے جانے کے کچھ دنوں بعد وہ بھی اس دنیا سے کوچ کر گیا۔

اس کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ایک بیٹی صدر النساء بیگم تھی۔اس نے اس کا نکاح اپنی بہن کے بیٹے صفدر جنگ سے پڑھایا تھا۔اس کے بعد اس کا وہی داماد صفدر جنگ تخت نشین ہوا۔

اس کا مزاج پچھلے تمام بادشاہوں اور شہزادوں سے مختلف تھا۔وہ نہ تو شراب پیتا تھا' نہ شباب کا رسیا تھا۔اپنے آس پاس حسین عورتوں کا میلا نہیں لگاتا تھا۔اپنی بادشاہت قائم رکھنے کے سلسلے میں اس قدر محتاط رہتا تھا کہ اس نے دہلی کے بادشاہ کے حکومتی معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کی۔جب بھی دہلی دربار سے بلاوا آتا تھا' فوراً حاضر ہو جایا کرتا تھا۔اس نے بھی اپنے سسر برہان الملک کی طرح سولہ سال تک حکومت کی اور بڑی نیک نامی کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

اس کی وفات کے بعد شجاع الدّولہ نے بادشاہت کی مسند سنبھالی۔اس وقت وہ چوبیس برس کا جوان تھا۔اگرچہ شراب نوشی کا عادی نہیں تھا۔لیکن صحبتِ نسواں اور دیگر مذموم افعال کا مرتکب ہوتا رہتا تھا۔

وہ غیر معمولی جسمانی قوت کا مالک تھا۔کوئی گوسفند (مینڈھا یا دُنبہ) اس کی

طرف سینگ مارنے آتا تو وہ اس کے جبڑے چیر ڈالتا تھا۔ یہ تاریخ میں درج ہے کہ اس کی کمان سے نکلا ہوا تیر شیر کی پیشانی سے گزر کر دم کی طرف سے باہر نکل جاتا تھا۔ اس تاریخی بیان میں مبالغہ آرائی ہو سکتی ہے۔

ایک بار وہ زرہ بکتر پہن کر ہاتھی پر بیٹھ کر شیر کے شکار کے لئے نکلا۔ اچانک ہی ایک شیر نے جھاڑیوں کے پیچھے سے نکل کر اس پر حملہ کیا۔ ہاتھی شیر کے اس اچانک حملے سے خوفزدہ ہو کر بے تحاشہ دریا کی طرف بھاگنے لگا۔ فیل بان نے بہت سے آنکس اور تیر ہاتھی کے سر میں مارے۔ لیکن وہ اس قدر خوفزدہ تھا کہ رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ حتیٰ کہ ایک کنارے کی بلندی سے دریا میں گر پڑا۔

ایسے وقت شجاع الدولہ کی شہزوری قابل دید تھی۔ وہ دریا کی منہ زور لہروں میں گر پڑا تھا۔ زرہ بکتر اور ہتھیاروں کے باعث آسانی سے ہاتھ پاؤں نہیں مار سکتا تھا۔ ان لہروں کی زد سے نکل نہیں سکتا تھا۔ ایسے وقت اس نے دست و بازو کی قوت سے زرہ بکتر کے پرزے پرزے کر دیئے۔ انہیں اپنے جسم سے علیحدہ کیا اور پھر تیرتا ہوا کنارے پہنچنے لگا۔ ایسے ہی وقت ایک مگرمچھ نے اس پر حملہ کیا۔

وہ زرہ بکتر اور تمام ہتھیار پھینک چکا تھا۔ لہٰذا خالی ہاتھ مقابلہ کیا۔ دریا کے گہرے پانی میں کبھی مگرمچھ اس پر حاوی ہوتا تھا اور کبھی وہ مگرمچھ پر غالب آ جاتا تھا۔ آخر اسی نے غلبہ پایا۔ اپنے بازوؤں کی قوت سے مگرمچھ کے جبڑے چیر ڈالے۔

وہ جسمانی طور پر جس قدر شہزور تھا۔ اس کی فطرت میں اسی قدر خواہش نفسانی اور غلبہ شہوانی بھی غیر معمولی تھی۔ نفسانی خواہش اس پر دن رات اتنی شدت سے حاوی رہتی تھی کہ وہ بدحواس اور مدہوش ہو جاتا تھا۔ وہ خلوت میں ہو یا جلوت میں، گھر میں ہو یا حالت سفر میں .... اس کے ساتھ درجنوں عورتیں اور سبزہ خط چھیل چھبیلے رہتے تھے۔ راستے میں کہیں ہوس کا غلبہ ہوتا تو وہ سواری روک دیتا۔ پھر عورتوں کی صحبت میں جا کر دم لیتا تھا۔ اس کے بعد دمادم مست مچھندر ہو کر آگے روانہ ہوتا تھا۔

یہ کسی ایک مؤرخ نے نہیں کئی مؤرخین نے لکھا ہے کہ وہ دن رات میں دس یا پندرہ بار مباشرت کرتا تھا۔ ایسے جنسی دیو خال خال ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اس نے چند کٹنیاں

مقرر کی تھیں۔ وہ شہر شہر گھومتی تھیں اور خوبصورت عورتیں تلاش کر کے اس کے حرم میں پہنچاتی تھیں۔ اس کی مدخولہ عورتوں کی تعداد دو ہزار سے زیادہ تک پہنچ گئی تھی۔

وہ صرف ہوس کے میدان کا ہی نہیں، جنگ کے میدان کا بھی سورما تھا۔ اس نے مراہٹوں اور روہیلوں کو کئی بار شکست دی۔ انگریز فوجی لحاظ سے بہت مستحکم تھے۔ ان کے پاس جدید طرز کی بندوقیں تھیں۔ وہ توپوں اور بندوقوں کے سامنے اپنی جسمانی قوت کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا ایک بار ان سے جنگ میں شکست کھانے کے بعد صلح کر لی اور ان کے زیر اثر رہ کر حکومت کرنے لگا۔ ان کا تابعدار بن کر رہنے میں کوئی غیرت اور شرم کی بات نہیں تھی۔ دہلی کا بادشاہ بھی ان انگریزوں کے قدموں میں بیٹھ کر حکومت کر رہا تھا۔

ایک دن وہ ہاتھی پر سوار ہو کر ایک علاقے سے گزر رہا تھا۔ ایسے ہی وقت ایک خوبصورت اور جوان لڑکی پر نظر پڑی۔ اس کے اندر کا شیطان مچلنے لگا۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ ہنستی کھلکھلاتی ادھر سے ادھر آ رہی تھی، جا رہی تھی۔ اس کی چال میں رقص کا سا انداز تھا۔ اس کی بوٹی بوٹی تھرکتی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ اگر وہ حاکم نہ ہوتا ایک عام سا آدمی ہوتا تو اسی وقت اس پر دھاوا بول دیتا۔

وہ بڑی بیتابی سے اپنے محل میں پہنچا۔ پتہ نہیں، وہ کون تھی؟ اس کے حواس پر چھا گئی تھی۔ وہ رہ رہ کر اسے تصور میں دیکھ رہا تھا۔ اس کے لباس کو تار تار کر رہا تھا اور اس کی بوٹیاں نوچ رہا تھا۔ ایسے معاملات میں راجہ ہمّت بہادر اس کا راز دار اور دست راست تھا۔ جب اس نے شجاع الدولہ کی یہ حالت دیکھی تو دو ہندو کٹنیوں کو بلا کر حکم دیا کہ فلاں محلے میں جاؤ۔ وہاں ایک گھر کا دروازہ سبز رنگ کا ہے۔ دروازے کی چوکھٹ پر اوم لکھا ہوا ہے۔ وہاں ایک خوبصورت نوخیز لڑکی اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ معلوم کرو کیا، وہ اس کی رہائش اسی گھر میں ہے یا آس پاس کے کسی گھر میں رہتی ہے؟ وہ کون ہے اور کس کی بیٹی ہے؟

وہ معلومات حاصل کرنے چلی گئیں۔ راجہ ہمّت بہادر نے کہا۔ ''وہ ہندوؤں کا محلہ ہے۔ یقیناً وہ ہندو لڑکی ہوگی۔ آپ نے کچھ سوچا ہے کہ اسے کس طرح حاصل کر سکیں گے؟''

شجاع الدولہ نے کہا۔ ''آپ اس کے باپ یا کسی سرپرست سے معاملات طے

کریں گے۔ ہوسکتا ہے' وہ بڑی سے بڑی رقم لے کر اسے حرم میں بھیجنے کے لئے راضی ہو جائیں۔"

"اگر وہ راضی نہ ہوئے تو....؟"

"تو ہم نہیں جانتے۔ آپ کسی بھی طرح اسے ہمارے پاس لائیں گے۔ سیدھی طرح بات نہ بنے تو آپ جبر کریں گے۔ مگر کھلم کھلا کر زور زبردستی نہیں کریں گے۔ بڑی رازداری سے اسے اٹھوالیں گے۔ اسے ہر قیمت پر آج رات ہمارے پاس ہونا چاہئے۔"

شام تک ایک کٹنی نے آکر بتایا کہ وہ ایک کھتری کی بیٹی ہے اور وہ کھتری وہاں کے پنچوں کا سرپنچ ہے۔ لڑکی کا نام کملا کماری ہے۔ وہ ابھی پورے چودہ برس کی نہیں ہوئی ہے۔

وہ کٹنی اطلاعات فراہم کر کے چلی گئی۔ ہمّت بہادر نے کہا۔ "بڑا مسئلہ پیدا ہوگا۔"

اس نے پوچھا۔ "کیسا مسئلہ....؟"

"ایک تو وہ ہندو ہیں۔ بات کھلے گی تو دھرم اور مذہب کا جھگڑا پیدا ہو جائے گا۔"

شجاع نے کہا۔ "ہماری آدھی زندگی میدان جنگ میں گزرتی ہے۔ ہم کیا جھگڑے سے ڈر جائیں گے؟"

"یہ جھگڑا میدان جنگ کا نہیں ہے۔ شہر میں امن و امان قائم رکھنے کی بات ہے۔ لڑکی کا باپ سرپنچ ہے۔ کھتری ذات سے ہے۔ شہر میں ان کی بڑی عزت و شہرت ہے۔ ان کا بڑا مان کیا جاتا ہے۔" "ہم اس سرپنچ کی بیٹی کو اپنی گود میں بٹھا کر ان کا مان اور بڑھا دیں گے۔"

ہمّت بہادر سوچ رہا تھا اور پریشان ہو رہا تھا۔ شجاع نے پوچھا۔ "آپ کو پریشانی کیا ہے؟"

"حضور! ابھی وہ بالغ نہیں ہوئی ہے۔ بہت چھوٹی ہے۔"

"فکر نہ کرو۔ ہم بڑی کر دیں گے۔"

وہ ضدی تھا۔ اس چھوکری کے لئے مچل رہا تھا۔ ہمّت بہادر نے زرخرید واردات کرنے والوں کو اچھی؛ خاصی رقم دے کر حکم دیا کہ آج رات وہ کسی بھی طرح اس لڑکی کملا کماری کو حضور نواب صاحب کے حرم میں پہنچا دیں۔

آدھی رات کے بعد ہی اس کھتری کے گھر میں جیسے قیامت آگئی۔ کچھ لوگ منہ پر ڈھاٹا باندھے دروازہ توڑ کر اندر گھس آئے۔ ان کے پاس طمنچے اور بندوقیں تھیں۔ انہوں نے کہا۔ "ذرا بھی منہ سے آواز نکالو گے تو گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔ اگر خاموش رہو گے تو لمبی زندگی پاؤ گے۔"

دوسرے نے کہا۔ "ہم تمہاری بیٹی کو لے جا رہے ہیں۔ جلد ہی اسے خیر خیریت سے لے آئیں گے۔"

انہوں نے اس کے ماں' باپ اور بھائی بہنوں کے منہ میں کپڑا ٹھونسا۔ ان کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے باندھ کر الگ الگ کمروں میں بند کیا۔ پھر لڑکی کو اٹھا کر شجاع الدولہ کی خوابگاہ میں پہنچا دیا۔

وہ بری طرح سہمی ہوئی تھی۔ رو رہی تھی۔ پہاڑ جیسے ڈیل ڈول والے شجاع کو دیکھ کر خوف کے مارے گھگی بندھ گئی۔ وہ بڑے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس کے بدن کو سہلانے لگا۔ پھر دونوں بازوؤں میں اٹھا کر ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے بڑے پیار سے پچکارنے لگا۔

جب اسے محبت اور شفقت ملنے لگی تو خوف کسی حد تک دور ہوا۔ وہ کبھی اسے کچھ کھلا رہا تھا' کبھی کچھ پلا رہا تھا اور لطیفے سنا سنا کر ہنسا رہا تھا۔ پھر جب رونے کی باری آئی تو وہ چیخیں مارتی ہوئی بیہوش ہوگئی۔ اس نے سوچا تھا' صبح سے پہلے اسے اس کے گھر پہنچا دیا جائے گا۔ لیکن یہ ممکن نہ ہوا۔ اس کے علاج کے لئے اپنے خاص حکیم کو بلانا پڑا۔

دوسرے دن چند کنیزیں اس کی خدمت کے لئے مامور کی گئیں۔ وہ اسے سمجھاتی رہیں۔ دلاسے دیتی رہیں کہ جو ہونا تھا' وہ ہو چکا ہے۔ اب اسے کوئی اور نقصان نہیں پہنچے گا۔ یہاں سے جائے گی تو انعام کے طور پر اچھی خاصی رقم لے کر جائے گی۔

اور اگر وہ اس سلسلے میں رازداری برتے گی۔ واپس جا کر شجاع الدولہ کا نام زبان پر نہیں لائے گی تو نواب صاحب بعد میں بھی اسے مالی فائدہ پہنچاتے رہیں گے۔

نواب صاحب تو ایک ہی رات میں اس پر پوری طرح مرمٹے تھے۔ اسے دوسری اور تیسری رات بھی واپس جانے نہیں دیا۔ ادھر کماری کے گھر والے پریشان تھے۔ انہوں

نے قاضی اور داروغہ سے فریاد کی کہ چند ڈاکو ان کے گھر گھس آئے تھے۔انہوں نے کوئی لوٹ مار نہیں کی۔گھر سے کچھ نہیں چرایا۔ صرف ان کی بیٹی کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔تین دن گزر چکے ہیں اور اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا ہے۔

داروغہ نے پوچھا۔''وہ منہ چھپا کر آنے والے کون ہو سکتے ہیں؟ان کی باتوں سے کچھ تو اندازہ کیا ہوگا؟''

کملا کماری کے باپ نے جواب دیا۔''ان میں سے ایک تو ہندی بھاشا بول تھا اور دوسرے کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ مراہٹہ ہے۔''

اس طرح انہیں اندازہ ہوا کہ واردات کرنے والے غیر مسلم ہیں۔انہیں کسی مسلمان پر شبہ نہیں ہوا اور وہ اپنے علاقے کے حاکم شجاع الدولہ پر تو شبہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔

اور نواب صاحب تھے کہ ان کی ہوس بے لگام ہو رہی تھی۔شیطان کو کتنا ہی کھلاؤ اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔آخر پانچویں رات اسے اس کے گھر پہنچا دیا گیا۔اسے پہنچانے والے پچاس ہزار روپے دے کر چلے گئے۔

ماں باپ نے سوالیہ نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔وہ کیسے ڈاکو تھے' جو گھر سے کچھ چرا کر نہیں لے گئے۔بلکہ اچھی خاصی نقدی دے گئے تھے؟

باپ کا سر شرم سے جھکا ہوا تھا۔اس کی بیٹی کو اگرچہ زرق برق لباس میں اور اچھی حالت میں بھیجا گیا تھا۔لیکن چہرے پر وہ پہلے والی نوخیزی' نکھار اور رونق نہیں رہی تھی۔رنگ اڑا اڑا سا تھا۔اس کے آنسو بتا رہے تھے کہ ان پانچ دنوں میں وہ لڑکی سے پکی عورت بن چکی ہے۔ماں نے پوچھا۔''وہ لوگ تمہیں کہاں لے گئے تھے؟''

اس نے جواب نہیں دیا۔روتے ہوئے انکار میں سر ہلا دیا۔ماں نے پوچھا۔''تمہارا لباس کہاں ہے؟ایسا لباس تو شاہی خاندان کی عورتیں پہنتی ہیں۔سچ سچ بتاؤ وہ لوگ تمہیں کہاں لے گئے تھے؟''

بہت اصرار کرنے پر وہ اپنا دکھڑا رونے لگی۔سب کچھ بتا دیا کہ شجاع الدولہ نے اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا ہے۔اگرچہ اس نے بڑی محبت دی، پچاس ہزار روپے بھی دیئے لیکن کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا ہے۔دو پاٹن کی چکی بھی ایسا نہیں پیستی جیسا

اس نے پیس کر رکھ دیا ہے۔

وہ سرپنچ یہ سنتے ہی طیش میں آ گیا۔ایک مسلمان نے اس کی بیٹی کی آبرو لوٹی تھی۔اس نے فوراً ہی پنچوں کو بلایا، پوری کھتری قوم میں یہ بات پھیلائی گئی کہ مسلمانوں نے ایک ہندو لڑکی کو اغوا کر کے اس کی عزت لوٹی ہے۔ان کی پوری قوم کی غیرت کو للکارا گیا ہے۔

لیکن ان کے آگے یہ سوال پیدا ہوا کہ وہ ہندو رعایا ہیں، مسلمان بادشاہ کو نہ گالیاں دے سکتے ہیں۔نہ احتجاج کرنے کے لئے اس کے خلاف جلوس نکال سکتے ہیں۔انہوں نے راجہ رام نارائن کے پاس جا کر زمین پر پگڑیاں ڈال دیں اور کہا۔''ہم یہاں بے غیرت بن کر نہیں رہیں گے۔ہمارے ساتھ انصاف ہونا چاہئے۔یا پھر ہم ادھ چھوڑ کر کہیں چلے جائیں گے۔''

راجہ رام نارائن اور اس کا بھتیجا جگت نارائن دس بارہ ہزار کھتریوں کا مجمع لے کر ننگے سر اور ننگے پاؤں اسماعیل خاں قابلی کے پاس پہنچے۔اس کے سامنے دست بستہ ہو کر کہا۔''والئی ملک نے ہم پر بڑا ظلم کیا ہے۔ہماری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ہم آپ کو نواب شجاع الدولہ کے والد مرحوم صفدر جنگ کی جگہ مانتے ہیں۔آپ نے انصاف نہ دلایا تو ہم یہ ملک چھوڑ کر چلے جائیں گے۔''

اسماعیل خاں یہ سنتے ہی ناراض ہو گیا۔اس نے فوراً ہی فریاد رسی کی اور کئی سرداروں کو بلا کر انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ نواب شجاع الدولہ کے خلاف آواز اٹھائی جائے۔اگرچہ بادشاہ وقت کے خلاف کوئی کارروائی ممکن نہیں تھی۔تاہم یہ کہا گیا کہ اس کے دست راست ہمت بہادر کو سزا دلائی جائے۔

انہوں نے نواب شجاع الدولہ کی والدہ نواب عالیہ کے پاس پہنچ کر انہیں بیٹے کے کرتوت کی تفصیل بتائی۔پھر کہا۔''اس وقت پوری کھتری قوم مشتعل ہو چکی ہے۔بندہ پرور نواب صاحب نے ان کی غیرت کو للکارا ہے۔ہمیں یہ کہنے کی جرات نہیں ہے کہ نواب صاحب کو سزا دی جائے۔لیکن ان کے دست راست ہمت بہادر کو سزا دی جائے گی تو یہ مشتعل ہندو کچھ ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔''

نواب شجاع الدولہ نے کہا۔''ہمت بہادر ہمارا محکوم ہے۔اس نے ہمارے

احکامات کی تعمیل کی ہے۔ کسی کی مجال نہیں ہے کہ کوئی اسے سزا دے۔''

یہ سنتے ہی اسماعیل خاں قابلی نے کہا۔''بے شک۔ آپ من مانی کریں۔ لیکن کچھ ایسا قدم اٹھائیں کہ آپ کے رعب و دبدبے اور شان و شوکت میں کسی طرح کی کمی نہ ہو اور انصاف کا تقاضہ بھی پورا ہو جائے۔''

نواب عالیہ بیگم نے کہا۔''ان کے سرپنچ کو سمجھوتے پر آمادہ کرو۔ کسی کو سزا دلانے کی بات نہ کرے۔ ہم اس لڑکی کے سر پر چادر ڈالیں گے۔ وہ اس قدر رسوائیوں کے باوجود بیاہی جائے گی۔ کھتری قوم میں سے جو بھی شخص اس سے شادی کرے گا اور اپنی عزت بنا کر رکھے گا۔ اسے ہماری طرف سے جاگیر عطا کی جائے گی۔''

اس سے بہتر اس مقدمے کا فیصلہ نہیں ہو سکتا تھا۔ جو عزت لوٹی جا چکی تھی' وہ واپس ملنے والی نہیں تھی۔ آئندہ کملا کماری کو اسی صورت میں عزت مل سکتی تھی کہ کوئی جاگیر کے لالچ میں اس سے شادی کرے اور کبھی اسے کسی طرح کا طعنہ نہ دے۔

نواب عالیہ نے فیصلہ سنا کر کھتریوں کو راضی کر لیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو بیٹا مشتعل ہو کر احتجاج کرنے والوں کو موت کے گھاٹ اتارنے لگتا۔ پھر کچھ لوگ مارے جاتے۔ باقی احتجاج کرنے والے اپنی اور اپنے اہل و عیال کی سلامتی کے لئے اس کے آگے گھٹنے ٹیک دیتے۔ اس کے اندر نفسانی خواہشات کی شدت اور گرمی ایسی تھی' جو اس کے دماغ تک پہنچتی تھی۔ کبھی کبھی اس کے رویے سے ظاہر ہوتا تھا کہ دماغ کے اندر انگارے بھرے ہوئے ہیں۔ وہ اکثر برے بھلے کی تمیز نہیں کرتا تھا۔ اپنے پرائے کسی کے بھی خلاف غصے میں جو فیصلہ کر لیتا تھا۔ وہ فیصلہ پتھر کی لکیر بن جاتا تھا۔

سعادت اللہ خاں روہیلہ سے اس کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ لیکن ایک بار شجاع الدولہ کا ایک سیاسی مفاد حاصل نہ ہوا تو اس نے حملہ کر کے ان کے پورے خاندان کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس خاندان کے کئی افراد کو قتل کر دیا۔ یوں انتقام کی آگ بجھنے تک وہ پچھلی تمام محبتوں اور دوستیوں کو بھول جاتا تھا۔ کسی کا لحاظ کرنا نہیں جانتا تھا۔

مراہٹوں نے ایک بار روہیلوں کو ایک جنگ میں شکست دی تھی۔ حافظ رحمت خان نے شجاع سے کہا۔''اگر آپ مراہٹوں کو مار کر روہیل کھنڈ سے بھاگنے پر مجبور کر دیں

گے تو ہم آپ کو چالیس لاکھ روپے قسطوں میں ادا کرتے رہیں گے۔''

شجاع نے انگریزوں سے بیس لاکھ میں سودا کیا۔ پھر انگریزی فوج سے متحد ہو کر اس نے مراہٹوں پر چڑھائی کی۔ انہیں شکست فاش دی۔ وہ روہیل کھنڈ سے بھاگ گئے۔ ادھر حافظ رحمت خاں نے دیگر روہیلے سرداروں سے مشورہ کئے بغیر چالیس لاکھ کی ادائیگی کا وعدہ کیا تھا۔ اس با[illegible] وہ تمام سردار ادائیگی سے منکر ہو گئے۔ یوں ان کے درمیان پھوٹ پڑ گئی۔

رقم نہ ملنے پر شجاع الدولہ سر سے پاؤں تک سلگ گیا۔ اس نے روہیلوں پر حملہ کر کے ان کے علاقوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ان کا مال و اسباب لوٹ کر گھروں کو جلا کر راکھ کر ڈالا۔ ہزاروں روہیلوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس سے مدد مانگنے والے بعد میں پچھتاتے تھے اور توبہ کرتے تھے

اس نے دہلی میں ایک نہایت ہی حسین عورت کو دیکھا۔ اس کا نام گنا بیگم تھا۔ وہ اس پر بھی ہزار جان سے عاشق ہو گیا۔ اس کی ماں نے کہا۔''اگر حضور میری بیٹی کو نکاح میں لیں گے اور اس سے ہونے والی اولاد کو ولی عہد بنائیں گے تو میں بیٹی کو لے کر لکھنؤ چلی آؤں گی۔''

وہ راضی ہو گیا۔ معاملات طے ہو گئے۔ وہ اپنی بیٹی کو لے کر دہلی سے روانہ ہوئی۔ پھر آگرے پہنچی۔ بھرت پور کے راجہ جواہر سنگھ نے جب گنا بیگم کے حسن و جمال کا چرچا سنا تو کہا۔''وہ ہمارے علاقے کی فصل ہے۔ ہمارے درخت کا پھل ہے' ہم کھائیں گے۔ اسے شجاع تک پہنچنے نہیں دیں گے۔''

اس نے سپاہیوں کو بلا کر حکم دیا کہ گنا بیگم کو اغواء کر کے اس کی خوابگاہ میں پہنچایا جائے۔ ادھر دوسرے علاقے کا جاگیردار وزیر خان بھی گنا بیگم کا دیوانہ تھا۔ اس نے اپنے خاص آدمی کے ذریعہ کہلا بھیجا کہ تم ماں بیٹی کو اس علاقے سے نکل آنا چاہئے، راجہ جواہر سنگھ کی نیت خراب ہے۔ وہ تمہیں حاصل کرنے کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہے۔

یہ خبر ملتے ہی وہ ماں بیٹی راتوں رات آگرے سے نکل گئیں۔ ایک رتھ میں بیٹھ کر لکھنؤ کی طرف جانے لگیں۔ جواہر سنگھ کے سپاہی ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ راستے میں وزیر خان کے سپاہیوں نے ان کا راستہ روکا۔ پھر ان کے درمیان زبردست جنگ چھڑ

گئی۔ جب دو کتے ایک روٹی کے لئے آپس میں لڑتے ہیں تو پھر وہ کسی کو نہیں ملتی۔ جس کی نصیب کی ہوتی ہے، اسی کے پاس پہنچ جاتی ہے۔

ماں بیٹی نے ان کی آپس کی لڑائی سے فائدہ اٹھایا، پھر وہاں سے بھی فرار ہو کر مسلسل سفر کرتی ہوئی شجاع الدولہ تک پہنچ گئیں۔ ماں نے اپنی حسین و جمیل بیٹی کو اس کی جھولی میں ڈال دیا۔ ان کا باقاعدہ نکاح پڑھایا گیا۔ پھر وہ بہو بیگم کہلانے لگی۔ آصف الدولہ اسی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔

قاسم علی خان بنگال کا ناظم تھا۔ وہ انگریزوں سے شکست کھانے کے بعد اپنی باقی ماندہ فوج اور کثیر مقدار میں زر و جواہر اور قیمتی اشیاء لے کر شجاع الدولہ کے پاس آ گیا۔ وہ اس سے فوجی مدد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے قاسم علی سے کہا۔ ''آپ میرے در پر آئے ہیں۔ میرے مہمان ہیں۔ آپ کی جان و مال کی حفاظت کرنا اور ہر طرح کی مدد کرنا میرا فرض ہے۔''

قاسم علی نے کروڑوں روپے کے ہیرے جواہرات اس کے پاس امانت کے طور پر رکھوا دیئے اس نے انگریزوں سے مطالبہ کیا کہ قاسم علی کو بنگال کا صوبہ واپس کیا جائے۔ مطالبہ پورا نہ ہونے پر جنگ شروع ہو گئی۔ انگریز تو بنگال کے راستے ہندوستان میں آئے تھے۔ برسوں سے وہاں ان کے قدم جمے ہوئے تھے۔ ان کی فوجی قوت بہت مستحکم تھی۔

شجاع الدولہ کو اس جنگ میں شکست ہوئی۔ اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ان سے صلح کر کے دس لاکھ روپے جرمانے کے طور پر ادا کر کے اپنی جان چھڑائی۔ اس کے بدلے اپنے گھر آئے ہوئے مہمان قاسم علی کے کروڑوں روپے کے ہیرے جواہرات ضبط کر لئے۔ اس سے کہا۔ ''انگریز تمہارا سر چاہتے ہیں۔ اگر زندگی چاہتے ہو تو یہاں سے کہیں دور چلے جاؤ۔ ان کے سپاہی گرفتار کرنے آئیں گے تو میں تمہاری جان نہیں بچا سکوں گا۔''

وہ بیچارہ اپنی سلامتی کے لئے کنگال ہو کر وہاں سے چلا گیا۔ شجاع شہزور ہونے کے باوجود اپنی طاقت سے کم اور چالبازی اور مکاری سے زیادہ کام لیتا تھا۔ اپنا ہو یا بیگانہ اسے لوٹنے اور دولت سمیٹنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

جو ہر پور، غازی پور اور مانک پور میں علماء و مشائخ کے لئے وظیفے مقرر کئے گئے

تھے۔ ان کی کچھ زمینیں بھی تھیں۔ انہوں نے شجاع کے مزاج کے خلاف کوئی فتویٰ سنایا تھا۔ بس اس کے دماغ میں گرمی چڑھ گئی۔ اس نے بیشمار علمائے دین کے وظیفے بند کر دیئے۔ ان کی زمینیں ضبط کر لیں۔ وہ بیچارے حصول معاش کی فکر میں در بدر بھٹکنے لگے۔ ان بیچاروں پر ایسا برا وقت آ گیا کہ ان کی بیویاں اور بچے فاقے کرنے لگے۔

جب شجاع بیمار ہوا، اور مرض نے بہت شدت اختیار کی تو اس کی والدہ نے رو رو کر نصیحت کی۔ ''اے جان مادر! تمہارے لئے دوائیں بھی کی جا رہی ہیں اور دعائیں بھی ... میرا دل کہتا ہے کہ تم صحت یابی کی نیت سے تین نیکیاں کرو تو تمہارے مرض کی شدت ضرور کم ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ تمہیں شفاء دے گا۔''

شجاع نے پوچھا۔ ''آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟''

ماں نے کہا۔ ''تم نے گھر آئے ہوئے مہمان قاسم علی خان کے کروڑوں روپے کے ہیرے جواہرات ضبط کر لئے اسے کنگال بنا کر یہاں سے بھگا دیا۔ اپنی اس زیادتی کی تلافی کرو اسے واپس بلاؤ اور اس کا تمام مال و اسباب واپس کر دو۔''

اس نے کہا۔ ''میں میدان جنگ کا سپاہی ہوں۔ آگے بڑھتا جاتا ہوں۔ جو مال غنیمت ہاتھ لگتا ہے، وہ میرے مقدر کا ہوتا ہے۔ میں پیچھے پلٹ کر ہاتھ آیا ہوا مال واپس نہیں کرتا۔''

وہ اپنی والدہ کو دیکھتے ہوئے ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''آپ نے یہ نصیحت کرنے میں دیر کی ہے۔ قاسم علی مر چکا ہے۔ آپ فرمائیں مجھے دوسری نیکی کیا کرنی ہوگی؟''

ماں نے کہا۔ ''تم نے فیض آباد کے دروازوں پر اپنے مسلح سپاہی مقرر کئے ہیں۔ اور قلعے کے شہر والوں کو باہر نکلنے سے منع کر دیا ہے۔ وہ بیچارے وہاں قیدی بن کر رہ گئے ہیں۔ اپنا یہ حکم منسوخ کر دو۔ تا کہ وہ لوگ آزادی کے ساتھ باہر آتے جاتے رہیں۔''

اس نے کہا۔ ''ہم چاہتے ہیں کہ فیض آباد کے لوگ اپنے شہر کو خوبصورت بنائیں اور اسے ترقی دیں۔ اگر ہم انہیں باہر جانے کی اجازت دیں گے تو وہ نقل مکانی کریں گے۔ شہر چھوڑ کر چلے جائیں گے اور وہاں ویرانی اور سناٹا چھا جائے گا۔ آپ امور مملکت کو نہیں سمجھتی ہیں۔ یہ بتائیں کہ ہمیں تیسری نیکی کیا کرنی چاہئے؟''

''تم نے علماء اور مشائخ کے وظیفے بند کر دیئے ہیں۔ان کی زمینیں ضبط کر لی ہیں۔یہ سراسر جرم ہے۔اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو اور توبہ کرو۔ان کی زمینیں واپس کر کے وظیفے جاری کر دو۔''

بیمار بیٹے نے بیمار سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔''ہمیں اپنے مرنے کا کوئی غم نہیں ہے۔ایک دن تو سب ہی کو مرنا ہے۔ہم بھی اس دنیا سے اٹھ جائیں گے۔لیکن بیماری اور موت کے خوف سے نیکیاں نہیں کریں گے۔''

''میرے بیٹے!توبہ کا در کھلا رہتا ہے۔وہ معبود غفور الرحیم ہے۔تمہارے گناہوں اور غلطیوں کو معاف کر دے گا۔تمہیں شفاء حاصل ہو گی۔''

اس نے کہا۔''ہمیں اپنا انجام معلوم ہو چکا ہے۔پچھلی رات ہم نے خواب میں دیکھا کہ ایک صحرائے لق ودق کی ایک دلدل میں ہمارے پاؤں پھنس گئے ہیں۔ہم بہت زور لگا رہے ہیں اور نکل جانے کی کوششیں کر رہے ہیں مگر ناکام ہو رہے ہیں۔ایسے وقت کوئی ہماری مدد کو نہیں آ رہا ہے۔ظاہر ہے جب انسان کا آخری وقت آتا ہے تو کون اس کا ساتھ دیتا ہے۔اسے تو تنہا ہی اپنے حالات سے نمٹنا پڑتا ہے۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔''اچانک ایک سوار ہمارے پاس آیا۔اس نے ہمارا ہاتھ پکڑ کر بہت زور سے کھینچا تو ہم اس دلدل سے نکل آئے۔ایسے ہی وقت ہماری آنکھ کھل گئی۔اس خواب کی تعبیر بالکل واضح ہے،آپ سمجھ سکتی ہیں کہ یہ دنیا ایک صحرائے لق و دق ہے۔ہم اس میں دن رات گناہ اور معاصی کی دلدل میں پھنسے رہتے تھے۔آخر اس نجات دہندہ نے ہمارا ہاتھ پکڑ کر اس دلدل سے نکال لیا۔ہمیں ساحل نجات پر پہنچا دیا۔عزیز از جان مادر!ان اس جہان فانی سے کوچ کرنا ہے۔لہذا آپ ہمیں نیکیاں کرنے کی نصیحت نہ کریں۔''

اس نے جو تعبیر بیان کی تھی،وہ درست ثابت ہوئی۔دو دن کے بعد ہی اس کا انتقال ہو گیا۔اس کا ایک ہی بیٹا آصف الدولہ تھا۔اگرچہ وہ باپ سے مشابہت رکھتا تھا لیکن دونوں میں زمین وآسمان کا فرق تھا۔وہ عورتوں کے معاملے میں باپ سے بالکل مختلف تھا۔باپ غیر معمولی قوت مردانگی کا حامل تھا۔جب کہ بیٹا مردانگی سے محروم تھا اور قوت

رجولیت نہیں رکھتا تھا۔

خوش قامت بھی نہیں تھا۔اوپر کا دھڑ مناسب تھا،نیچے کمر سے پاؤں تک اتنا چھوٹا تھا کہ گھوڑے کی سواری نہیں کر سکتا تھا۔ایسے جسمانی عیب کے باعث اس میں سفلا پن،بد مزاجی اور حد درجہ سنگدلی پیدا ہو گئی تھی۔

شجاع الدولہ کا ایک بیٹا ایک کنیز کے بطن سے ہوا تھا۔اس کا نام یمین الدولہ تھا۔[illegible] کی دادی یمین الدولہ کی تخت نشینی چاہتی تھیں لیکن آصف الدولہ اور اس کی ماں۔[illegible] نے تخت پر قبضہ کیا۔شجاع الدولہ کی میت ابھی گھر میں رکھی ہوئی تھی۔بہو بیگم نے آصف الدولہ سے کہا۔''بیٹے!ہم نے ذرا سی بھی تاخیر کی تو تمہاری دادی جان اس کنیز زادے یمین الدولہ کو تخت بٹھا دیں گی۔تمہیں ابھی اور اسی وقت اپنی بادشاہت کا اعلان کرنا چاہئے۔''

آصف الدولہ نے کہا۔''امی جان!لوگ کیا کہیں گے؟بابا کی میت گھر میں رکھی ہوئی ہے۔ہمارا تخت پر بیٹھنا کیا مناسب رہے گا؟''

''مخالفت میں بولنے والے کتے ہوتے ہیں۔وہ بولیں تو سمجھو کہ بھونک رہے ہیں۔ہمیں جو کرنا ہو گا ابھی کر گزریں گے۔''

بہو بیگم نے اپنے ہمنوا اور حمایت کرنے والوں کو فوراً طلب کیا،ان کے کانوں میں یہ بات پھونک دی کہ ابھی آصف الدولہ کی تخت نشینی ہو گی۔اور وہ سب بڑھ چڑھ کر اس کی حمایت کریں گے۔

انگریز ریذیڈنٹ شجاع الدولہ کی موت پر تعزیت کے لئے آیا تھا۔بہو بیگم نے پردے کی آڑ میں رہ کر اس سے کہا۔''آپ ہمارے صاحبزادے آصف الدولہ کو تخت پر بٹھائیں،تو کوئی اعتراض کرنے کی جرات نہیں کرے گا۔''

ریذیڈنٹ نے کہا۔''یہ ممکن نہیں ہے۔آپ کا بیٹا نااہل ہے۔کمپنی پہلے ہی یمین الدولہ کے حق میں فیصلہ کر چکی ہے۔''

بہو بیگم نے کہا۔''بڑے بڑے فیصلے آن کی آن میں بدل دیئے جاتے ہیں۔ہمارے بیٹے کی بادشاہت سے آپ کی کمپنی کو توقع سے زیادہ فائدہ پہنچے گا۔کیا آپ کمپنی کو مالی منافع پہنچانا نہیں چاہیں گے؟''

اس نے کہا۔ ''پہلے معلوم تو ہو کہ آپ ماں بیٹے ہمیں کس قسم کا فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں؟''

بہو بیگم نے ریذیڈنٹ کو بہت بڑی پیشکش کی۔ جو ہر پور، غازی پور اور بنارس کے علاقوں سے سالانہ بائیس لاکھ روپے کی آمدنی ہوا کرتی تھی۔ بہو بیگم ے کہا۔ ''میرا بیٹا تخت نشین ہوتے ہی یہ علاقے کمپنی کے نام لکھ دے گا۔''

یہ اتنی منافع بخش پیشکش تھی کہ ریذیڈنٹ راضی ہوگیا۔ پھر تو کوئی راستہ روکنے والا نہیں تھا۔ اس گھر میں میت پڑی ہوئی تھی۔ اور اقتدار کے لئے سودے بازی ہو رہی تھی۔ بلکہ ہو چکی تھی۔

اس وقت روایتی سیاسی خود غرضی دیکھنے میں آئی، جس وقت باپ کے جنازے کو قبرستان لے جایا جا رہا تھا۔ اسی وقت بیٹے کو تخت پر بٹھایا جا رہا تھا۔ ایک طرف ماتم ہو رہا تھا۔ اور دوسری طرف تخت نشینی کا جشن منایا جا رہا تھا۔

اقتدار اور اختیار حاصل کرتے ہی صاحبزادے کھل کر عیاشی کرنے لگے۔ اس کی ذہنی سطح اتنی پست تھی کہ وزیر اور مصاحبین کی صحبت میں شراب نوشی اور ناچ رنگ کی محفل جمانے لگا۔ اس نے ادنیٰ ذات کے لوگوں کو عہدے' منصب اور راجہ کے خطابات دیئے۔ پھر دن رات لہو ولعب، شراب نوشی، چوپڑ بازی، ہاتھیوں کے جنگ، کبوتر بازی، مرغوں کی لڑائی، پتنگ بازی، مختلف کھیل تماشوں اور ہولی بسنت اور دیوالی کے جشن منانے میں سالانہ تیس لاکھ روپے خرچ کرتا رہا۔

وہ اپنے باپ شجاع الدولہ کی زندگی میں چھپ چھپا کر ایسے بازاری بدمعاشوں سے ملتا رہتا تھا۔ ماں باپ نہیں چاہتے تھے کہ وہ ایسے آوارہ اور عیاش لوگوں کی صحبت اختیار کرے۔ چونکہ [illegible]ردانگی سے محروم تھا۔ اس لئے یہ بات سمجھ میں آنے والی تھی کہ وہ ان ہٹے کٹے عیاشوں کے پاس مذ نول بن کر رہتا ہے۔

یہ سوچ کر ہی شجاع الدولہ کا سر شرم سے جھک جاتا تھا۔ یہ بات خنجر کی طرح دل میں اترتی تھی کہ جو مردانگی اور شہوت پرستی میں غیر معمولی قوت کا حامل تھا۔ جس کی تنہائی میں آکر عورتیں توبہ کرتی تھیں۔ اس کا بیٹا دوسروں کی تنہائیوں میں جا کر توبہ توبہ ہائے ہائے

کرتا ہے۔ شیر ببر جیسے باپ کی غیر معمولی جوانمردی پر کیچڑ اچھالتا ہے۔

شجاع الدولہ غصے سے کھول جاتا تھا۔ جو بھی سفلے اور رذیل اس کے بیٹے سے ملتے تھے، ان کے ہاتھ پاؤں توڑ کر دریا میں پھینک دیتا تھا۔ اس شیطان نفس باپ پر کیسا وقت آیا تھا کہ جوان بیٹے کو پردے میں رکھا جاتا ہے؟ وہ بیٹے کو چار دیواری میں چھپا کر رکھتا تھا۔ باہر جانے نہیں دیتا تھا۔ اسے کسی سے ملنے اور بات کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔

اس نے اپنی زندگی میں یہ فیصلہ سنا دیا تھا کہ آصف الدولہ اس کا جانشیں کہلانے کا اہل نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے بعد اس کے دوسرے بیٹے یمین الدولہ کو تخت پر بٹھایا جائے۔ مرنے والے کی نصیحت اور وصیت پر کون عمل کرتا ہے؟ بہو بیگم نے سازشوں کا جال بچھا کر اپنے بیٹے آصف الدولہ کو اقتدار کی گدی پر بٹھا دیا۔

اگرچہ آصف الدولہ میں قوتِ رجولیت نہیں تھی۔ اس کے باوجود اس کی حرم میں پانچ سو عورتوں کا میلا لگا رہتا تھا۔ ان میں سے اکثر عورتیں حاملہ ہو کر اس کے پاس آتی تھیں۔ وہ بڑی خوشی سے انہیں گلے لگاتا تھا۔ وہاں آنے اور مائیں بننے والی ہی بتا سکتی تھیں کہ کس کے بچے کو جنم دے رہی ہے؟ اور وہ عورتیں قسم کھا کر کہتی تھیں کہ مرزا آصف الدولہ کے بچے پیدا کر رہی ہیں۔

جب کوئی حسینہ کسی بچے کو جنم دیتی تو وہ اولاد کی خوشی میں خوب جشن منایا کرتا تھا۔ اس طرح وہ تیس لڑکے اور اٹھائیس لڑکیوں کو باپ بن چکا تھا۔ بڑے فخر اور مردانہ شان کے ساتھ سینہ تان کر چلتا تھا۔

شجاع الدولہ نے سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کی صورت میں اچھی خاصی دولت چھپا کر رکھی تھی۔ اور یہ راز اپنی والدہ نواب عالیہ اور اپنی بیوی بہو بیگم کو بتایا تھا۔ آصف الدولہ اس خزانے کو حاصل کرنے کے لئے اپنی ماں اور دادی کے پیچھے پڑ گیا۔

وہ دونوں اس کی عیاشی اور بے جا مصرف کے لئے خفیہ خزانے کا در کھولنا نہیں چاہتی تھیں۔ جب اس نے دیکھا کہ گھی سیدھی انگلی سے نہیں نکل رہا ہے تو انگریزوں سے ساز باز کی۔ ریذیڈنٹ سے پوچھا۔ ''اگر ہم کمپنی کو ایک خفیہ خزانے تک پہنچائیں تو ہمیں کیا ملے گا؟''

ریذیڈنٹ نے کہا۔''خزانے کا دس فیصد ملے گا۔''

اس نے کہا۔''پچیس فیصد ملے گا۔تو ہم اپنی والدہ اور دادی جان کی ناراضگی مول لے سکیں گے۔''

پچیس فیصد پر معاملہ طے ہوگیا۔اس نے ریذیڈنٹ کو مشورہ دیا۔''آپ ہماری والدہ اور دادی جان کو دھمکی دیں کہ وہ خزانہ آپ کے حوالے نہ کیا گیا تو کمپنی ہمیں اقتدار سے محروم کردے گی۔''

ریذیڈنٹ نے یہی دھمکی انہیں دی۔دادی نواب عالیہ نے کہا۔''اچھا ہے۔اس نالائق سے اقتدار چھین لیا جائے اور ہمارے دوسرے پوتے یمین الدولہ کو تخت پر بٹھایا جائے۔''

لیکن بہو بیگم کو یہ منظور نہیں تھا کہ اس کے بیٹے کو اقتدار سے محروم کیا جائے۔وہ اپنے لاڈلے کی توہین برداشت نہیں کرسکتی تھی۔اس نے ریذیڈنٹ کو خزانے تک پہنچا دیا۔اس طرح آصف الدولہ نے انگریز لٹیروں کے ذریعے اپنے حصے کے ایک کروڑ پچیس لاکھ روپے حاصل کر لئے۔

اگرچہ بہو بیگم بیٹے سے ناراض رہتی تھی۔اس کی فضول خرچی اور نالائقی سے نالاں تھی۔تاہم اپنے سوتیلے بیٹے یمین الدولہ کے مقابلے میں اسے افضل و برتر رکھنے کے لئے ہیرا پھیری اور سازشیں کرتی رہتی تھی۔لیکن تقدیر کے سامنے تدبیر ہمیشہ کامیاب نہیں ہوتی۔کچھ عرصہ بعد آصف الدولہ کا انتقال ہوا تو یمین الدولہ کو اقتدار حاصل ہوگیا۔اب بہو بیگم کی کوئی سازش رنگ نہیں لاسکتی تھی۔آخر میں خدا ہی یاد آتا ہے۔وہ ہاتھ میں تسبیح لے کر ایک گوشے میں ہوگئی۔

یمین الدولہ کے دو بیٹے تھے۔ایک غازی الدین حیدر، اور دوسرا محمد علی شاہ تھا۔یمین الدولہ شراب وشباب کا عادی نہیں تھا۔بے جا شاہانہ شان وشوکت سے گریز کرتا تھا۔وہ بڑی ذمہ داری سے مملکت کے فرائض انجام دیتا رہا۔اس نے امور بادشاہت کے ہر شعبے میں استحکام پیدا کیا۔لیکن اس کی موت کے بعد اس کا بیٹا غازی الدین حیدر اپنے بزرگوں کی طرح عیش وعشرت کی طرف مائل ہوگیا۔ان ہی کے نقش قدم پر چلنے لگا۔

غازی الدین حیدر کی شادی مبشر خان کی بیٹی بادشاہ بیگم سے ہوئی تھی۔وہ اسم با

مسما تھی۔نام بادشاہ بیگم تھا' تیور بھی بالکل بادشاہوں جیسے تھے۔بہت ہی تنک مزاج' سرکش اور منچلی تھی۔جب بولتی تھی تو یوں لگتا تھا جیسے انگارے تھوک رہی ہو۔

غازی الدین حیدر اس کا شوہر اس سے کتراتا رہتا تھا۔ایک طرح سے اس سے علیحدگی اختیار کئے رہتا تھا۔وہ اپنے جاہ وجلال اور قوت اقتدار کو بڑھانے کی اتنی زیادہ حریص اور دلدادہ تھی کہ کوئی چیز بھی اسے مطمئن نہیں کرتی تھی۔بس ایک ہی خواہش تھی کہ پوری سلطنت اس کی مٹھی میں آجائے۔اسے جنون کی حد تک اقتدار کی ہوس تھی۔

اس کے مقابلے میں غازی الدین حیدر بہت ہی کند ذہن تھا۔اس نے مؤتمر الدولہ جیسے مکار شخص کو وزارت کا منصب عطا کیا تھا۔مؤتمر الدولہ نے اپنے ایک بازاری دوست اعظم خاں کو شاہی خزانچی بنا دیا۔اس خزانچی نے اس قدر خیانت کی کہ دیکھتے ہی دیکھتے کروڑ پتی بن گیا۔فرخ فرساں کے علاقے میں اس نے ایک شاندار کوٹھی تعمیر کرائی۔لکھنؤ میں اس کوٹھی کے آثار آج بھی موجود ہیں۔

ایک شخص اونٹوں کی دیکھ بھال کے لئے پندرہ روپے کا ملازم تھا۔وہ مؤتمر الدولہ کی سرپرستی میں ہزاروں روپے طوائفوں پر خرچ کیا کرتا تھا۔اس وزیر نے ایسے ایسے لوگوں کی سرپرستی کی کہ ان میں سے کوئی محل سے طلائی زیورات چرا کر بہت دولت مند بن گیا۔کوئی شاہی مطبخ سے محض خوراک کی ہیرا پھیری کے ذریعے لاکھوں روپے حاصل کرتا رہا۔

اس وزیر کے خاص حواری امیر لوگوں' مہاجنوں اور ساہوکاروں سے کسی نہ کسی بہانے رقم بٹورتے رہتے تھے۔غازی الدین حیدر ضعیف الاعتقاد تھا۔بھوت پریت اور جادو ٹونے کو بہت مانتا تھا۔کالکا داس نامی ایک شخص بہت ہی لحیم شحیم' کالا اور بھینگا سا تھا۔مؤتمر الدولہ اسے بادشاہ کی زیارت کرانے محل میں لے کر آیا اور خود کسی کام سے دوسری جگہ چلا گیا۔ایسے ہی وقت بادشاہ غازی الدین حیدر ادھر آنکلا۔

ایک کالے بھینگے اور پہاڑ جیسے قد آور شخص کو دیکھ کر اس نے یہی سمجھا کہ وہ کوئی دیو یا جن ہے۔اس نے چیخ چیخ کر سپاہیوں سے کہا۔''اسے گرفتار کرلیا جائے۔ورنہ یہ دیو ہمیں مار ڈالے گا...''

مؤتمر الدولہ نے فوراً ہی وہاں پہنچ کر بادشاہ سے کہا۔''یہاں کوئی دیو نہیں

ہے۔آپ اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ پھروہ نظر نہیں آئے گا۔"

بادشاہ نے اپنی آنکھیں بند کیں۔ مؤتمر الدولہ نے کالکا داس کو وہاں سے بھگا دیا۔ پھر بادشاہ نے آنکھیں کھولیں تو اس نے کہا۔"وہ سچ مچ کوئی دیو تھا۔ اچانک ہی غائب ہوگیا ہے۔"

غازی الدین حیدر ایک شخص پر بہت مہربان تھا اور یہ بات مؤتمر الدولہ کو پسند نہیں تھی۔ اس نے اس شخص کو دھمکی دیتے ہوئے کہا۔"آئندہ کبھی بادشاہ کے روبرو نہ جاؤ۔ اپنے گھر سے بھی نہ نکلو۔ ورنہ تمہاری زندگی مختصر کردی جائے گی۔"

پھر اس نے بادشاہ سے آکر کہا۔"آپ جس شخص پر بہت مہربان تھے۔ وہ بیچارہ مرگیا ہے۔"

ایک روز وہ شخص اچانک ہی گھر سے نکلا اور بادشاہ کی سواری کے سامنے آگیا۔ بادشاہ نے اسے دیکھتے ہی مؤتمر الدولہ سے کہا۔"تم نے تو کہا تھا کہ یہ مرچکا ہے۔ لیکن یہ تو زندہ ہے؟"

مؤتمر الدولہ نے اپنے حواریوں کو اور درباریوں کو آنکھ کا اشارہ کیا۔ پھر کہا۔" ماشاء اللہ حضور کی چشم بینا عالم ارواح میں اسے دیکھ رہی ہے۔ ہم ایسے کور چشم ہیں کہ اسے نہیں دیکھ پارہے ہیں۔"

سب ہی حواریوں اور درباریوں نے اس بات کی تائید کی۔ اس وقت تک وہ شخص بھیڑ میں گم ہوچکا تھا۔ بادشاہ کو یقین ہوگیا کہ وہ زندہ نہیں ہے۔ وہ اس کی روح کو دیکھتا رہا تھا اور اب وہ روح بھی غائب ہوگئی ہے۔

بادشاہ بیگم کو یہ پسند نہیں تھا کہ غازی الدین حیدر اپنے اُس مکار وزیر پر اندھا اعتماد کرے۔ ایک بار مؤتمر الدولہ نے بادشاہ کے کان بھرے۔"بیگم صاحبہ اپنے معتمد خاص میر فضل علی اور اس کی خالہ فیض النساء پر اندھا اعتماد کرتی ہیں۔ وہ خالہ بھانجے بیچاری بیگم صاحبہ کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ آپ کے خلاف بھی طرح طرح کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ آپ بیگم صاحبہ کو حکم دیں کہ ان دونوں کو محل سے نکال دیں یا میر فضل علی کو میرے حوالے کردیں۔"

غازی الدین حیدر نے بیگم کو حکم دیا۔ لیکن اس نے کہا۔"آپ کا وزیر ناحق ہمارے خیر خواہوں کے خلاف زہر اگل رہا ہے۔ آپ اس بدبخت پر اندھا کرتے رہیں گے تو وہ ایک دن شاہی خزانہ خالی کردے گا۔"

غازی الدین حیدر اپنی بیگم کے آگے ذرا کمزور پڑجاتا تھا۔ لڑجھگڑ نہیں سکتا تھا۔ اس نے ریذیڈنٹ سے کہا۔"محل میں میر فضل علی اور فیض النساء ناپسندیدہ افراد ہیں۔ آپ انہیں محل سے ہی نہیں اس شہر سے اور اودھ کے علاقے سے نکل جانے کا حکم صادر فرمائیں۔"

اس سلسلے میں بادشاہ بیگم، غازی الدین حیدر اور ریذیڈنٹ کے درمیان مذاکرات جاری رہے۔ پھر ریذیڈنٹ کے حکم کے مطابق میر فضل علی اور فیض النساء کو ملک بدر ہونا پڑا۔ لیکن بادشاہ بیگم نے پہلے سے ہی بڑی رازداری کے ساتھ ایسے انتظامات کئے تھے کہ وہ دونوں سپاہیوں کے سامنے شہر سے باہر نکل گئے۔ لیکن بیگم نے انہیں واپس بلالیا اور شہر کے ایک دور افتادہ علاقے میں ان کی رہائش کے انتظامات کردیئے۔

غازی الدین حیدر صبح دولت نامی ایک خادمہ پر عاشق ہوگیا تھا۔ اس کے ساتھ راتیں گزارتا تھا۔ جب بادشاہ بیگم کو یہ معلوم ہوا تو وہ غصے اور جلاپے سے غضبناک ہوگئی۔ ایسے وقت پتہ چلا کہ وہ خادمہ صبح دولت ایک بچے کی ماں بن گئی ہے۔ اس بات نے جلتی پر تیل چھڑکنے کا کام کیا۔ وہ اس ماں بچے پر تیل چھڑک کر آگ لگا دینا چاہتی تھی۔ انہیں جلاکر راکھ کردینا چاہتی تھی۔

میر فضل علی اور فیض النساء نے اسے سمجھایا۔"بیگم صاحبہ! بادشاہ سلامت سے آپ کی کوئی اولاد نہیں ہورہی ہے۔ قدرتی طور پر آپ بانجھ ہیں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں۔ اس بچے کو ضائع نہ کریں۔ اس خادمہ نے ایک بیٹے کو جنم دیا ہے۔ وہ بیٹا آپ کے بہت کام آئے گا۔"

بادشاہ بیگم نے بچے کے معاملے میں ان کی بات مان لی۔ لیکن اس خادمہ صبح دولت کو بڑی بے رحمی سے مرواڈالا اور رازداری سے باغ کے قبرستان میں جو غریبوں کے لئے مخصوص تھا۔ وہاں دفن کرادیا۔ اس نے اس بچے کا نام نصیر الدین حیدر رکھا اور یہ عزم کیا کہ وہ اسے اتنی محبتیں دے گی اور ایسی شفقت سے پیش آئے گی کہ سوتیلے بچے کے ساتھ

مادرانہ محبت اور ممتا کی ایک نادر مثال قائم ہوتی رہے گی۔

مرزا نصیر الدین نے بچپن سے جوانی کی ابتداء تک بادشاہ بیگم کے زیر نگرانی تربیت پائی۔ بیگم اسے محل سے باہر نہیں جانے دیتی تھی۔ اسے ہمیشہ عورتوں کی صحبت میں رکھا کرتی تھی۔ حتیٰ کہ اسے اکثر زنانہ لباس پہنایا کرتی تھی۔ جب تک وہ کم سن اور نادان رہا۔ تب تک ماں کے اشاروں پر چلتا رہا۔ پھر بادشاہ بیگم سے بیزار ہونے لگا۔ اس سے اختلافات پیدا ہونے لگے۔

مرزا نصیر الدین کی ایک کمزوری تھی، اگرچہ اس میں مردانگی تھی اور وہ ازدواجی زندگی گزارتا رہا۔ لیکن قدرتی طور پر بانجھ تھا۔ باپ نہیں بن سکتا تھا۔ بادشاہ بیگم کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ نصیر الدین سے اولاد نہ ہوئی تو اس کے شوہر غازی الدین حیدر کی دوسری بیوی سے یعنی اس کی سوکن سے ہونے والا بیٹا محمد علی شاہ کو اقتدار حاصل ہو جائے گا۔

اس کا خیال تھا کہ کسی نہ کسی عورت سے نصیر الدین کی اولاد ہو سکتی ہے۔ لہٰذا وہ کنیزوں کو اس کے پاس بھیجتی رہتی تھی۔ ایک خادمہ کا نام سکھ چین تھا۔ اس نے پچیس ماہ تک حاملہ رہنے کے بعد ایک بیٹے کو جنم دیا اگرچہ یہ مضحکہ خیز بات ہے۔ مگر اس وقت بادشاہ بیگم نے خوش ہو کر شایان شان جشن منانے کا حکم دیا۔ اس نے یہ خوشخبری بادشاہ حیدر تک پہنچائی۔ وہ ناگواری سے بولا۔ ''کیا بکواس ہے؟ کیا انسان کے بچے پچیس ماہ میں پیدا ہوتے ہیں؟''

اس نے اس پیدا ہونے والے بچے کو نصیر الدین حیدر کا بیٹا اور اپنا پوتا ماننے سے انکار کر دیا اور اپنے مخبروں کو حکم دیا کہ وہ اس سلسلے میں حقیقت معلوم کریں۔ مؤتمر الدولہ تو بادشاہ بیگم سے عداوت رکھتا ہی تھا۔ اس لئے وہ صحیح معلومات حاصل کرنے لگا۔

ریذیڈنٹ نے بادشاہ سے ایک ملاقات میں کہا۔ ''آپ کے محل سے ایک بہت بڑی خوشخبری سننے میں آئی ہے۔ آپ ایک پوتے کے دادا بن چکے ہیں۔ آپ نے ہمیں اطلاع کیوں نہیں دی؟''

بادشاہ نے کہا۔ ''ہمیں پتہ چلا ہے کہ وہ بچہ ایک دھوبن کے بطن سے ہوا ہے اور کچھ عرصہ پہلے اس دھوبن کو اغواء کیا گیا تھا۔ اسے اس محل میں لایا گیا تھا۔ تاکہ وہ یہاں اس

بچے کو جنم دے۔ چونکہ ہم اسے اپنا پوتا تسلیم نہیں کر رہے ہیں۔ اس لئے آپ کو یہ خوشخبری نہیں سنائی۔''

ریذیڈنٹ نے یہ تمام تفصیلات اپنی گورنمنٹ کے پاس کلکتہ روانہ کر دیں اور گورنر جنرل کو لکھا۔ ''باپ تو بچے کو تسلیم کرتا ہے۔ مگر دادا تسلیم نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ مرزا نصیر الدین اس بچے کا باپ نہیں ہے۔ اس معاملے کو سمجھنا بہت دشوار ہے اور یہ سمجھنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے کہ دونوں باپ بیٹے کے بیانات میں اختلاف کیوں ہے؟''

مسٹر مین کلف سیکرٹری آف خارجہ نے ریذیڈنٹ کے اس مراسلے کا جواب یوں لکھا۔ ''آپ کی تحریر سے ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ نصیر الدین کے گھر ایک بچہ پیدا ہوا ہے۔ جسے بادشاہ تسلیم کرنے سے منکر ہے۔ کسی موقع پر جانشینی کا قضیہ کھڑا ہو سکتا ہے۔ اس لئے ہم پر واجب ہے کہ یہ تفتیش کریں' آیا وہ نصیر الدین ہی اس بچے کا اصلی باپ ہے؟ اس کے علاوہ گورنر جنرل امید کرتے ہیں کہ بادشاہ اودھ بھی اصل حقیقت دریافت کریں اور شکوک و شبہات مٹانے کے سلسلے میں ہر ممکن کوشش کریں۔''

اس سلسلے میں جو رپورٹ تیار کی گئی۔ وہ یہ تھی کہ بادشاہ بیگم کے بیان کے مطابق وہ بچہ پچیس ماہ میں پیدا ہوا تھا اور یہ بات سراسر مضحکہ خیز ہے۔

یہ بات ہر خاص و عام میں مشہور ہے کہ نصیر الدین حیدر قدرتی طور پر بانجھ ہے۔ وہ کسی بھی عورت سے صحبت تو کر سکتے ہیں۔ لیکن بچوں کے باپ نہیں بن سکتے۔

اور یہ کہ بادشاہ بیگم مایوس ہو گئی تھیں۔ مرزا نصیر الدین سے کوئی اولاد نہیں ہو رہی ہے۔ لہٰذا اس بچے کو حاصل کر لیا گیا۔ تاکہ ریکارڈ میں یہ بات آئے کہ وہ بے اولاد نہیں تھا۔ ایک بچے کا باپ بن گیا تھا۔ وہ اس بچے کو ولی عہد تسلیم کرانا چاہتی ہیں۔

کچھ ایسے اشخاص تھے' جو اس سلسلے میں حقائق سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان میں سے ایک شخص پرورش خاں نے بیان دیا۔

''مُنیا نام کی ایک دھوبن تھی۔ جو میرے ہاں کام کیا کرتی تھی۔ وہ کپڑے دھو کر میرے گھر لائی۔ اس وقت بادشاہ بیگم کی ملازمہ بی بی بوڑھی خانم جسے لوگ عام طور سے امانی خانم کہتے تھے، موجود تھی۔ اس نے میرے سامنے مُنیا سے کہا' تیرے پیٹ میں بچہ

ہے۔لیکن شوہر سے تیری نہیں بنتی۔محل میں ایک حاملہ عورت کی تلاش ہے۔اس لئے میں تجھے بادشاہ بیگم کے پاس لے جاؤں گی۔تیرے لڑکا پیدا ہوگا تو سارے عیش و آرام کے سامان تیرے لئے مہیا کئے جائیں گے۔یعنی ایک عالیشان محل' خادماؤں کی ایک فوج' نفیس اور عمدہ کپڑے۔بہترین کھانے اور عیش و راحت کے دوسرے لوازمات سب کچھ تجھے نصیب ہوں گے۔

چونکہ مُنیا اپنے شوہر سے بہت بیزار تھی۔اس نے خانم کی اس تجویز کے مطابق عمل کیا۔پھر اس کے ساتھ ایک پردہ دار محافہ میں سوار ہوکر محل میں چلی گئی۔اس کے بعد میں نہیں جانتا کہ وہاں کیا ہوتا رہا؟''

ایک اور شخص نے بیان دیا۔''میں امانی خانم کا ملازم ہوں۔وہ ایک حاملہ عورت کو بادشاہ بیگم کے محل میں لے گئی تھی۔مجھے محل کی ڈیوڑھی تک ساتھ چلنے کو کہا تھا اور میں اس کے ساتھ گیا تھا۔''

اس سے پوچھا گیا۔''مُنیا کے محل میں لے جانے کے کتنے دن بعد تمہیں معلوم ہوا کہ اس نے بچے کو جنم دیا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔''پندرہ یا سولہ دن کے بعد....''

مہتاب نامی ایک دائی نے بیان دیا۔''بادشاہ بیگم نے مجھے بلوایا تھا۔محل میں ٹھہرایا تھا۔انہوں نے کہا تھا کہ صاحب عالم مرزا نصیر الدین کی خادمہ سکھ چین حاملہ ہے۔مجھے اس کے ساتھ رہنا چاہئے۔پتہ نہیں کس وقت زچگی ہو جائے۔''

''میں رات کو اس کے ساتھ ایک ہی بستر پر سوئی۔جب وہ گہری نیند سو رہی تھی تو میں نے اس کے پیٹ کو ٹٹولا۔یہ معلوم کرنا چاہا کہ بچہ کس حالت میں ہے؟ لیکن مجھے اس کے حاملہ ہونے کے کوئی آثار معلوم نہیں ہوئے۔

نو ماہ گزر جانے کے بعد بادشاہ بیگم نے مجھ سے خفا ہوکر پوچھا۔''تم کیسی دائی ہو؟ اب تک بچہ کیوں نہیں پیدا کروا رہی ہو؟''

میں نے کہا۔''پیٹ میں جب بچہ ہی نہ ہو تو میں کیسے پیدا کرواسکتی ہوں؟''

میرے اس جواب پر بیگم غصے سے اور مشتعل ہوگئیں۔انہوں نے ملازموں کو حکم

دیا کہ مجھے حجرے میں لے جا کر بند کر دیا جائے۔میں وہاں سات دنوں تک رہی۔ایک رات بادشاہ بیگم کی معتمد خاص فیض النساء میرے پاس آئی اور کہا' فوراً چلو سکھ چین کو درد زہ ہو رہا ہے۔کسی لمحے میں بھی زچگی ہو سکتی ہے۔

میں اس کے ساتھ گئی۔وہاں جا کر سکھ چین کو دیکھا تو پھر مجھے بچے کی کوئی علامت دکھائی نہیں دی۔مگر میں نے کچھ نہیں کہا۔بادشاہ بیگم کے خوف سے خاموش رہی۔فیض النساء نے مجھے مشورہ دیا کہ میں حقہ پینا چاہوں تو باہر جا سکتی ہوں۔میں باہر چلی آئی۔کوئی ایک گھڑی بعد یہ شور سنا کہ بچہ پیدا ہوگیا ہے۔

میں بڑی حیران ہوئی اور اندر محل میں لوٹ آئی۔فیض النساء اور محل کی دوسری خواتین بچے کو میرے پاس لائیں۔میں نے اس بچے کی نال کاٹی۔پھر مجھے ایک جوڑی پکھراج اور ایک ہزار روپیہ انعام ملا۔پھر میں نے تیل مانگا تاکہ حسب رواج زچہ کی مالش کروں۔مگر بادشاہ بیگم نے کہا کہ یہ سب غریب طبقوں میں ہوتا ہے۔امراء کے ہاں اس کا رواج نہیں ہے۔

میرے انعام میں سے فیض النساء نے دو سو روپے لے لئے اور آٹھ سو میرے لئے چھوڑ دیئے۔جب غازی الدین حیدر شاہ نے مجھے طلب کیا اور اس معاملے کے بارے میں دریافت کیا تو میں نے یہی بیان ان کے سامنے بھی دیا۔''

بادشاہ غازی الدین حیدر کے ایک پرانے خادم دلاور خان نے بیان دیا۔''جب مُنیا دھوبن کو قید میں رکھا گیا تو مجھے حکم دیا گیا کہ میں اس کی نگرانی کرتا رہوں۔میں نے مُنیا سے پوچھا' تو کیوں پکڑی گئی ہے؟

اس نے جواب دیا۔''میں پیرا دھوبی کی عورت ہوں۔پیٹ سے تھی کہ بادشاہ بیگم کی خادمہ امانی بیگم مجھے دھوکے سے محل میں لے آئی۔میں نے وہاں بچہ جنا۔اس کے بعد مجھے پتہ نہ چلا کہ میرا بچہ کہاں چلا گیا؟ میں نے نو ماہ تک بوجھ اٹھا کر پیٹ خالی کیا اور خالی ہاتھ ہی رہ گئی۔''

دلاور خان نے کہا۔''مجھے پیرا دھوبی کی عورت نے یہی بیان دیا تھا۔اب کچھ عرصے سے میں کانپور میں رہتا ہوں۔جب مجھے بلا کر یہ حکم دیا گیا کہ میں ایک لاش کو

دیکھوں تو میں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ وہ مُنیا دھوبن کی لاش تھی۔''

بادشاہ بیگم نے اپنے سوتیلوں سے اقتدار اور بادشاہت کو دور رکھنے کے لئے بڑا زبردست چکر چلایا تھا۔ بادشاہ غازی الدین حیدر سے لے کر انگریز حکمرانوں تک سب ہی کو الجھا کر رکھ دیا تھا۔ اس سلسلے میں بڑی دور تک چھان بین ہو رہی تھی۔ بادشاہ بیگم کی پرانی خادمہ خانم مغلانی نے بعد میں یہ بیان دیا۔ ''میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ سکھ چین کبھی حاملہ نہیں ہوئی تھی۔ اس نے کوئی بچہ پیدا نہیں کیا تھا۔ بادشاہ بیگم کی مرضی یہی تھی کہ سکھ چین کے بارے میں یہ اعلان کر دیا جائے کہ وہ اس بچے کی ماں ہے۔ اب میری بات کا کوئی یقین کرے یا نہ کرے۔ اس بچے کو مُنیا دھوبن نے ہی جنم دیا تھا۔''

بادشاہ بیگم نے بہت پہلے غازی الدین حیدر کو یہ خوشخبری سنائی تھی کہ آپ ایک پوتے کے دادا بننے والے ہیں۔ بادشاہ نے پہلے تو خوشی کا اظہار کیا۔ پھر جب کئی ماہ گزرنے لگے اور وہ بچہ پچیس ماہ کے بعد پیدا ہوا تو بادشاہ نے حیرانی سے پوچھا تھا کہ کیا انسان کے بچے پچیس ماہ میں پیدا ہوتے ہیں؟

بادشاہ بیگم نے جواب دیا تھا۔ ''بچہ تو پیدا ہونے کو تیار تھا۔ مگر جنات اور بدروحیں اسے پیدا ہونے نہیں دیتی تھیں۔ خدا کا شکر ہے' اب اس نے جنم لیا ہے۔''

اس سلسلے میں نصیر الدین حیدر کا قصہ یہ ہے کہ وہ ایک دن اچانک محل کے اندر آیا تو وہاں میر فضل علی کو اپنی داشتہ سکھ چین کے ساتھ ایسی حالت میں دیکھا کہ غصے سے بے قابو ہو گیا۔ اسی وقت ان دونوں کو جان سے مار ڈالنا چاہتا تھا۔ لیکن میر فضل علی فوراً ہی وہاں سے فرار ہو گیا۔

بادشاہ بیگم نے سکھ چین کو اس کے عتاب سے بچایا اور نصیر الدین کو سمجھایا۔ ''بیٹے! جو ہو رہا ہے' ہونے دو۔ تم سے اولاد نہیں ہو رہی ہے۔ آگے چل کر ایک ولی عہد لازمی ہو گا۔ جو چیز ہمیں سیدھے راستے سے حاصل نہیں ہو رہی ہے۔ اسے چور دروازے سے حاصل کرنا ہی ہو گا۔''

نصیر الدین حیدر نے بادشاہ بیگم سے تو کچھ نہ کہا۔ لیکن غصے سے مشتعل ہو کر محل چھوڑ کر چلا گیا۔ اس نے جس دن وہ شرمناک فعل دیکھا تھا۔ اس کے پچیس ماہ کے بعد یہ خبر

ا کہ سکھ چین نے ایک بچے کو جنم دیا ہے اور اس بچے کا نام فریدوں بخت رکھا گیا۔

مرزا نصیر الدین حیدر نے اپنے باپ کے سامنے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ''امی ضور (بادشاہ بیگم) نے ہمیں سمجھایا تھا کہ ہم سکھ چین سے ہونے والے فریدوں بخت کو اپنا بیٹا سلم کر لیں۔ اس طرح وہ ولی عہد کہلائے گا اور ہمارا سوتیلا بھائی سعادت علی خاں اقتدار سے حروم رہے گا..... اس وقت تو ہم نے تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن اب ہم صحیح وقت پر آپ پر سچائی ظاہر کر رہے ہیں۔''

غازی الدین نے فوراً ہی گورنر جنرل کو لکھ بھیجا۔ ''ہمارے صاحبزادے مرزا نصیر الدین حیدر خراب اثرات کے تحت آ گئے تھے اور یہ کہ جو کچھ انہوں نے کیا' وہ دوسروں کے ورغلانے سے کیا تھا۔''

ریذیڈنٹ نے کہا۔ ''کوئی بات نہیں۔ ایسے جوان اکثر جوشِ جوانی میں راہ راست سے بھٹک جاتے ہیں۔ ہمارے لئے یہ بات تسلی بخش ہے کہ ولی عہد کی سچ بیانی سے حقیقت سامنے آ گئی۔''

گورنر جنرل نے اس حق گوئی پر اس کی تعریف کی اور ریذیڈنٹ کو حکم بھیجا کہ نصیر الدین لاولد ہے۔ آئندہ یہ مناسب ہو گا کہ سعادت علی خاں کے موجودہ بیٹوں میں سے جو سب سے بڑا بیٹا ہے۔ اسے تخت نشینی کے لئے نامزد کر دیا جائے۔

ایسے ہی معاملات کے دوران غازی الدین حیدر نے وفات پائی۔ اسی وقت ساڑھے نو بجے رات کو نصیر الدین نے تخت نشین ہو کر ریذیڈنٹ سے کہا۔ ''تمام خرابی کا باعث مؤتمر الدولہ ہے۔ اس کی برخاستگی اور گرفتاری کے بغیر نظام سلطنت مناسب طور پر نہیں چلایا جا سکتا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اسے بڑی رازداری سے گرفتار کیا جا سکتا ہے۔''

گرفتاری کے سلسلے میں یہ بات اس قدر راز میں رکھی گئی کہ مؤتمر الدولہ اچھے خاصے اختیارات اور وسیع ذرائع رکھنے کے باوجود اپنے خلاف ہونے والے ایسے اقدامات سے بے خبر رہا۔ نصیر الدین حیدر نے اسے طلب کر کے ایک خلعت دکھاتے ہوئے کہا۔ ''جونہی کلکتے سے اجازت نامہ آئے گا۔ تمہیں وزارت عظمیٰ کا خلعت عطا کیا جائے گا۔''

وہ اس بات سے بہت مطمئن ہوا۔ یہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی شامت

آ گئی ہے۔ ریذیڈنٹ نے اسے طلب کیا۔ پھر جیسے ہی وہ اس کے روبرو پہنچا تو انگریز سپاہیوں نے اسے گھیر لیا اور کہا کہ اپنی تلوار ہمارے حوالے کرو۔ ورنہ مارے جاؤ گے۔

وہ اب تک مرحوم غازی الدین حیدر کو لوٹتا رہا تھا۔ مرزا نصیرالدین نے تخت نشین ہوتے ہی اسے اس کے برے انجام تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد اسے بادشاہ بیگم سے بھی حساب چکانا تھا۔ اب وہ سوتیلی ماں کے ہاتھوں میں کھیلنے والا نادان بچہ نہیں رہا تھا۔ اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اس سوتیلی نے اس کی سگی ماں کو ہلاک کرایا ہے۔ اس نے بادشاہ بیگم کو حکم دیا کہ وہ محل چھوڑ کر کسی دوسری جگہ اپنی رہائش اختیار کرے۔

بیگم نے جواب۔ ''یہ محل ہمارے شوہر نے ہمیں دیا ہے۔ ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ اسے خالی کریں۔''

بادشاہ نے ریذیڈنٹ سے کہا۔ ''ہم بیگم سے اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے کہ وہ محل خالی کر دیں۔ برائے مہربانی آپ اس سلسلے میں ہماری مدد فرمائیں۔''

ریذیڈنٹ نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ یہ ذاتی اور نجی معاملہ ہے۔ صدر مقام کلکتہ سے مجھے احکامات ملے ہیں کہ میں صرف معاملات سلطنت میں دخل دے سکتا ہوں۔ اس لئے کوئی اور کام کرنے کی جسارت نہیں کروں گا۔''

بادشاہ بیگم سے نفرت بڑھتی جا رہی تھی۔ ان دنوں کئی مزدور مرد اور عورتیں شاہی عمارتوں کی تعمیر کے کام پر لگے ہوئے تھے۔ بادشاہ نے انہیں حکم دیا کہ وہ سب عمارت کی چھتوں پر چڑھ جائیں۔ وہاں سے بیگم کے محل کے اندرونی کمرے دکھائی دیتے تھے۔ اس نے ان سب کو حکم دیا کہ چھت پر کھڑے ہو کر بیگم کو ایسی ایسی گالیاں دیں کہ وہ غصے سے محل چھوڑ کر چلی جائے۔

وہ شان و شوکت اور رعب و دبدبے سے رہنے والے اور بادشاہ کہلانے والے ایسی ایسی بچکانہ حرکتیں کرتے تھے کہ اب وہ حرکتیں تاریخ میں مضحکہ خیز واقعات بن گئی ہیں۔

بادشاہ بیگم گالیاں سن کر بھی نہ گئی تو اس نے حکم دیا کہ مٹی کی ہانڈیوں میں غلاظت بھر بھر کر محل کے اندر پھینکی جائے۔ عجیب تعفن پیدا کرنے والا حکم تھا۔ مزدور مجبور تھے' حکم کے بندے تھے۔ انہوں نے یہ بھی کیا۔ بادشاہ بیگم نے بڑے صبر و استقلال سے یہ زیادتی بھی

برداشت کی۔

جب بادشاہ نے دیکھا کہ اس قدر ستانے اور اذیتیں دینے کے باوجود وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہی ہے تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کسی بھی خاتون کے ساتھ اس سے زیادہ اور برا برتاؤ کیا کیا جا سکتا تھا؟ اس کا دلی مقصد پورا نہیں ہوا تو اس نے اپنے تابعدار راجہ شیوادین کو حکم دیا کہ وہ سپاہیوں کو لے کر جائے اور بیگم کی عزت و حرمت' حیثیت اور درجے کا لحاظ کئے بغیر محل خالی کرائے۔

راجہ شیوا نے محل کے اس حصے میں سپاہیوں کا پہرہ لگا دیا۔ جہاں بادشاہ بیگم کی رہائش تھی۔ اس نے بیگم کے ملازمین میں سے گیارہ کو گرفتار کر لیا۔ جو بھی محل سے باہر آتے تھے۔ انہیں گرفتار کر لیا جاتا تھا۔ اس نے محل میں اناج کی ترسیل بند کر دی۔ پانی تک بند کر دیا۔ سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ محل کی دیواروں پر چڑھ جائیں اور وہاں سے اندر جا کر محل کا دروازہ کھول دیں۔

جب وہ دیواروں پر چڑھنے لگے تو بادشاہ بیگم کی مغلانیوں اور حبشی غلاموں نے اینٹوں' پتھروں اور لکڑی کے ٹکڑوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اس حملے سے کتنے ہی زخمی ہو کر واپس چلے آئے۔

بادشاہ بیگم بہت ہی ضدی اور مستقل مزاج تھی۔ محل خالی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن مسلسل بھوک پیاس نے اسے مجبور کر دیا۔ وہ نڈھال سی ہو کر راجہ شیوا سے حفاظت کی طالب ہوئی اور کہا۔ ''ہم الماس باغ میں منتقل ہونے کو تیار ہیں۔ ہم سب کو سلامتی سے جانے دیا جائے۔''

بادشاہ کے حکم سے انہیں فوراً ہی وہاں پہنچا دیا گیا۔ الماس باغ کے مکانات چونکہ خالی پڑے ہوئے تھے۔ ان کی مرمت بھی نہیں کی گئی تھی۔ اس لئے نہ ہی وہاں روشنی تھی۔ نہ اٹھنے بیٹھنے اور لیٹنے کے لئے تخت اور بستر کا انتظام تھا۔ بادشاہ بیگم نے کچھ کھائے پیئے بغیر فریدوں بخت کے ساتھ کسی طرح وہ رات گزاری۔ دوسری کنیزوں اور ملازموں نے بھی وہ ساری رات جاگ کر گزار دی۔

دوسرے دن کھانے پینے کی سہولتیں حاصل ہوئیں تو بادشاہ بیگم نے پوری طرح

غور وفکر کے بعد ایک نیا منصوبہ بنایا۔اس نے امام بخش بہشتی کو حکم دیا کہ وہ خفیہ طور پر آزمودہ اور جنگجو جوانوں کی ایک اچھی خاصی فوج تیار کرے۔وہ محل سے آتے وقت ہیرے، جواہرات اور سونے کی اچھی خاصی اینٹیں صندوق میں چھپا کر لے آئی تھی۔ابھی اتنی دولت تھی کہ وہ ایک چھوٹی سی فوج تیار کر سکتی تھی۔

فوج چھوٹی ہو یا بڑی۔اسے چھپا کر نہیں رکھا جا سکتا۔بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے اور ریذیڈنٹ نے فوراً ہی اس بات پر اعتراض کیا۔بادشاہ بیگم نے کہا۔"ہم جس علاقے میں رہتے ہیں۔وہ بالکل سنسان اور اجاڑ سا ہے۔اس لئے ہم یہ مختصری فوج رکھنے پر مجبور ہیں۔یہاں چور ڈاکو ہنگامہ کرتے رہتے ہیں۔ہمیں اپنی حفاظت کا حق حاصل ہونا چاہئے۔"

انہوں نے بادشاہ بیگم کے سازشی ذہن کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ریذیڈنٹ نے ایک پیغام رساں کے ذریعے اسے کہا۔"اگرچہ میں نجی اور ذاتی معاملات میں کوئی دخل دینا نہیں چاہتا۔لیکن اب معاملہ بہت بڑھ گیا ہے۔یہاں دنگا فساد برپا ہوگا تو رعایا کے لئے خطرہ پیدا ہوگا۔اس علاقے میں امن وامان قائم رکھنا ہمارا فرض ہے۔

سپاہیوں کی اتنی بڑی تعداد کو سربراہ سلطنت کی رضامندی کے بغیر رکھنا بے جا اور نامناسب ہے۔لہٰذا سپاہیوں کو برطرف کیا جائے۔اپنی حفاظت کے لئے صرف چار سو یا پانچ سو سپاہی رکھے جائیں۔اگر اس حکم کی تعمیل نہیں کریں گی تو بادشاہ نصیرالدین کے ساتھ کمپنی کی فوج بھی متحد ہو کر حملہ کرے گی۔پھر انجام کیا ہوگا؟ یہ آپ خوب سمجھ سکتی ہیں۔"

بادشاہ بیگم اپنے مسلح سپاہیوں کے ساتھ بادشاہ نصیرالدین کی فوج سے مقابلہ کر سکتی تھی۔لیکن انگریز فوج سے ٹکرانے کی جرات نہیں کر سکتی تھی۔اس نے کہا۔"ہم احکامات کی تعمیل کریں گے۔اگر ریذیڈنٹ ہمارا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ہمارے مرحوم شوہر نے جو جاگیر ہمیں عطا کی تھی۔اسے دوبارہ حاصل کرنے میں ہماری مدد کریں تو ہم اپنی باقی ماندہ زندگی اسی جاگیر میں گزار دیں گے۔"

ریذیڈنٹ نے کہا۔"ہم بادشاہ کو راضی کریں گے۔آپ کی جاگیر آپ کو واپس ملے گی۔"

لیکن ان معاملات پر عمل کرنے سے پہلے ہی بادشاہ نصیرالدین کے دن پورے ہوگئے۔اس کی زندگی کا چراغ اچانک ہی گل ہوگیا۔

فرسٹ اسسٹنٹ کیپٹن جیمس پاٹن اپنے سپاہیوں کی ایک کمپنی کے ساتھ امن وقائم رکھنے کی غرض سے وہاں پہنچ گیا۔ریذیڈنٹ نے کوٹھی کے دروازے پر اور آنے جانے کے دوسرے تمام راستوں پر مسلح گارڈز اس ہدایت سے تعینات کر دیئے کہ کوئی شخص ادنیٰ ہو یا اعلیٰ اندر نہ جانے پائے۔پھر بادشاہ بیگم کو یہ ہدایت بھیجی کہ وہ موجودہ حالات میں اپنی چار دیواری کے اندر رہے اور کسی حالت میں بھی وہاں سے باہر نہ آئے۔

مرزا نصیرالدین نے اپنی زندگی میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ فریدوں بخت اس کا بیٹا نہیں ہے۔ریذیڈنٹ نے گورنر جنرل کے حکم کے مطابق سعادت علی خاں کے پوتے امجد علی شاہ کو جانشینی کے لئے منتخب کر لیا تھا۔اس لئے فوراً اس نے اپنے دوسرے اسسٹنٹ جان شیکسپیر اور امیرالانشاء التفات حسین کو تحریری دستاویز مہر شدہ کے ساتھ امجد علی شاہ کی قیام گاہ پر بھیج دیا۔

ملازموں نے آدھی رات کو انہیں دیکھا تو حیران رہ گئے۔پھر بھی انہوں نے امجد علی شاہ کو جگا دیا۔جب وہ باہر آیا تو ان لوگوں نے اس کی تخت نشینی کی مبارکباد دی۔یہ خبر سنتے ہی اس نے جوش مسرت میں انہیں گلے لگا لیا۔پھر اس تخت نشینی کے کاغذ پر اپنی مہر ثبت کر دی۔

ان حالات میں بادشاہ بیگم چپ بیٹھنے والی نہیں تھی۔اب اس نے آٹھ یا نو سو سپاہیوں ایک فوج بنا رکھی تھی۔اس فوج کے سپاہی جاہل، ناتجربہ کار اور لوٹ مار کرنے والے دیہاتی تھے۔بادشاہ بیگم نے فریدوں بخت کو ساتھ لے کر شاہی محل کی طرف کوچ کیا۔

ریذیڈنٹ نے اپنی فوج کی پوزیشن معلوم کی تو پتہ چلا کہ شاہی فوج سڑکوں پر گشت کرنے اور حملہ آروں کو روکنے کے لئے معمور نہیں کی گئی ہے۔اس نے حکم دیا کہ بادشاہ بیگم نے محل تک پہنچنے کے لئے جو سڑک اختیار کی ہے، وہاں پہنچ کر انہیں آگے بڑھنے سے روکا جائے۔

لیکن بیگم دوسرے راستے سے محل کے سامنے پہنچ گئی۔اس کے سپاہی اپنے ساتھ ایک ہاتھی لائے تھے۔اس ہاتھی نے محل کے دروازے پر ٹکریں ماریں تو وہ دروازہ ٹوٹ

گیا۔ بڑی ہلچل اور افراتفری پھیلنے لگی۔ محل کے اس حصے میں شاہی لشکر کے سپاہی برائے نام تھے۔ وہ ان کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ان میں سے کچھ مارے گئے اور کچھ بھاگ گئے۔ انہوں نے فتح کی خوشی میں ناچتے گاتے ہوئے فریدوں بخت کو تخت شاہی پر لا کر بٹھا دیا۔

وہیں محل میں مرزا نصیر الدین کی میت رکھی ہوئی تھی۔ اس کی تدفین سے زیادہ سیاسی فسادات لازمی ہو گئے تھے۔ دوسرا دن نکل آیا۔ بادشاہ بیگم نے اپنے وکیل مرزا علی خاں کو بھیج کر ریذیڈنٹ کو بلایا۔ جب وہ محل میں آیا تو بادشاہ بیگم نے بڑے فخر سے اس کا استقبال کیا۔ ریذیڈنٹ نے اسے سمجھایا۔ ”آپ کی بہتری اسی میں ہے کہ آپ واپس چلی جائیں۔ برٹش گورنمنٹ نے جسے تخت نشینی کی اجازت دی ہے۔ وہی یہاں کا بادشاہ ہوگا۔“

اس وقت بادشاہ بیگم کے سپاہی تخت نشینی کی خوشی میں فریدوں بخت کو نذرانے پیش کر رہے تھے اور ریذیڈنٹ کو طعنے دے رہے تھے۔ انہوں نے مذاق اڑانے کے انداز میں اسے بھی نذرانہ پیش کیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے نذر لینے سے انکار کر دیا۔ ان میں سے ایک نے ریذیڈنٹ کو ضرب لگائی۔ اسے گالیاں بھی دیں۔ وہ خاموشی سے برداشت کرتا رہا۔ ایک سپاہی نے اسے قتل کرنا چاہا۔ لیکن وکیل نے اسے اس فعل سے باز رکھا۔ دوسرے باغی نے بندوق سے فائر کیا۔ وہ سنسناتی ہوئی گولی ریذیڈنٹ کے کاندھے کے پاس سے گزر گئی۔

بادشاہ بیگم نے کہا۔ ”آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے لوگوں میں کتنا جوش اور اشتعال پھیلا ہوا ہے۔ ہم جیت چکے ہیں۔ ہمارے مرحوم بیٹے مرزا نصیر الدین کا بیٹا فریدوں بخت تخت نشین ہو چکا ہے۔ اپنے گورنر جنرل سے جا کر کہیں کہ وہ فریدوں بخت کی بادشاہت کو قبول کر لیں اور اس کی سرپرستی فرمائیں۔“

ریذیڈنٹ ہاں کے انداز میں سر ہلا کر ان باغیوں اور سرپھروں کے درمیان سے نکل آیا۔ باہر انگریز فوج تیار کھڑی تھی۔ اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ مسلسل فائر کرتے ہوئے محل میں گھس جائیں۔ جو لوگ حملے کی تاب نہ لا کر جان بچانے کے لئے بھاگنا چاہیں تو انہیں روکا نہ جائے۔ ان بلاؤں کو بھاگنے دیا جائے۔

جب وہ سپاہی فائرنگ کرتے ہوئے اندر آنے لگے تو بادشاہ بیگم کے سپاہی بوکھلا

گئے۔ وہ تجربہ کار سپاہی نہیں تھے اور نہ ہی انہوں نے نشانہ بازی کی مشق کی تھی۔ وہ سب یا تو مارے جانے لگے یا جان بچا کر بھاگنے لگے۔ بارہ دری کے ملحقہ مکان میں مرزا نصیر الدین کا جنازہ رکھا ہوا تھا۔ بادشاہ بیگم چھپنے کے لئے فریدوں بخت کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔

ذرا سی دیر میں میدان صاف ہو گیا۔ انگریز سپاہی نے بارہ دری میں آ کر فریدوں بخت کو حراست میں لے کر ہتھکڑیاں پہنا دیں اور بادشاہ بیگم کو پالکی میں بیٹھنے کے لئے کہا۔ پھر وہ انہیں ریذیڈنسی تک لے گئے۔ ان معاملات سے نمٹنے کے بعد مرحوم بادشاہ مرزا نصیر الدین کی میت کی تدفین کے سلسلے میں آخری رسومات ادا کی گئیں۔

ان دنوں بادشاہ بیگم کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی۔ اس نے اپنے خسر سعادت علی خاں اپنے شوہر غازی الدین حیدر اور اپنے بیٹے نصیر الدین حیدر کے زمانے دیکھے تھے۔ اسے فریدوں بخت کے ساتھ بنارس سے چھ میل دور چنار گڑھ کے قلعہ میں نظر بند رکھا گیا۔ یہ قلعہ بہت مضبوط تھا۔ اس کے چاروں طرف گہری خندقیں کھدی ہوئی تھیں۔ ایسا نہ بھی ہوتا' تب بھی بادشاہ بیگم میں اتنا دم خم نہیں رہا تھا کہ وہ وہاں سے باہر نکلتی اور پھر سے سازش کرنے کا حوصلہ کرتی۔

اس نے اپنا شاہانہ اقتدار اور رعب و دبدبہ قائم رکھنے کے لئے پہلے سوتیلے بیٹے مرزا نصیر الدین کو اپنا مہرہ بنایا۔ اس کے بعد ایک مُنیا دھوبن سے ہونے والے بچے کو پال پوس کر تخت پر بٹھانا چاہا۔ اس نے خوب سازشیں کیں۔ کئی کامیابیاں حاصل کیں۔ لیکن انجام کار اسے جنم قید ملی۔ اس گرم مزاج رکھنے والی اور سازشوں کے جال بچھانے والی کی عمر اسی قلعے میں تمام ہو گئی۔

دنیا کی تمام طاقتیں' اقتدار اور دولت سمیٹنے والے یہ کبھی سوچنے سمجھنے کی زحمت نہیں کرتے کہ خالی ہاتھ آئے ہیں۔ ایک دن خالی ہاتھ بڑے بے آبرو ہو کر اس دنیا کے کوچے سے جائیں گے۔

☆☆☆

ایک کہاوت بڑی مشہور ہے کہ ”پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آ جاتے ہیں۔“
امجد علی شاہ کا بیٹا واجد علی شاہ جب پیدا ہوا تو چند برسوں بعد ہی والدین کو اندازہ

ہوگیا کہ وہ ننھا ولی عہد ماں کی گود کے بجائے جوان کنیزوں کی نرم گرم آغوش میں سونے کا دلدادہ ہے۔اسے ممتا بھری لوریاں نہیں بھاتی تھیں۔

وہ زمانہ نونہال سے ہی خادماؤں کی مترنم اور سریلی گنگناہٹ سن کر سونے کا عادی تھا۔کھلونوں اور دوسرے مشاغل سے بہلنے کے بجائے رقص وسرود سے بہلتا اور خوش ہو ہو کر تالیاں پیٹتا رہتا تھا۔اس کا لڑکپن حرم سرا میں ہی گزرا۔وہاں کی رنگینیوں میں ولی عہد کی ننھے ننھے قہقہے گونجتے رہتے تھے۔دن بھر اس کے آس پاس حسیناؤں کا میلہ لگا رہتا تھا۔

اُس میلے میں جھولتے ہوئے جب نوجوانی کی لُو لگنے لگی تو من موجی عشق ومحبت کی پینگیں بڑھانے کے لئے مچلنے لگا۔

طبیعت نے پیدا کئے اور رنگ
پسند آئے دل کو حسینوں کے ڈھنگ

عشرت کدے میں سینکڑوں شعلہ رخسار حسینائیں اس کی دلجوئی کے لئے موجود رہا کرتی تھیں۔شام کو منظور نظر بننے والی رات کے تمام ہوتے ہی اُترن کی طرح اس کی نظروں سے اُتر جاتی تھی۔شاہی محلوں میں بیگمات اور کنیزوں کے لئے شاندار حرم سرا تعمیر کئے جاتے تھے۔مگر واجد علی شاہ نے اپنی منظورِ نظر پری رخسار عورتوں کے لئے محل کا ایک حصہ ”سلطانی پری خانے“ کے نام سے مخصوص کر دیا تھا۔

اُس پری خانے میں حسین عورتوں کا میلہ لگا رہتا تھا۔وہاں سنگ مرمر کا ایک خوبصورت وسیع وعریض حوض تعمیر کیا گیا تھا۔درجنوں حسین لڑکیاں مہین ریشمی ملبوسات میں وہاں تیرتی رہتی تھیں۔وہ ایک مرصع نشست پر بیٹھ کر اُن رنگ برنگی جل پریوں کے نظارے سے لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔

پھر وہ پریاں پانی سے نکل کر لب حوض بیٹھ جاتی تھیں۔بھیگے ہوئے گیسوؤں کو جھٹک جھٹک کر سکھاتی رہتی تھیں۔ایسے وقت وہ مہین ریشمی ملبوسات ان کے وجود سے یوں چمٹ جاتے تھے کہ آئینے کی طرح آر پار سارے نظارے بے حجاب ہو جاتے تھے۔ان لمحات میں واجد علی شاہ کی نظریں بھی ضدی بچے کی طرح وہیں سر پھوڑنے لگتی تھیں۔

جس حسینہ پر شہزادے کی خاص عنایت ہوتی تھی' یا اس کی کوئی ادا دل کو بھا جاتی

تھی تو وہ اسے پری کا خطاب عطا کرتا تھا۔ایام ولی عہدی میں اس کا یہی ایک مشغلہ تھا کہ جس قدر خوبصورت' نازک اندام' خوش گلو حسینائیں ملتی تھیں' انہیں وہ سلطانی پری خانے میں داخل کر لیتا تھا۔جوانی کی گرما گرمی میں دن سیاہ اور راتیں روشن کرنے والا شہزادہ ہمیشہ جہانِ حسن کے نئے ملک' نئی نگری میں فتوحات کے جھنڈے گاڑتا رہتا تھا۔

وہ دل پھینک عاشق شاعر بھی تھا۔جب بھی کسی شوخ اداؤں والی حسینہ کو دیکھتا تو دل کے بیاض پر اشعار لکھنے لگتا۔

غرض کہ پڑی جبکہ پہلی نظر
نشانہ ہوا تیر غم کا جگر
پلک کام کرنے لگے تیر کا
کیا کاٹ ابرو نے شمشیر کا
غضب آنکھ شوخی میں تھی بے مثال
جہاں چوکڑی بھول جائے غزال
غرض اس کی الفت اثر کر گئی
محبت میرے دل میں گھر کر گئی

وہ اپنے دلِ عاشقانہ کو ہتھیلی پر لئے پھرتا تھا۔جہاں کوئی پری جمال ماہ جبیں دیکھی' وہیں دل ہار گیا۔عشرت کدے کی رنگین دنیا کے باہر بھی حُسن بکھرا پڑا تھا اور وہ اس سے فیض یاب ہونے کے لئے ہر رات رقص وسرود کی کسی نہ کسی محفل میں پہنچ جاتا تھا۔

ایک رات واجد علی شاہ اپنے ایک بے تکلف دوست سکندر حشمت کے ہمراہ شاہانہ نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔بیش قیمت فانوسوں میں سینکڑوں شمعیں جگمگا رہی تھیں۔محفل کی چکا چوند آنکھوں کو چندھیا رہی تھی۔کسی نئے نویلے نظارے کا انتظار تھا۔ایسے ہی وقت طبلے پر تھاپ پڑی' گھنگروؤں کی جھنکار سے محفل گونج اٹھی۔ان دونوں کی نظریں محرابی دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔وہاں پڑی ہوئی نیلے رنگ کی ریشمی چلمن یکبارگی ایسے لہرائی' جیسے نیلگوں پانی میں ہلچل مچ گئی ہو۔سرخ پشواز میں ملبوس ایک کسی لہراتی' بل کھاتی ہوئی جادو جگانے آ رہی تھی۔

واجد علی شاہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ بڑے اشتیاق سے اسے دیکھنے لگا۔ اُن لمحات میں ایسا لگ رہا تھا' جیسے کوئی جل پری سچ مچ نیلے سمندر کی گہرائیوں سے ابھر کر اس کے سامنے چلی آئی ہو۔

وہ شمع محفل روشن ہوئی تو فانوسوں کی جگمگاہٹ جیسے ماند پڑنے لگی۔ اس نے جھک کر حاضرین محفل کو فرشی سلام کیا پھر ایک ادا سے پلٹ کر ذرا دور چلی گئی۔ واجد علی شاہ کے ہاتھ میں جام چھلک رہا تھا۔ لیکن جب ڈھولک کی تھاپ' سارنگی کی دُھن اور گھنگروؤں کی جھنکار میں حسن کی مینا چھلکنے لگی تو اس نے جام کو ایک طرف رکھ دیا۔ اسے بھرپور توجہ سے دیکھنے لگا۔ دبیز قالین پر اس کے اُجلے اُجلے حنائی پاؤں اِدھر اُدھر پڑ رہے تھے اور واجد علی شاہ کو اِدھر سے اُدھر کر رہے تھے۔ اس نے بے چین ہو کر سکندر حشمت سے پوچھا۔ "یہ کون ہے....؟"

وہ شہزادے کی کیفیت کو بھانپ گیا تھا۔ مسکراتے ہوئے بولا۔ "خاص آگرے کی بلبل ہے۔ ہم آگرے سے تاج محل تو نہ لا سکے۔ اسے لے آئے ہیں۔"

وہ جھوم رہی تھی' لہرا رہی تھی اور اپنی اداؤں سے شہزادے کو دیوانہ بنا رہی تھی۔ وہ کبھی اِدھر سے' کبھی اُدھر سے بدن کے تھرکتے ہوئے جغرافیہ کو پڑھ رہا تھا۔ وہ رقص کے ایسے ایسے انداز پیش کر رہی تھی کہ دیکھنے والے بے اختیار واہ واہ کرنے لگتے تھے۔ لیکن اس رنگیلے نواب کے مچلتے ہوئے دل سے ہائے ہائے نکل رہی تھی۔ نظر کی کمان سے تیر چھوٹ رہے تھے اور وہ نشانہ بن رہا تھا۔ اس نے تڑپ کر سکندر حشمت سے کہا۔ "ہُوں.... آگرے سے آئی ہے۔ کیا نام ہے اس لپکتی ہوئی بجلی کا....؟"

"وزیرن نام ہے.... اپنی دلربائی میں یکتا ہے۔ اسی لئے تو ہم نے اسے اپنی منظورِ نظر بنا رکھا ہے۔"

وہ ایکدم سے ٹھٹک گیا۔ چونک کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ کی منظورِ نظر..؟ یعنی آپ اس دلرُبا سے فیض یاب ہو چکے ہیں؟"

وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "بس یوں سمجھیں کہ جلد ہی فیض یاب ہونے والے ہیں۔ بات ابھی شناسائی تک پہنچی ہے۔ دو چار ملاقاتوں میں اس کا ہاتھ' ہاتھوں میں لینے کا موقع ملا ہے۔ تب سے یہ دل ہاتھ سے بے ہاتھ ہو رہا ہے۔"

وہ وزیرن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دل اُس سلطنت کو فتح کرنے کے لئے مچل گیا تھا۔ لیکن یہ بات کھٹکنے لگی تھی کہ وہ سکندر حشمت سے راہ و رسم بڑھا رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد ساز خاموش ہو گئے۔ رقص کا جادو تھم گیا۔ واجد علی شاہ نے اپنے گلے کی قیمتی مالا اتار کر اس کے قدموں کی طرف اچھالتے ہوئے کہا۔ "واہ۔ آج کی یہ محفل ہمیشہ یاد رہے گی۔"

وہ آداب بجالانے کے انداز میں اپنا ایک ہاتھ پیشانی تک لائی۔ پھر اس کے پاس بیٹھ کر بولی۔ "ہم پھینکی ہوئی چیز نہیں اٹھاتے۔ اس مالا کو محبت سے گلے لگانا چاہتے ہیں تو اسے اٹھا کر ہمارے گلے لگائیں۔"

یہ بڑا ہی دل موہ لینے والا انداز تھا۔ اس نے جھوم کر مالا کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ "کیا خوب ادائیں ہیں آپ کی.... ابھی تک ہماری نگاہیں آپ کے گلے لگتی رہی ہیں۔ اب یہ مالا لگے گی۔"

پھر وہ اسے مالا پہناتے ہوئے بولا۔ "آپ کی اس قربت سے ہم مالا مال ہو رہے ہیں۔"

وہ بڑی شوخی سے بولی۔ "ہم آگرے سے خاص آپ کے لئے یہاں آئے ہیں۔ حضور کے دل کو ہماری محفل بھا گئی۔ یہ ہماری عزت افزائی ہے۔"

واجد علی شاہ نے سکندر حشمت کو دیکھا۔ وہ وزیرن کی بات سنتے ہی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا' اس سے پہلے ہی اس نے کہا۔ "ہم آپ کو نہیں جانتے تھے۔ سکندر حشمت نے تعارف کرایا تو معلوم ہوا کہ آپ دونوں ایک دوسرے سے بخوبی واقف ہیں۔"

وہ سکندر پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ "شمع روشن رہتی ہے تو کتنے ہی پروانے خود کو اس سے منسوب کرتے رہتے ہیں۔ مگر ہم تو بس ایک ہی پروانے کے منتظر ہیں۔"

سکندر حشمت نے ذرا سبکی سی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو آپ نے ہم سے شناسائی کیوں رکھی؟"

وہ اس قیمتی مالا سے کھیلتے ہوئے بولی۔ "ہم جس بازار میں ہیں' وہاں شناسائی سب سے ہوتی ہے۔ مگر آشنائی کسی ایک سے....."

اس نے ایسا کہتے ہوئے کن اکھیوں سے مسکرا کر واجد علی شاہ کو دیکھا۔ پھر سکندر

سے کہا۔ ”یوں سمجھیں، آپ سے شناسائی ہوئی تو آج کسی سے آشنائی بھی ہوگئی۔“

وہ اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ”یعنی آپ نے ہمیں مہرہ بنا کر استعمال کیا ہے؟“

واجد علی شاہ نے بڑے فخر سے سکندر حشمت کو دیکھا۔ وہ جل بھن کر رہ گیا تھا۔ وزیرن نے کہا۔ ”خود کو مہرہ نہ سمجھیں۔ خدا تک پہنچنے کا بھی وسیلہ ہوتا ہے۔ ہم نے آپ کو منزل تک پہنچنے کا وسیلہ بنایا ہے۔ یہ کتنی بڑی بات ہے کہ آپ ہمارے راہبر ہوئے۔“

سکندر حشمت واجد علی کے تیور دیکھ رہا تھا' یہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ وزیرن اپنی باتوں سے اور اداؤں سے نواب صاحب کو تسخیر کر رہی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے وہ اپنی زبان سے یہ تسلیم کر چکا تھا کہ ابھی تک اسے مسخر نہیں کر سکا ہے۔ لہٰذا شہزادے کے لئے اس کوری کنواری کسبی کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ اب اس سے سخت کلامی کرنا گویا نواب صاحب کی مخالفت مول لینا تھا۔ وہ اسے غصے سے گھورتا ہوا چپ چاپ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

وہ دل لگی کا شہنشاہ یہ سن کر بے چین ہو گیا تھا کہ وہ ہوشرُبا نازنین اس کی محبت میں آگرے سے یہاں کھنچی چلی آئی ہے۔ وہ اسے اپنے سلطانی پری خانے کی زینت بنا سکتا تھا۔ لیکن جس طرح ایک مچھلی پورے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے' اسی طرح وہ ایک کسبی کو پری خانے میں داخل کر کے وہاں کے حسن کو دھندلانا نہیں چاہتا تھا۔ کسبی کا کیا بھروسہ....؟ وہ خود کو بے داغ کہنے والی' بظاہر شفاف دکھائی دینے والی اندر سے داغدار بھی ہو سکتی تھی۔ لہٰذا آزمائش شرط تھی۔ واجد علی شاہ نے کہا۔ ”تم محبت کی بات کرتی ہو۔ ہمیں تو پہلی نظر میں تم سے عشق ہو گیا ہے۔“

وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بے یقینی سے بولی۔ ”ہائے اللہ.... کیا سچ.....“

”ہاں۔ سچ... آج معلوم ہو رہا ہے' یہ عشق کیا بلا ہے؟“

وہ اپنی غزالی آنکھیں جھپکتے ہوئے بولی۔ ”اللہ.... کہیں ہم خواب تو نہیں دیکھ رہے ہیں؟“

وہ بولا۔ ”اگر یہ خواب ہے تو ہم تمہارے خوابوں کو تعبیر دینا چاہیں گے۔“

وہ سر جھکا کر بولی۔ ”یہ اس ناچیز کی عزت افزائی ہوگی۔ صاحب عالم جب یاد فرمائیں گے' یہ شیدائی وزیرن کشاں کشاں چلی آئے گی۔“

وہ بولا۔ ”تم لکھنؤ سے ہمارے لئے یہاں آئی ہو۔ اب ہمارا عشق کہتا ہے' کچھ سفر ہمیں بھی طے کرنا چاہئے۔ یہ بتاؤ' تم نے قیام کہاں کیا ہے؟“

”گولہ گنج میں عظیم اللہ کمبدان رہتے ہیں۔ ان کے پڑوس میں ہی ایک مکان لیا ہے۔“

”عظیم اللہ.... وہ تو ہمارے خاص مصاحبین میں سے ہیں۔ ملاقات کے لئے اُن کا گھر مناسب رہے گا۔ ہم کل رات وہاں چلے آئیں گے۔“

اس نے ایک ذرا ٹھٹھک کر پُوچھا۔ ”کیا سلطانی پری خانے میں ہمارے لئے جگہ نہیں ہے یا ہم پری بننے کے قابل نہیں ہیں؟“

وہ جلدی سے بات بناتے ہوئے بولا۔ ”دراصل... وہ پری خانہ تمہارے قابل نہیں ہے۔ تمہارا حسن و جمال یکتا ہے۔ ہم تمہیں اوروں میں شامل کر کے تمہاری انفرادیت کو فنا نہیں کرنا چاہتے۔“

وہ اپنی تعریف سن کر مسکرانے لگی۔ وہ سلطانی پری خانے میں داخل ہونے کی خواہش لے کر آئی تھی۔ مگر مایوسی مل رہی تھی۔ خواہش کی تکمیل کے لئے نواب صاحب کو قائل کرنا ضروری تھا۔ وہ ایک ادا سے بولی۔ ”آپ کا یہ حیلہ بہت کمزور ہے۔ چاند تو چاند ہوتا ہے۔ اسے ستاروں کے جھرمٹ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

وہ اس کی دلکشی کو بڑی لگن سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”خود کو چاند نہ کہو... وہ داغدار ہوتا ہے۔ تم ہماری منظورِ نظر بن گئی ہو۔ ہم تمہیں اپنے پری خانے کی پری تو کیا اپنی ملکہ بھی بنا سکتے ہیں۔ لیکن عشق و محبت میں چوری چھپے کی ملاقاتوں کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ کیا تم ہمیں ایسے لطف سے محروم رکھنا چاہتی ہو؟“

وہ ایک ادا سے اپنا ہاتھ کانوں کو لگاتے ہوئے بولی۔ ”توبہ کریں نواب صاحب.....! ہم یہاں آپ کو محروم نہیں.... اپنا محرم بنانے آئے ہیں۔ کل رات عظیم اللہ کے گھر میں بڑی بے چینی سے آپ کے منتظر رہیں گے۔ حضور کو اپنا وعدۂ شب یاد رہے گا ناں...؟“

اس نے مسکرا کر تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہم خود کو بھول سکتے ہیں۔ مگر ایسے حسین وعدے کو ہرگز نہیں بھولیں گے۔“

پھر وہ اٹھ کر وہاں سے جانے لگا۔ جاتے جاتے کہنے لگا۔ ''ہائے وزیرن بائی....! آج کی یہ رات... اور کل کا دن کیسے گزرے گا؟ ہم تمہاری چوکھٹ سے رت جگے لے کر جا رہے ہیں۔''

وہ بولتا ہوا بارہ دری کی سیڑھیاں اترتا ہوا اپنی پالکی کی طرف جا رہا تھا۔ وزیرن بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ آداب بجالانے کے انداز میں اپنے ایک ہاتھ کو پیشانی تک لاتے ہوئے زیرلب بولی۔ ''ہم یہی چاہتے ہیں کہ آپ ہماری طلب میں راتوں کو جاگنا شروع کر دیں۔''

وہ رات اس نے وزیرن کو بھلانے کے لئے ایک دلربا پری کی آغوش میں گزار دی۔ دوسرا دن بھی حسیناؤں کے جھرمٹ میں گزر گیا۔ پھر رات ہوتے ہی وہ پالکی میں سوار ہو کر عظیم اللہ کے گھر چلا آیا۔ لڑکپن سے بچپن اور بچپن سے سن بلوغت تک وہ ہزاروں دلرباؤں سے دل لگی کرتا آیا تھا۔ اپنی ہوس کو عشق اور محبت کا نام دے کر حسن کے نت نئے چٹخارے لیتا رہا تھا۔

اناج کی فراوانی بھوک کی شدت کم کر دیتی ہے۔ لیکن دن رات حسیناؤں کے میلے میں رہنے والے اس عاشق مزاج شہزادے کی ہوس کم نہیں ہوتی تھی۔

ملی آخر اک رات تنہا وہ شوخ
کہ میں تھا فقط اس جگہ بادہ شوخ
خوشی عیش و آرام آٹھوں پہر
نشاط اور عشرت تھی شام و سحر

اس رات وہ وزیرن کے ساتھ عیش و نشاط میں ڈوب جانا چاہتا تھا۔ مگر جانے کیوں سحر زدہ نہ ہو سکا؟ عجیب بدمزگی سی رہی۔ عشق کا چڑھا ہوا سمندر ایک ہی رات میں اُتر گیا۔

چند روز بعد سکندر حشمت سے ملاقات ہوئی تو اس نے کہا۔ ''ہم نے سنا ہے' وہ فتنہ سامان یہاں سے کوچ کر گئی ہے؟ آپ تو اس کے دامِ گیسو میں الجھ گئے تھے۔ پھر اسے پری خانے کی زینت کیوں نہ بنایا؟''

واجد علی نے مسکرا کر کہا۔ ''پری خانے میں جانے سے پہلے ہی اس کے پَر جل

گئے۔ وہ شوخ تھی' شنگ تھی' خوش رنگ تھی مگر ہمارے پری خانے کے معیار کے مطابق نہیں تھی۔ ہم عظیم اللہ کے گھر میں اس سے فیض یاب ہوئے تھے۔ وہ حسن کی پوٹلی کھلی تو پتہ چلا' آؤ صنم جاؤ صنم گھر تمہارا ہے...' وہ کوری کنواری نظر آنے والی کیسی تھی' کیسی ہی نکلی۔''

سکندر حشمت نے کہا۔ ''بھئی یہ حسن و شباب کا ذخیرہ لئے پھرنے والیاں سراسر نظر کا فریب ہوتی ہیں۔ بس ان کی شہرت ہی شہرت ہوتی ہے۔ ایسے موقع پر ہی کہا جاتا ہے۔

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرہ خوں نہ نکلا''

واجد علی شاہ یہ تو جانتا تھا کہ ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی۔ اسی لئے دل میں اترنے والی حسیناؤں کو ٹھونک بجا کر اپنے پری خانے میں لاتا تھا۔ امجد علی شاہ بیٹے کی ایسی مصروفیات سے بہت پریشان رہنے لگا تھا۔ یہ جانتا تھا کہ اس بے لگام گھوڑے کو لگام نہیں ڈال سکے گا۔ لہٰذا اس نے بیٹے کی شادی کا فیصلہ کیا اور نواب علی خان بہادر کی بیٹی سلطان بیگم کو واجد علی شاہ کی دلہن بنا دیا گیا۔ اس دلہن کو اعظم بہو کا خطاب ملا۔

شادی کے بعد واجد علی شاہ اپنا زیادہ وقت محل میں گزارتا تھا۔ سلطانی پری خانے میں آمد و رفت کم ہو گئی تھی۔ چونکہ اس کی طبیعت میں حسن پسندی تھی۔ لہٰذا محل کی خادماؤں پر خواہشِ نظر پڑنے لگی۔ بات اعظم بہو کے کانوں تک پہنچی تو یہ معاملات اس کی نظروں میں خار کی طرح کھٹکنے لگے۔ اس بدگمانی کے باعث محل کی چند گل بدن' شوخ و طرحدار عورتیں خار و خس کی طرح نکالی گئیں۔

واجد علی شاہ نے کہا۔ ''یہ آپ نے کیا کیا سلطان بیگم...! وہ عورتیں ہماری نمک خوار باندیوں میں سے تھیں۔''

وہ بولی۔ ''آپ اپنی ایسی مصروفیات کو سلطانی پری خانے تک ہی محدود رکھیں۔ ہم سے یہ بے سر و پا معاملات برداشت نہیں ہوں گے۔''

وہ بولا۔ ''آپ کو برداشت کرنا ہوگا۔ ہم پابندیوں میں رہنے کے قائل نہیں ہیں۔ حسن نظر رکھتے ہیں۔ شادی خانہ آبادی کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہم اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لیں اور دنیا کی رنگینیوں کو یکسر نظر انداز کر کے جیتے رہیں۔''

اس واقعہ کے بعد اس نے تین راتوں تک شاہی محل کا رخ نہ کیا۔ پری خانے کی رنگینیوں اور سنگینیوں میں ڈوبا رہا۔ سلطان بیگم کی سمجھ میں یہ بات آگئی تھی کہ وہ عیش پرستی و حسن پرستی کو عشق و محبت کا نام دینے والا اپنی عیاشیوں سے باز نہیں آئے گا۔ بلکہ اس روک ٹوک کے برے نتائج یہ سامنے آرہے تھے کہ وہ خود بھی اس سے محروم ہوگئی تھی۔ تین روز بعد اس شرط پر صلح ہوگئی کہ سلطان بیگم واجد علی شاہ کے ایسے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرے گی۔

شادی کے ایک برس بعد سلطان بیگم کے پہلا بیٹا پیدا ہوا۔ امجد علی شاہ کے حکم سے شادمانی کی توپیں سرکی گئیں۔ کئی ہفتوں تک شاہی محل میں واجد علی شاہ کے ننھے فرزند کا جشن منایا گیا۔ اس بچے کا نام مرزا محمد علی حیدر تجویز کیا۔ پھر اگلے برس ایک اور بیٹا پیدا ہوا اور اسے فلک قدر کا خِطاب دیا گیا۔

شاہی محل میں خادماؤں اور کنیزوں کی کمی نہیں تھی۔ پھر بھی ہر دوسرے، تیسرے روز کسی نئی نویلی کا اضافہ ہوجاتا تھا۔ ایک روز واجد علی شاہ ہری بھری گھاس پر چہل قدمی کر رہا تھا۔ ایسے وقت اس نئے چہرے کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ وہ ایک کیاری کے پاس پھول چن رہی تھی اور خود بھی کھلتا ہوا گلاب نظر آرہی تھی۔ وہ بانکی سجیلی نار بڑی پرکشش تھی۔ واجد علی شاہ سحر زدہ سا ہو کر کشاں کشاں اس کی طرف بڑھنے لگا۔

ایسے ہی وقت حسن کو جیسے نظر لگ گئی۔ نازک انگلی میں کانٹا چبھ گیا تھا۔ وہ ایک سسکاری لے کر اس انگلی پر پھونکیں مارنے لگی۔ واجد علی شاہ نے فوراً ہی آگے بڑھ کر اس کی کلائی تھام لی اور زخمی انگلی کو اپنے منہ میں دبا لیا۔ ایسے موقعوں پر ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے ہیں۔ اس کے ہاتھ سے پھول گر گئے۔ وہ دیدے پھیلائے حیران پریشان سی کبھی اسے دیکھ رہی تھی، کبھی اس کے منہ میں دبی ہوئی اپنی انگلی کو دیکھ رہی تھی۔ اس انگلی کے ذریعہ جیسے اس کی جان نکلتی چلی جارہی تھی۔ وہ ایک ذرا ڈگمگائی پھر چکرا کر گر پڑی۔

واجد علی نے پریشان ہو کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ وہ جھک کر اس کے چہرے کو تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ''اے.... کیا ہوا تمہیں....؟ اٹھو....!''

اس نے دو چار خادماؤں کو بلا کر پوچھا۔ ''یہ کون ہے....؟''

ایک نے کہا۔ ''نئی خادمہ ہے حضور....!''

''کیا نام ہے؟''

''موتی خانم....''

چہرے پر پانی کے چھینٹے پڑے تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ نظروں کے عین سامنے وہی نواب صاحب دکھائی دیئے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ پھر خود کو سنبھالتی ہوئی دست بستہ کھڑی ہوگئی۔ واجد علی نے دوسری خادماؤں کو تخلیے کا حکم دیا۔ پھر سر تا پا اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ''کیا ہم اتنے بدصورت ہیں کہ ہمیں دیکھ کر بے ہوش گئی تھیں؟''

وہ اٹکتے ہوئے بولی۔ ''ہم.... ہم آپ کی صورت سے نہیں... قربت سے بے ہوش ہوگئے تھے۔''

کیا سریلی آواز تھی؟ لب و لہجے میں بانکپن کی کھنک سنائی دے رہی تھی۔ وہ مسکرا کر بولا۔ ''قربت سے بے ہوش نہیں... مدہوش ہوا جاتا ہے۔''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے سر جھکائے کھڑی رہی۔ وہ بولا۔ ''تمہارا نام موتی خانم ہے۔ ہم اس موتی کو پرکھنا چاہتے ہیں۔''

ایسے وقت اُس عاشق مزاج شاعر نے اپنی بیاض میں لکھا۔

بہت شوخ تھی گرم تھی شنگ تھی
سرے دست چندے وہ خوش رنگ تھی
بلا خیز چشم سیہ فام تھی
کہ گردش میں وہ دورِ ایام تھی
جو دانتوں کو دیکھا یہ شبہ ہوا
کہ خالق نے منہ موتیوں سے بھرا

حسب معمول اس خادمہ سے بھی رنگِ محبت جما۔ محل میں اس نئے نویلے عشق کے چرچے ہونے لگے۔ ایسے میں سلطان بیگم بے خبر نہیں رہ سکتی تھی۔ مگر وہ مجازی خدا کی ناراضی مول نہیں لینا چاہتی تھی۔ اس لئے باخبر ہونے کے باوجود اس کے تیور میلے نہ ہوئے۔ واجد علی شاہ اس موہنی صورت والی کے عشق میں ایسا مست ہوا تھا کہ موقع بے موقع

اشعار کہنے لگا تھا۔اس نے موتی خانم کے حوالے سے ہی یہ شعر کہا تھا۔

بظاہر تھی وہ صرف خدمت گزار
بہ اخفا ملا لطف بوس و کنار

امجد علی شاہ کو بیٹے کے اس معاشقے کی خبریں مل رہی تھیں۔لیکن جب یہ انکشاف ہوا کہ وہ شعروشاعری سے حددرجہ شغف رکھنے لگا ہے تو باپ نے اپنا سر پیٹ لیا۔پریشان ہو کر بیگم سے کہا۔"فرزند کی عیش پرستی حد سے تجاوز کرتی جارہی ہے۔"

"موتی خانم کے عشق نے تو اسے نکما بنادیا ہے۔"

"یہ عشق نہیں....ہوس ہے۔وہ ہمیشہ ہی اپنی ہوس پرستی کو عشق اور محبت کا نام دیتا رہتا ہے۔"

بیگم نے کہا۔"ہم اسے سمجھائیں گے۔"

وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔"سمجھنے اور سمجھانے کا وقت گزر گیا ہے۔تاریخ شاہد ہے' عیش وطرب میں ڈوبنے والے سلاطین سلطنت کی تباہی کا باعث بنتے ہیں۔ہم بیٹے کو سونے کا نوالہ کھلاتے ہیں۔مگر شیر کی آنکھ سے دیکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔"

وہ شوہر کے تیور دیکھ کر پریشان ہوگئی تھی۔اس نے پوچھا۔"اسے راہ راست پر لانے کے لئے آپ نے کوئی تو حل سوچا ہوگا؟"

وہ تائید میں سر ہلا کر بولا۔"اس فتنہ کار خادمہ کو ابھی اور اسی وقت محل سے دور کر دیا جائے گا۔"

پھر بیٹے پر باپ کا ایسا عتاب نازل ہوا کہ نہ صرف موتی خانم کو اس سے دور کر دیا گیا بلکہ فرزند کا سلام ومجرا بھی بند کرادیا گیا۔محبت کا دریا چڑھا ہوا تھا۔ایسے میں داغ فرقت ملا تو واجد علی شاہ جیسے اپنے آپ سے غافل ہوگیا۔رات دن کے معمولات درہم برہم ہوگئے تھے۔نہ سونے جاگنے کا کوئی وقت مقرر تھا' نہ کھانے پینے سے رغبت رہی تھی۔

وہ ہر وقت اس کی یادوں میں ڈوبا رہتا تھا۔اس کی خدمت گزاریاں یاد کرتا رہتا تھا۔اس عالم دیوانگی میں رنگِ شاعری چمک رہا تھا۔

لگا کر کبھی پان لاتی تھی وہ
محبت کا بیڑہ اٹھاتی تھی وہ

شاید وہ موتی خانم کو بھول جاتا مگر باپ کے فیصلے نے اسے زندگی کی رنگینیوں سے بالکل ہی محروم کردیا تھا۔اس کی جدائی میں اس نے یہ اشعار بھی قلمبند کئے تھے۔

کسی کام کا دھیان آتا نہ تھا
سلامِ پدر کو بھی جاتا نہ تھا
یہ مانوس اُن سے دل زار تھا
فقط چار ساعت کا دربار تھا
یہاں تک دل و جاں سے مفتوں تھا میں
کہ لیلیٰ تھی وہ اور مجنوں تھا میں

کوئی اس معشوقہ کی نعم البدل بھی نہیں مل رہی تھی۔دل بہلانے کا کوئی تو ساماں ہوتا۔سلطان بیگم شوہر کی حالت سے پریشان ہوگئی تھی۔دو دنوں کی بھوک ہڑتال نے یہ اثر دکھایا تھا کہ وہ مارے نقاہت کے بستر سے اترتا نہ تھا۔شاعری اوڑھنا بچھونا بن گئی تھی۔سلطان بیگم نے اپنی ساس سے کہا۔"وہ موتی خانم کے فراق میں مجنوں بنتے جارہے ہیں۔خدارا....بابا جانی کو سمجھائیں۔اگر انہوں نے اپنے فیصلے میں لچک پیدا نہ کی تو باپ کا یہ اصلاحی قدم بیٹے کو تباہی کے دہانے پر پہنچادے گا۔"

بیٹے کا مقدمہ باپ کی عدالت میں پہنچا تو اس نے کہا۔"ہم باپ ہیں۔اس کے دشمن نہیں ہیں۔"

ماں نے کہا۔"آپ دشمن نہیں ہیں۔لیکن آپ کا فیصلہ بیٹے سے دشمنی کررہا ہے۔"

"آپ ممتا کی زبان سے بول رہی ہیں۔ایک باپ کے اصلاحی اقدامات کو سمجھ نہیں رہی ہیں۔"

"آپ بیٹے کی حالت کو سمجھ نہیں رہے ہیں۔دیے میں تیل کم ہوجائے تو اس کی روشنی گھٹتی چلی جاتی ہے۔خدارا....اپنا فرزند کھونے سے پہلے اس کی جھولی میں موتی خانم کو ڈال دیں۔"

بیٹے کی دن بہ دن بگڑتی ہوئی حالت نے اسے بھی تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ بچپن سے حسینوں اور دلرباؤں کے جھرمٹ میں رہتا آیا تھا۔ امجد علی شاہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ وہ شوقین مزاج بیٹے کی اصلاح کرنا چاہے گا تو وہ ڈال سے ٹوٹے ہوئے پھول کی طرح خزاں رسیدہ بن کر رہ جائے گا اور یہی ہو رہا تھا۔

آخر کار واجد علی شاہ کی احتجاجی کارروائیاں رنگ لائیں۔ امجد علی شاہ سے بیٹے کی محرومیاں اور اداسیاں دیکھی نہ گئیں۔ محبت پدری نے جوش مارا اور اس معشوقہ کو باپ کے حکم سے واجد علی کی شمع خانہ بنا دیا گیا۔

خوابگاہ کی ویران تنہائیوں میں زندگی کی مسرتیں پھر سے چھنکنے لگیں۔ ایک در کھلا تو باقی دروازے بھی کھلتے چلے گئے۔ پری خانے کی پریاں' شاہی محل کی حسینائیں گنگا جمنا کی طرح اس کے آس پاس بہنے لگیں۔

اس قدر جنون عشق کا مظاہرہ کرنے کے بعد ضد پوری ہوئی تو حسب معمول موتی خانم کا عشق بھی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ چند روز بعد اس خیال سے کہ باپ کی نافرمانی اچھی نہیں اُس نے موتی خانم کو محل سے نکال دیا۔

☆☆☆

سلطانی پری خانے میں پریوں کے ساتھ ساتھ شاہی محل کی بیگمات کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ ۱۸۴۷ء میں امجد علی شاہ کے بعد ولی عہد واجد علی شاہ مسند نشین ہوا اور سلطنت اودھ کا بادشاہ کہلایا۔

اس کی تخت نشینی کے چند ماہ بعد لارڈ ہارڈنگ نے لکھنؤ کا دورہ کیا اور امورِ سلطنت پر نکتہ چینی کرتے ہوئے واجد علی شاہ کو متنبہ کیا کہ دو برسوں کے اندر سلطنت اودھ کا نظام بہتر نہ ہوا تو مجبوراً انگریزی گورنمنٹ مداخلت کر کے اودھ کی حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لے گی۔ واجد علی شاہ کی حکومتی مصروفیات اور عشق و محبت کی مستیاں شانہ بہ شانہ چل رہی تھیں۔ وہ رقص و سرود کا ایسا دلدادہ تھا کہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا۔

ایک بار اسے خبر ملی کہ زوجہ ننھی بیگم کے بیٹا پیدا ہوا ہے۔ اس وقت وہ اپنے دفتر میں براجمان تھا۔ دفتری امور کو ادھورا چھوڑ کر بیٹے کی خوشیاں منانے فوراً ہی شاہی محل میں نہیں جا سکتا

تھا۔ لہٰذا اس نے دفتر میں ہی رقص و سرود کی محفل سجانے کے احکامات جاری کر دیئے۔

کوئی شک نہیں تھا کہ اس عشرت پسند بادشاہ کی رنگین مزاجی کے باعث دفاتر سلطنت گھنگروؤں کی جھنکار سے گونجنے والے تھے۔ لیکن وہاں کے مجتہد نے اسے ایسا قدم اٹھانے سے باز رکھا۔

واجد علی شاہ جس قدر حسن پرست تھا' اُسی قدر نفاست پسند بھی تھا۔ خوابگاہ میں اس کے مزاج کے خلاف کوئی بات ہو جاتی تھی تو خلوت کا سارا مزہ کرکرا ہو جاتا تھا۔ لہٰذا اس نے اپنی بیگمات کے لئے ایک شرائط نامہ تیار کرایا۔ ان شرائط پر پورا پورا ات[illegible] والیوں کو انعام و اکرام سے نوازا جاتا تھا۔

وہ جلوت کا بادشاہ جب خلوت کا شہنشاہ بنتا تھا تو کسی بھی قسم کے تمباکو کی بو اسے ناگوار گزرتی تھی۔ اس نے شرائط نامے میں سختی سے تاکید کی تھی کہ دورانِ صحبت کوئی بیگم تمباکو کھانے اور حقہ پینے کا قصد نہ کرے۔

ہمیشہ اُجلے رنگین ملبوسات میں روبرو آئیں۔ گہرے رنگ کے ملبوسات کو دیکھ کر طبیعت بوجھل ہو جاتی ہے۔

اپنے وجود کو خوشبوؤں میں بسائے رکھیں۔ پوشاک سے اور جسم کے کسی بھی حصے سے ہرگز ہرگز بدبو نہ آئے۔

ہتھیلیاں' پاؤں اور تلوے ہمیشہ آئینے کی طرح صاف شفاف رہیں۔ کسی بھی طرح کا میل اور آخور نہ ہو۔

زلفوں میں خوشبودار تیل' آنکھوں میں سرمہ یا کاجل اور ہاتھوں میں پہنچوں تک ہمیشہ مہندی کی لالی ہونی چاہیئے۔

بلاوے کا حکم ملتے ہی بلا تاخیر خوابگاہ میں حاضر ہو جایا کریں۔

بے باک اور بے حجاب حاضر ہوا کریں۔

ہنسی کی بات پر ہنسا کریں۔ بے سبب نہ ہنسا کریں۔

بادشاہ کا یہ حکم بھی تھا کہ جب خلوت میں ہمارے پاس آؤ تو خاموش نہ بیٹھی رہو۔ کسی نہ کسی موضوع پر بولتی رہو اور کسی تکلف کو خاطر میں نہ لاؤ۔ دل چاہے بیٹھو... دل چاہے لیٹو۔

ہاتھوں اور پیروں کے ناخن بڑھے ہوئے نہ ہوں۔ ہر جمعہ باقاعدگی سے ناخن ترشواؤ۔

ان شرائط میں سب سے اہم شرط یہ تھی کہ بیگمات اپنی خواہش نفسی کو بلا جھجک بادشاہ تک پہنچا دیا کریں کہ ایسے پیغامات سن کر اس کا دل باغ و بہار ہو جاتا ہے۔

دورانِ خلوت جو علم سکھایا جائے اسے دل جمعی سے سیکھیں۔ ایسے وقت بلا ضرورت خوابگاہ سے باہر نہ جائیں۔

پان بہت کم کھایا کریں۔ کیونکہ وہ دانتوں کو لال کرتا ہے اور منہ میں بو پیدا کرتا ہے۔ چھالیہ سے آواز خراب ہوتی ہے۔ لہٰذا ایسی چیزوں سے حتی الامکان اجتناب کیا جائے۔

بُلاق پہننے کے لئے ناک چھیدنے کی زحمت نہ کریں۔ قطعی ممانعت ہے۔

کوری کنواری دوشیزاؤں کی دوشیزگی اس قدر اہم ہوتی تھی کہ انہیں ہونٹوں پر مصنوعی لالی یعنی مسّی وغیرہ لگانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ وہ بھنورہ صفت بادشاہ پہلے ان پنکھڑیوں کا قدرتی رنگ چراتا تھا۔ پھر وہی دوشیزہ جب دوسری رات خلوت میں آتی تھی تو اسے مسّی لگانے کی اجازت دے دی جاتی تھی۔

واجد علی شاہ کی زندگی ایسے ہی رنگین اور سنگین معاملات سے بھری پڑی ہے۔ تاریخ میں اس کے بہت سے قصے رقم کئے گئے ہیں۔ اُس کے پاس جلسے والیوں کی تعداد بائیس بیان کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ تینتالیس عورتیں اور بھی تھیں۔ گانے بجانے والیوں کو ملا کر حسینوں کی کل تعداد دو سو سولہ ہوتی تھی۔ ان پر سالانہ لاکھوں روپے خرچ ہوا کرتے تھے۔

ان دلرباؤں کے علاوہ پندرہ کلاونت، مُغنّی، ایک ٹھمنٹی والا، دو پکھاوجی، تیئس طبلہ نواز، چھیالیس سارنگی نواز، بائیس منجیرہ نواز، چھ رقاص، ایک شعبدہ باز، دو ڈھولک نواز، ایک سُر سنگھار نواز، انتیس نفیر نقار خانے اور چھ سرود محفل ملازم تھے۔ ان کی تنخواہوں کی مد میں بھی لاکھوں روپے صرف ہوا کرتے تھے۔

شوق کا کوئی مول نہیں ہوتا.... وہ حسن پرست، اختراع دوست اور رقص و سرود کے دیوانے بادشاہ نے ان سینکڑوں افراد کی کفالت کا ذمہ اپنے سر لے رکھا تھا۔ شاہی خزانے کی آدھی آمدنی اسی عیش پرستی کی نظر ہو جاتی تھی۔

ایک روز واجد علی شاہ اپنے ایک بے تکلف مصاحب چھوٹے خان کے ہمراہ وزیر منزل میں قیام پذیر تھا۔ باتوں ہی باتوں میں ان دونوں کے درمیان یہ بحث چھڑ گئی کہ حسینائیں واجد علی شاہ پر ہی کیوں فریفتہ ہوتی ہیں؟ اس نے مسکرا کر کہا۔ "ہم دلرباؤں کے دل کا حال اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ ان کے من کو طرحدار عاشق بھاتے ہیں۔ اسی لئے وہ بے اختیار ہماری طرف کھنچی چلی آتی ہیں۔"

چھوٹے خان نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہم نہیں مانتے۔ اس میں آپ کی وضع داری کا کمال نہیں ہے۔ شہزادہ چاہے کتنا ہی بدصورت اور بدنما ہو، حسینہ ایک خوبصورت فقیر پر اس بدصورت شہزادے کو ہی فوقیت دے گی۔"

واجد علی نے کہا۔ "یعنی آپ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ یہ عورتیں ہماری وضع داری کے بجائے، ہمارے رُتبے سے الفت رکھتی ہیں اور اسی کے سبب ہماری طرف کھنچی چلی آتی ہیں؟"

"بالکل یہی بات ہے۔ یقین نہیں آتا تو کسی روز آزما کر دیکھ لیں۔"

"کسی روز کیوں...؟ آج ہی کیوں نہیں..؟"

ان لمحات میں یہ اشعار واجد علی کی زبان سے موزوں ہوئے تھے۔

اِدھر حسن صورت میں ' میں انتخاب
اُدھر سمجھا وہ آپ کو لاجواب
ہوئی بحث اس دن اسی بات میں
چلی چوٹ بزمِ ملاقات میں

اسی شام ایک کسبی کو وزیر منزل میں طلب کیا گیا۔ واجد علی نے کہا۔ "وہ کسبی ہمارے چہرے سے ناواقف ہے۔ یہ بھی نہیں جانتی ہے کہ ہم نواب صاحب ہیں۔ لہٰذا وہ حسینہ ہم دونوں میں سے جسے پسند کرے گی، وہی وضعدار کہلانے کا مستحق ٹھہرے گا۔"

چھوٹے خان نے جی جان سے تیاری کی۔ پُرتکلف لباس پہنا۔ عطر و عنبر میں خود کو بسایا اور جس خوابگاہ میں اس کسبی کو ٹھہرایا گیا تھا، وہاں پہنچ گیا۔ دونوں کے درمیان نرم گرم مکالمے ہونے لگے۔ ایسے ہی وقت واجد علی شاہ بھی اس خوابگاہ میں چلا آیا۔ کسبی چھوٹے خان کے پہلو سے اٹھ کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ سَر پر سادہ کلاہ سجائے، شانوں پر سفید چادر

ڈالے بہت ہی خوشنما اور بارعب دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی شخصیت نے اور پہناوے نے ایسا اثر دکھایا کہ وہ کسبی بے اختیار اس کی طرف کھنچی چلی آئی۔

☆☆☆

لارڈ ہارڈنگ کی متعین کردہ دو برس کی معیاد رفتہ رفتہ گزر رہی تھی اور اب تک نظام حکومت میں بہتری کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ یہ واجد علی شاہ کی خوش بختی تھی کہ برٹش گورنمنٹ اپنی دیگر مصروفیات کے باعث انتظام اودھ کی جانب متوجہ نہیں ہو پائی تھی۔

بادشاہ کے سینے میں دھڑکتا پھڑکتا ہوا دل آخر کار حسن کا بوجھ سہتے سہتے جیسے تھک گیا۔ کبھی کبھی دل کی دھڑکنیں اچانک ہی بے ترتیب ہو جایا کرتی تھیں۔ ایسے وقت دماغ پھوڑے کی طرح دکھنے لگتا تھا۔ شاہی اطباء اور دیگر معالج نے اس کا کلی معائنہ اور تشخیص کرنے کے بعد بتایا کہ بادشاہ وقت کو تبخیر قلبی و دماغی کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے۔ علاج کے باوجود وہ بیماری بڑھتے بڑھتے خفقان اور مراق کو پہنچ گئی۔

وقت بے وقت دل کی دھڑکنیں معمول سے زیادہ ہو جاتی تھیں۔ مالیخولیا کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ معدے کی کمزوری سے بخارات دماغ تک پہنچتے تھے اور حواس میں اختلال پیدا کر دیتے تھے۔ اس عارضے میں غم و فکر اور چھوٹی بڑی پریشانیاں مضر ثابت ہوتی ہیں۔ لہٰذا اطباء نے اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''عالی جاہ جہاں تک ممکن ہو' عیش و سرود میں رہیں۔ اُمور سلطنت میں توجہ کم سے کم کریں۔ کوئی ایسا کام نہ کریں' جس سے دل و دماغ پر بوجھ پڑے یا فکر و تردد لاحق ہو۔''

چنانچہ اُمورِ سلطنت واجد علی شاہ کے سسُر علی نقی خاں کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ بادشاہ کی تیمارداری اس کی والدہ کے ذمے تھی۔ سوائے اطباء یونانی کے ڈاکٹری علاج منظور نہ تھا۔ واجد علی شاہ اپنے مرض کے حال کو ایک شعر میں یوں بیان کرتا ہے۔

اِک مرض جاتا رہا تو دوسرا پیدا ہوا
قلب کے ہلنے کا مجھ کو عارضہ پیدا ہوا

جن پہ تکیہ تھا' وہی پتے ہوا دینے لگے۔ واجد علی شاہ نے اپنے سسُر پر بھروسہ کیا تھا۔ وہ بظاہر بادشاہ کا خیر خواہ تھا لیکن در پردہ تخریبی کارروائیوں میں مصروف رہتا تھا۔ اس

نے محل کے تمام مصاحبوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ سلطنت کا تاجدار بستر علالت پر پڑا ہوا تھا۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ تھا۔ جو بادشاہ کے زبردست خیر خواہ اور حامی تھے اور کسی بھی طرح اس کے دام میں نہیں آتے تھے۔ علی نقی خاں نے طرح طرح کے بہتان لگا کر انہیں شاہی محل سے نکلوا دیا تھا۔

غرضیکہ اندر اور باہر اسی کا طوطی بولنے لگا تھا۔ اس کی ایسی سازشیں زیادہ عرصے تک واجد علی شاہ سے پوشیدہ نہ رہ سکیں۔ وہ جلد از جلد بستر علالت سے اٹھ کر امور سلطنت کو اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتا تھا۔ لیکن صحت نے اجازت نہ دی۔ ایسے ہی وقت اوٹرم صاحب رزیڈنٹ نے علی نقی خاں کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے بادشاہ کو معزول کرنے کی بات کمپنی تک پہنچائی۔

گورنر جنرل نے صاحب رزیڈنٹ کو حکم دیا کہ ملک اودھ کا دورہ کیا جائے اور وہاں کے متعلق جلد از جلد رپورٹ پیش کی جائے۔ چنانچہ ۲۹ نومبر ۱۸۴۹ء میں کرنل سلیمان کو کپتان برڈ کے ہمراہ ملک اودھ روانہ کیا گیا۔ اس نے وہاں پہنچ ہر ایک ضلع کا تفصیلی دورہ کیا۔ محاصل بیگہ کا تخمینہ لگایا گیا۔ ایسے وقت ہر ضلع کے متعلقہ افسران اور ناظمین اس کے ہمراہ ہوتے تھے اور سفیر شاہی کی معرفت رزیڈنٹ سے ملتے تھے۔ علاقے کے وہ افراد جو وزیر کی بے اعتدالیوں سے ناراض تھے۔ انہوں نے رزیڈنٹ کی خدمت میں شکایتی عرضیاں لکھنی شروع کر دیں۔

وہ عرضیاں وزیر کی نااہلی اور بدانتظامی کا کھلا ثبوت ثابت ہو رہی تھیں۔ رزیڈنٹ ان تحریری شکایت ناموں کو وقتاً فوقتاً گورنر جنرل کی خدمت میں بھیجتا رہتا تھا تاکہ وہ ملک اودھ کی بدانتظامی سے باخبر رہے۔

دسمبر ۱۸۴۹ء میں شروع ہونے والا یہ طویل دورہ ۲۷ فروری ۱۹۵۰ء کو اختتام پذیر ہوا۔ اُس دورے کی رپورٹ کے مطابق یہ ثابت ہو رہا تھا کہ بادشاہ واجد علی شاہ سلطنت اودھ کا انتظام سنبھالنے کا اہل نہیں ہے۔ لہٰذا کرنل سلیمان نے گورنر جنرل کو یہ صلاح دی کہ انگریزی سرکار ملک اودھ کا انتظام ہمیشہ کے لئے اپنے ہاتھوں میں لے لے۔

ایسے میں علی نقی خاں انگریزوں کا حمایتی بنا ہوا تھا۔ اس نے ذاتی مفادات کی

خاطر اپنے داماد واجد علی شاہ کے خلاف سازشوں کا بہت زبردست جال بچھایا۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک اودھ کسی اعتراض کے بغیر انگریزوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ لیکن علی نقی خاں کو اپنی اس نمک حرامی اور غداری کا خاطر خواہ صلہ نہ مل سکا۔ رعایا انگریزوں سے الحاق نہیں چاہتی تھی۔ وہ تو بس ملکی انتظامات میں بہتری کی متمنی تھی۔ مگر وہاں تو سلطنت اودھ کی کایا ہی پلٹ کر رہ گئی تھی۔

واجد علی شاہ کے اُس ملک کی سالانہ آمدنی دو کروڑ روپے سے کم نہیں ہوتی تھی۔ مگر انگریزوں نے قبضہ جمانے کے بعد بادشاہ کے سالانہ اخراجات کے لئے صرف پندرہ لاکھ روپے مقرر کئے۔ بے بسی ایسی تھی کہ واجد علی شاہ نے کوئی حجت نہ کی۔ وہ اپنے مقبوضہ اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے انگریز سرکار کے ہر فیصلے کے آگے سر جھکاتا رہا۔ لیکن جب تخت سے معزولی کا حکم سنایا گیا تو بادشاہ سمیت سب ہی مصاحبین اس فیصلے پر چونک گئے۔ اس کے مشیروں نے اسے انگریزوں کے اس حکم کے خلاف آواز اٹھانے کا مشورہ دیا۔ ایک نے کہا۔ ”یہ آپ کے ساتھ سراسر ناانصافی ہے۔ آپ اُن گوروں کے اس فیصلے کو ہرگز تسلیم نہ کریں۔“

دوسرے نے کہا۔ ”اس طرح تو سلطنت اودھ پوری کی پوری ان کے قبضے میں چلی جائے گی۔ یہ کھلی دھاندلی ہے۔ آپ اپنا مقدمہ شہنشاہ ہندوانگلستان کی عدالت میں پیش کریں۔“

آخر کار واجد علی نے اپنے مشیروں کی صلاح کے مطابق یہ فیصلہ کیا کہ وہ بذات خود لندن جا کر معزولی تخت کے فیصلے کو مسترد کرنے کی درخواست پیش کرے گا۔ وہ ملک اودھ کا بادشاہ کہلانے والا بادشاہت کی بھیک مانگنے لندن جانا چاہتا تھا۔

رخت سفر باندھا گیا۔ اس نے اپنے پھوپھا نواب حسام الدولہ بہادر کو لکھنؤ میں اپنا مختار مقرر کیا اور ۳ مارچ ۱۸۵۶ء کو کانپور کی طرف روانہ ہوا۔ ایک ماہ تک وہاں قیام کیا۔ ۱۶ اپریل کو بنارس پہنچا اور پھر وہاں سے کلکتہ آ گیا۔ مصائب کی بھرمار اور سفر کی تکان نے ایسا اثر دکھایا کہ پرانی بیماریاں پھر سے حاوی ہونے لگیں۔ لہٰذا اطباء کی رائے کے مطابق انگلستان کا سفر ملتوی کر دیا گیا۔

علاج معالجے کے باعث اسے کلکتہ میں ہی سکونت اختیار کرنی پڑی۔ ایسے ہی

وقت خبر ملی کہ میرٹھ اور دہلی میں فوج برگشتہ ہو گئی ہے۔ ایسے حالات میں گورنر جنرل نے حفظِ ماتقدم کے طور پر واجد علی شاہ کو قلعہ ولیم فورٹ میں پہنچا دیا۔ اس پناہ گاہ میں پہنچنے کے بعد احساس ہوا کہ تحفظ دینے کے بہانے بادشاہ کو نظر بند کر دیا گیا ہے۔

وہ اس قلعے میں گوروں کے زیر اثر رہ کر نام نہاد بادشاہ بنا رہا۔ ہر وقت انگریز سپاہیوں کے پہرے متعین رہتے تھے۔ کسی کی عرضی یا تحریری پیام بادشاہ تک پہنچنے نہیں دیا جاتا تھا۔ وہ مثل مرغ بے پر کی طرح اس قفس میں تڑپتا رہتا تھا اور آزادانہ بادشاہت کے دنوں کو یاد کرتا رہتا تھا۔

تقریباً چار برسوں کے بعد لارڈ کننگ گورنر جنرل کلکتہ آیا۔ اس نے بادشاہ کو یہ حوصلہ افزا خبر سنائی کہ اسے باغیوں کی وجہ سے قلعہ میں محصور کیا گیا تھا۔ لہٰذا جیسے ہی حالات سازگار ہوں گے اسے مٹیا برج بھیج دیا جائے گا۔

پھر یہی ہوا۔ اسے ولیم فورٹ سے مٹیا برج بھیج دیا گیا۔ وہیں پہنچ کر چراغ زندگی ٹمٹمانے لگا۔ وہ تاجدار اودھ خفیف علالت کے بعد ۲۱ ستمبر ۱۸۸۷ء کو انجمن وجود سے شبستان عدم کو لوٹ گیا اور انتقال کے تیسرے روز اپنے تیار کردہ امام باڑہ میں پیوند زمین ہوا جو مٹیا برج میں واقع ہے۔

ارضِ ہندوستان میں کیسے کیسے نامور اور قابل فخر مسلمان بادشاہ گزرے؟ ایسے ویسے بادشاہ اور نواب بھی گزرے۔ جنہوں نے اسلامی شان و شوکت کو اپنی نا اہلی اور عیاشیوں کے باعث خاک میں ملا دیا۔

کیسی بلندی تھی اور کیسی پستی؟ عروج و زوال کی تمام داستانیں یہاں تمام ہو رہی ہیں۔

ختم شد

تاریخی پس منظر کے ماخذ

بہادر شاہ ظفر اور انکا عہد : رئیس احمد جعفری
برصغیر میں مسلمانوں کا
عروج و زوال : محمد اسماعیل ذبیح
تاریخ اودھ : مولانا محمد نجم الغنی
زوال سلطنت مغلیہ : ثناء الحق صدیقی

☆☆☆

نیم پلیٹ

وہ ننھا منا سا چار ماہ کا بچہ ماں کو نہیں جانتا تھا۔ اس کی ممتا کو نہیں پہچانتا تھا کہ سات سُروں میں ڈوبی ہوئی مترنم آواز کتنے جذبوں سے اسے تھپک تھپک کر لوریاں سنا رہی ہے۔ بانو صدیقہ آدھی آدھی رات تک اسے لوریاں سناتی رہتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اس کی گود میں سو رہا تھا۔ وہ اسے تھپک رہی تھی اور زیر لب گنگنا رہی تھی۔

بچّے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی کسی عالمِ نامعلوم میں گُن گُن' گنگناتی ہوئی میٹھی ممتا سے مست ہو کر سو جاتے ہیں۔ وہ بھی مست ہو کر گہری نیند میں ڈوب گیا تھا۔ مگر ممتا نہیں سو رہی تھی۔ گہری نیند سونے والے پر بھی صدقے واری جا رہی تھی۔ جیسے سانسوں کا تسلسل نہیں ٹوٹتا' ویسے ہی اس کی لوری ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

یہ مائیں بچوں سے ایسی ہی محبت کرتی ہیں' انہیں لوریاں سناتی ہیں' بڑے ہو جائیں تو ان کے پیچھے بھاگتی ہیں' انہیں اپنی طرف پکارتی رہتی ہیں۔ جیسے ہر لمحہ اپنی سانسوں کو پکار رہی ہوں۔ یہ سانسیں نہیں آئیں گی تو بچے کہاں سے آئیں گے؟ اور بچے نہیں آئیں

گے تو سانسیں رک رک جائیں گی۔

ننھا سجاد بھی بانو صدیقہ کے لئے آکسیجن بنا ہوا تھا۔ جب سے گود میں آیا تھا' وہ اسی کی ہو کر رہ گئی تھی۔ امجد بڑی آہستگی سے دروازہ کھول کر کمرے میں آتے ہوئے بولا۔ ''صاحبزادے سو گئے؟''

اس نے سر ہلایا۔ وہ قریب آ کر بیٹے کو دیکھتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔ ''یہ تو گھوڑے گدھے بیچ کر سو رہا ہے اور تم ایسے تھپک رہی ہو جیسے کچی نیند میں ہو؟ چلو آؤ۔ سو جاؤ..... بہت رات ہو گئی ہے۔''

بچے کا پالنا بیڈ کے اس کنارے پر رہتا تھا' جس کنارے وہ سوتی تھی۔ یعنی سوتے وقت بھی وہ اسے اپنے ہی کنارے لگائے رکھتی تھی۔ دوسرے کنارے سے میاں صاحب نے آواز دی۔ ''بانو! اسے سونے دو۔ اس کا باپ جاگ رہا ہے۔ لبِ دریا پیاسا ہے۔''

وہ بیٹے کی طرف منہ کئے لیٹی ہوئی تھی۔ زیرو پاور کی روشنی میں اس کا ننھا مُنا سا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس ننھے سے چہرے کے پیچھے مستقبل کے بڑے بڑے سپنے اور بڑی بڑی خوشیاں جھلملا رہی تھیں۔ امجد نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو اس نے کسمساتے ہوئے کہا۔ ''توبہ ہے۔ سو جائیں۔ مجھے صبح نماز پڑھنی ہے۔''

''تو کیا ہوا؟ سردی کا موسم تو ہے نہیں۔ غسل کر کے نماز پڑھ لینا۔''

وہ صوم وصلوٰۃ کی پابند اور تہجد گزار تھی۔ اکثر دینی محفلوں میں خواتین کو درس دیا کرتی تھی۔ لیکن بیٹے نے اپنے لئے اس کی مصروفیات بڑھا دی تھیں۔ اس کی ننھی ننھی ضرورتیں ایسی ہوتی تھیں کہ وقت پر نماز کی ادائیگی نہیں ہو پاتی تھی۔

اور میاں صاحب کہہ رہے تھے' فجر کی نماز قضاء نہیں ہونے دیں گے۔ ایک عورت کے لئے دینی فرائض' اولاد کے فرائض اور شوہر کے فرائض کی ادائیگی لازمی ہوتی ہے۔ لیکن بعض بیویاں بیڈ کے اس کنارے پالنے کی طرف پہنچ کر دوسری سمت جانے سے کتراتی ہیں۔ یہ بھول جاتی ہیں کہ بچہ دوسرے ہی کنارے سے آیا ہے۔

امجد نے لائٹ آف کر دی۔ وہ بڑی کُند ذہن تھی۔ بھولا ہوا سبق یاد دلاؤ' تب ہی یاد کیا کرتی تھی۔ کچھ بھی ہو' جب تک سانسیں چلتی رہتی ہیں' اپنی طرف سے تمام حقوق ادا

کرنے ہی پڑتے ہیں۔

رفتہ رفتہ اس کے اندر یہ بات پیدا ہونے لگی کہ وہ اولاد کی خوشی اور محبت میں عشقِ حقیقی سے غافل ہوتی جا رہی ہے۔ زندگی کی مصروفیات چاہے جیسی بھی ہوں۔ عبادت میں کوتاہی نہیں ہونی چاہئے۔ لہٰذا سجاد کے لئے ایک آیا کا انتظام کیا گیا۔ جب تک وہ حالتِ عبادت میں رہتی تھی۔ تب تک آیا بچے کو بہلاتی رہتی تھی۔ پھر وہ فارغ ہوتے ہی بیٹے کو سینے سے ایسے لگا لیتی تھی' جیسے جائے نماز سے اٹھتے ہی عبادت کا پھل مل رہا ہو۔

اس وقت وہ عشاء کی نماز ادا کر رہی تھی۔ چار فرض کی نیت باندھتے ہی اس کی ممتا ایکدم سے تڑپ اٹھی۔ بیٹے کے رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ دل و دماغ عبادت سے ہٹ کر اس کی طرف بھٹکنے لگے۔ وہ آنکھیں بند کر کے نماز پر پوری توجہ دینے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر دل تھا کہ بیٹے کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ آیا اسے ہزار بہانوں سے بہلا رہی تھی لیکن وہ تو جیسے چپ نہ ہونے کی قسم کھائے ہوئے تھا۔ بلک بلک کر روئے چلا جا رہا تھا۔

وہ بے چین ہو رہی تھی۔ ادھر پیاسا بلبلا رہا تھا۔ ادھر ممتا کا سمندر سینے میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ بارگاہِ الٰہی میں سجدے لازمی تھے اور ایک پیاسے کو لبِ دریا لانا بھی ضروری تھا۔ بار ہا جی میں آیا کہ نماز سے اٹھ جائے۔ گویا اپنے ربّ کے سامنے سے اٹھ جائے۔ دینی اور دنیاوی فرائض کے درمیان جہاد کرتے ہوئے اپنے ایمان پر قائم رہنا بہت بڑی عبادت ہے۔ ممتا اسے تڑپاتی رہی اس کے باوجود وہ اپنے ربّ سے نہیں پھری۔ سلام پھیرتے ہی اس نے لپک کر بیٹے کو آغوش میں لیا اس کے بعد ممتا کے خزانے لٹانے لگی۔

آیا نے کہا۔ ''منے میاں نے تو آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ میں سمجھ رہی تھی' آپ پریشان ہو کر نماز توڑ دیں گی۔''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''یہ میری زندگی ہے۔ لیکن زندگی پہلے بندگی ہے۔''

آیا بڑی عقیدت سے بولی۔ ''بیگم صاحبہ! آپ بڑی گہری باتیں کرتی ہیں۔ لیکن ایسے کرتی ہیں کہ مجھ جیسی جاہل عورت بھی آسانی سے سمجھ لیتی ہے۔''

''ہمارا دین بھی گہرا ہے لیکن سمجھنے والوں کے لئے آسان ہے۔ ایک بات بتاؤ' تم نماز کیوں نہیں پڑھتیں؟ کیا پڑھنی نہیں آتی؟''

"آتی ہے۔لیکن مصروفیت ایسی ہوتی ہے کہ....."

صدیقہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔"تینوں وقت باقاعدگی سے کھانا کھاتی ہو؟"

یہ سوال سن کر وہ ایک ذرا جھینپ سی گئی۔صدیقہ نے کہا۔"کاش! عبادتِ الٰہی ہماری بھوک بن جائے....."

پھر وہ بیٹے کو اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔"اسے لے جاؤ۔میں نماز پوری کرلوں۔"

آیا سجاد کو سینے سے لگا کر وہاں سے چلی گئی۔وقت گزرتا ہے تو گزرتا ہی چلا جاتا ہے۔سالگرہ کے کیک پر موم بتیوں کی تعداد بڑھنے لگی۔وہ جھولے میں جھولنے والا ماں کی گود سے اتر کر پورے گھر میں دوڑنے بھاگنے لگا تھا۔صدیقہ تو اسے دیکھ دیکھ کر نہال ہوئی جاتی تھی۔پانچویں سالگرہ کے موقع پر اس نے امجد سے پوچھا۔"آپ نے بتایا نہیں' سجاد کو کیا گفٹ دینے والے ہیں؟"

"تم نے بھی تو نہیں بتایا۔"

"وہ تو ایک سرپرائز ہے۔"

"تو بس میں بھی سرپرائز دینے والا ہوں۔"

برتھ ڈے پارٹی کے لئے کوٹھی کے لان کو بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔شام ہوتے فینسی لائٹس آن کر دی گئیں۔پوری کوٹھی رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگانے لگی۔پودوں کے درمیان لگائے گئے قمقمے روشن ہو کر ایسا نظارہ پیش کر رہے تھے' جیسے پودوں کے درمیان سے جگنو جھانک رہے ہوں۔

مہمانوں کی آمدورفت کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ایک سینٹر ٹیبل پر سالگرہ کا بڑا سا کیک رکھا ہوا تھا۔دوسری ٹیبل پر بڑے بڑے گفٹ پیکٹس رکھے ہوئے تھے۔وہ بیٹے کو اپنا سرپرائز گفٹ دینے کے لئے بے چین تھی۔اسے گود میں اٹھائے ادھر سے ادھر اڑتی پھر رہی تھی۔مختلف ملازم مہمان نوازی میں مصروف تھے۔ایک سہیلی نے کہا۔"تم تو بیٹے کی دیوانی ہو۔"

دوسری نے کہا۔"اتنا بڑا بچہ گود میں اچھا نہیں لگتا۔"

صدیقہ بیٹے کی پیشانی کو چومتے ہوئے بولی۔"اور مجھے خالی گود رہنا اچھا نہیں لگتا۔"

"ہم بھی اپنے بچوں سے محبت کرتی ہیں۔لیکن تم تو نرالی ماں ہو۔"

دوسری نے کہا۔"ایسی شدت شائد اس لئے ہے کہ اب دوبارہ ماں نہیں بن سکوگی؟"

صدیقہ مسکرا رہی تھی۔سہیلی کی بات سنتے ہی سنجیدہ ہوگئی۔یہ کڑوی حقیقت یاد آگئی کہ اب وہ کبھی ماں نہیں بن سکتی۔پہلی ڈیلیوری کے وقت ایسی پیچیدگیاں پیدا ہوگئی تھیں کہ ڈاکٹر نے بڑے تجربے اور مہارت سے زچہ اور بچے کی جان بچائی تھی اور یہ مستحکم پیش گوئی کی تھی کہ وہ آئندہ ماں نہیں بن سکے گی۔اب وہ پہلا بچہ ہی آخری بچہ تھا۔اس لئے وہی اس کی کل کائنات بن گیا تھا۔

وہ بولی۔"میرے لئے میرا سجاد ہی کافی ہے۔"

ننھے سجاد نے پوچھا۔"ماں! میں کیک کب کاٹوں گا؟"

وہ مسکرا کر بولی۔"بس۔ابھی کاٹتے ہیں۔"

وہ وہاں سے چلتی ہوئی ان سہیلیوں سے دور جانے لگی۔ایک نے کہا۔"صدیقہ جیسی ایجوکیٹڈ عورت کا بچہ جب منہ پھاڑ کر ماں کہتا ہے تو بڑا عجیب سا لگتا ہے۔"

ایک اور نے کہا۔"یہ تو بس ایسی ہی ہے۔سر سے گردن تک اور سینے تک دوپٹے کو یوں لپیٹ رکھا ہے' جیسے ابھی نماز پڑھ کر آرہی ہو اور ہم پر پھونکیں مارنے والی ہو۔"

ایک اور سہیلی نے کہا۔"یہی بچہ اسے ممی یا ماما کہتا تو پتہ چلتا کہ واقعی ایک پڑھی لکھی خاتون کا بیٹا ہے۔"

"لیکن یہ بات صدیقہ کی سمجھ نہیں آتی۔"

"وہ بڑا ہو کر خود ہی سمجھا دے گا۔"

صدیقہ کے حوالے سے ہر محفل میں عورتیں کے درمیان ایسی ہی باتیں کرتی رہتی تھی۔وہ سجاد کو گود میں لئے میز کے پاس آگئی۔وہاں امجد مہمانوں کے ساتھ موجود تھا۔بڑے سے قلعہ نما کیک پر لگی ہوئی موم بتیاں روشن کر دی گئیں۔وہ سجاد کو ذرا جھکاتے ہوئے بولی۔"پھونک مارو بیٹے...!"

وہ پھونکیں مارتے ہوئے ایک ایک موم بتی بجھانے لگا۔ کیک کاٹنے لگا۔ سب ہی تالیوں کی گونج میں اسے "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو" کہنے لگے۔ سجاد نے کیک کا ایک پیس اٹھا کر پہلے ماں کو اور پھر باپ کو کھلایا۔

ایک خاتون نے کہا۔ "سجاد کو سب ہی نے گفٹ دیئے ہیں۔ تم دونوں نے بیٹے کو کوئی گفٹ نہیں دیا؟"

امجد نے مسکرا کر اپنی بیگم کو دیکھا۔ وہ بولی۔ "پہلے آپ اپنا تحفہ پیش کریں۔"

امجد نے ایک ملازم کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ایک بڑا سا لفافہ لے کر آیا۔ بیٹا کسی بڑے سے کھلونے کی توقع کر رہا تھا۔ باپ نے اس کے چہرے کو پڑھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں ریموٹ کنٹرول والی کار اور ہوائی جہاز لا کر دیا ہے۔ لیکن سب کے سامنے یہ تحفہ پیش کر رہا ہوں۔"

سجاد سوالیہ نظروں سے اس لفافے کو دیکھنے لگا۔ صدیقہ اسے لے کر کھولتے ہوئے بولی۔ "ذرا دیکھیں تو کیا ہے اس میں....؟"

وہ اسے کھولنے لگی۔ امجد نے مہمانوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے بیٹے کے لئے پچاس لاکھ روپے کی بیمہ پالیسی ہے۔"

سب ہی زور زور سے تالیاں بجانے لگے۔ صدیقہ نے خوش ہو کر بیٹے کو چومتے ہوئے کہا۔ "ابھی تم نہیں سمجھو گے۔ جوان ہو کر اپنے بابا کے گن گاؤ گے کہ وہ ابھی سے تمہارے مستقبل کو تحفظ دے رہے ہیں۔"

امجد نے بیگم سے کہا۔ "اب اپنا سرپرائز دکھاؤ۔"

وہ اپنے پرس کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "آپ نے اتنا بڑا گفٹ دیا ہے کہ اس کے سامنے میرا تحفہ محض جذباتی سا ہو کر رہ گیا ہے۔"

اس نے ایک مخملی ڈبیہ نکال کر اسے کھولا۔ اس میں سونے کی ایک چین اور لاکٹ جگمگا رہا تھا۔ اس لاکٹ کے اوپری حصے پر انگریزی حروف تہجی کا حرف بی اور ایس کندہ کیا گیا تھا۔ وہ بسم اللہ پڑھ کر اسے بیٹے کے گلے میں پہناتے ہوئے بولی۔ "میں ہر وقت، ہر لمحے اپنے بیٹے کے سینے سے لگی رہنا چاہتی ہوں۔ یہ ناممکن سی بات لگتی ہے مگر میں نے اسے

ممکن بنا دیا ہے۔"

اس نے لاکٹ کو کھولا تو اس میں صدیقہ کی تصویر سجی ہوئی تھی۔ سجاد سر جھکا کر لاکٹ کو دیکھ رہا تھا۔ خوش ہو کر اسے باپ کو دکھاتے ہوئے بولا۔ "بابا......! ماں...."

تمام حاضرین تالیاں بجانے لگے۔ وہ بولی۔ "اب یہ جہاں بھی جائے گا۔ میں ہمیشہ اس کی دھڑکنوں سے لگی رہوں گی۔"

سجاد اس کی گود سے اتر کر دوڑتا ہوا اپنے ننھے دوستوں کے پاس چلا گیا تھا۔ لاکٹ کھول کر ایک ایک کو ماں کی تصویر دکھا رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا۔ کھلونوں سے بہلنے کی عمر میں ماں کی تصویر سے بہل رہا تھا۔

☆☆☆

اسکول ٹیچر کافی دیر سے نوٹ کر رہی تھی کہ سجاد کا سر بدستور جھکا ہوا ہے۔ صاف سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ پڑھائی کی طرف متوجہ نہیں ہے۔ وہ چپ چاپ چلتی ہوئی اس کے قریب آ گئی۔ اس کی ننھی ہتھیلی پر وہ لاکٹ کتاب کی طرح کھلا ہوا تھا۔ ٹیچر نے چیئر پر اسٹک بجائی تو وہ ایکدم سے چونک گیا۔

"سجاد...! یہ کیا ہو رہا ہے؟"

وہ ایکدم سے گڑبڑا گیا۔ فوراً ہی لاکٹ کو شرٹ کے اندر چھپاتے ہوئے بولا۔ "جی... جی مس...!"

"کھڑے ہو جاؤ۔ یہ تم نے کیا چھپایا ہے؟"

وہ کھڑا ہو کر بولا۔ "وہ... کچھ نہیں..."

ٹیچر شرٹ کے اندر سے اس لاکٹ کو نکالتے ہوئے بولی۔ "یہ کیا ہے؟"

وہ بڑی معصومیت سے بولا۔ "میری ماں ہے۔"

"تم نہیں جانتے، اسکول میں ایسی چیزیں لانا منع ہے۔ اتارو اسے....."

وہ گھبرا کر بولا۔ "نو مس! ماں نے کہا ہے، اسے کبھی نہ اتارنا۔"

"میں تمہاری ممی سے بات کروں گی۔ اسے اتار کر مجھے دو۔ چھٹی کے وقت لے لینا۔ ہری اپ...."

وہ رونے لگا۔ اس لاکٹ کو شرٹ کے اندر چھپاتے ہوئے بولا۔ ''اب نہیں نکالوں گا۔ پرومس''

''میں نے کہا نا... چھٹی کے وقت لے لینا۔ لاؤ... مجھے دو....''

وہ ماں سے الگ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ مگر ٹیچر سے بحث بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے جبراً لاکٹ کو اتار کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ اپنی کرسی پر آ گئی۔ سجاد کا دھیان اسی لاکٹ کی طرف تھا۔ ٹیچر اسے اپنے سامنے میز پر رکھتے ہوئے تمام بچوں سے بولی۔ ''بک فرسٹ اسٹیپ نکالو۔ سجاد! بیٹھ جاؤ...''

وہ آنسو پونچھتا ہوا کتاب کھول کر بیٹھ گیا۔ ٹیچر نے بلند آواز میں کہا۔ ''اے فار...؟''

تمام بچوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ ''ایپل.....''

سجاد خاموش تھا۔ اس کی نظریں بھٹک بھٹک کر میز کی طرف جا رہی تھیں۔ ٹیچر نے ڈپٹتے ہوئے کہا۔ ''سجاد! کھڑے ہو جاؤ''

وہ سہم کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے پوچھا۔ ''اے فار....؟''

وہ روہانسی آواز میں بولا۔ ''ایپل....''

''بی فار....؟''

نظروں کے عین سامنے میز پر لاکٹ رکھا ہوا تھا۔ وہ بے اختیار بولا۔ ''بانو....''

ٹیچر نے چونک کر پوچھا۔ ''بانو...؟''

کلاس کے تمام بچے ہنسنے لگے۔ ٹیچر نے انہیں خاموش کراتے ہوئے سجاد سے پوچھا۔ ''یہ بی فار بانو کیا ہوتا ہے؟''

وہ اپنے لاکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑی معصومیت سے بولا۔ ''وہاں لاکٹ پر بی اور ایس لکھا ہوا ہے۔ اس کا مطلب ہے بی فار بانو اور ایس فار صدیقہ....''

ٹیچر مسکرا کر بولی۔ ''یہاں لاکٹ نہیں۔ کتاب پڑھو۔ بی فار بٹر فلائی ہوتا ہے۔ بیٹھ جاؤ....''

وہ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ جب چھٹی ہوئی تو ٹیچر وہ چین لاکٹ اسے دیتے ہوئے بولی۔ ''یہ لو۔ کل پہن کر آؤ گے تو واپس نہیں کروں گی۔''

وہ اسے لے کر پہننے لگا۔ ٹیچر کے جاتے ہی کلاس کے بچے اس کا مذاق اڑانے لگے۔ چیخ چیخ کر کہنے لگے۔ ''بی فار بانو.... بی فار بانو......''

وہ چپ چاپ اپنا بیگ اٹھا کر کلاس روم سے باہر آ گیا۔ صدیقہ اسکول گیٹ کے پاس اس کی منتظر تھی۔ وہ دوڑتا ہوا آ کر اس سے لپٹ گیا۔ روتے ہوئے بولا۔ ''میری مس اچھی نہیں ہے۔''

وہ اکڑوں بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''کیوں؟ کیا ہوا میری جان...!''

وہ بتانے لگا۔ وہ تمام باتیں سن کر بولی۔ ''میں نے سمجھایا تھا ناں' لاکٹ کو شرٹ سے باہر نہ نکالنا؟''

''اب نہیں نکالوں گا۔ پلیز۔ آپ میری مس سے کہہ دیں۔ مجھے یہ اچھا لگتا ہے۔''

اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ''کیوں اچھا لگتا ہے؟''

وہ اس کی گردن میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولا۔ ''اس میں آپ رہتی ہیں۔''

وہ خوش ہو کر اس سے لپٹتے ہوئے بولی۔ ''میں صدقے میری جان....! آئندہ اسے یہاں نہ پہننا۔ ورنہ ٹیچر رکھ لے گی۔''

پھر وہ اسے گود میں اٹھا کر گاڑی کی طرف جانے لگی۔ وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''ماں! میں اسے پہن نہیں سکتا لیکن اپنے بیگ میں چھپا کر تو رکھ سکتا ہوں۔ مس کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔''

وہ منہ دبا کر ہنسنے لگا۔ صدیقہ اسے فرنٹ سیٹ پر بٹھا کر اس کی بلائیں لیتے ہوئے بولی۔ ''میرا بچہ مجھے کتنا چاہتا ہے؟ آئی ایم پراؤڈ آف یو مائی سن...!''

وقت بدلتا ہے' عمر بدلتی ہے تو زندگی کے تقاضے بھی بدل جاتے ہیں اور طور طریقے بدل جاتے بھی... بچپن کے بعد جوانی نے خوش آمدید کہا تو بیٹے کے جینے کا ڈھنگ بدلنے لگا۔ دنیا ایک نئے انداز سے دکھائی دینے لگی تھی۔ وہ اسکول اور کالج کی محدود زندگی سے نکل کر یونیورسٹی کی آزاد فضاؤں میں پہنچ گیا تھا۔

جوانی کی دُوربین آنکھوں پر لگتی ہے تو زندگی کی رنگینیاں اور دلچسپیاں جیسے دل میں اترنے لگتی ہیں۔ مگر سجاد کے دل پر تو وہ لاکٹ رکھا رہتا تھا۔ دل کے دروازے پر پہرہ دیتا رہتا تھا۔ کسی کو اندر نہیں آنے دیتا تھا۔ صدیقہ نے بھرپور دینی ماحول میں اس کی پرورش

کی تھی۔ وہ اسی کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا۔ صوم وصلوٰۃ کا پوری طرح پابند تو نہیں تھا لیکن پانچوں وقت کی نمازیں باقاعدگی سے ادا کیا کرتا تھا۔

اس کے ایک دوست یاسر نے کہا۔ ''یار! تم کب تک ماں کے لاڈلے بنے رہو گے؟ کسی سے دل لگانا نہیں چاہتے تو دل لگی کے لئے ہی دل لگاؤ۔''

وہ اکثر ہی اسے ایسی ہدایتیں کرتا رہتا تھا۔ سجاد نے بیزاری سے کہا۔ ''تم میرا مزاج جانتے ہو' پھر کیوں پیچھے پڑے رہتے ہو؟''

یاسر نے ایک ہائے کے ساتھ کہا۔ ''ذرا اِدھر دیکھو.... میرے یار...!''

اس نے ایک سمت اشارہ کیا۔ سجاد نے ادھر دیکھا۔ وہاں یونیورسٹی کی چند لڑکیاں باتوں میں مصروف تھیں۔ یاسر دوسری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ذرا اُدھر دیکھو...!''

اس نے اشارے کا تعاقب کیا' وہاں بھی لڑکیاں دکھائی دیں۔ یاسر نے کہا۔ ''دنیا ایسی رنگ برنگی تتلیوں سے بھری پڑی ہے۔''

وہ سر جھٹک کر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''ان کے رنگ کچے ہوتے ہیں۔''

وہ اس کے پیچھے آتے ہوئے بولا۔ ''مہندی کا رنگ بھی کچا ہوتا ہے۔ چڑھتا ہے اور اتر جاتا ہے۔ مگر زندگی میں کیسی شادمانیاں بھر دیتا ہے؟ ایک دلہن سہاگ کے اس رنگ کے بغیر ادھوری رہتی ہے۔''

''شادی اور دل لگی... دو الگ الگ باتیں ہیں۔ مثالیں دینی نہیں آتیں تو کیوں اتنا بولتے ہو؟''

''تم پتھر ہو۔ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ 'میم' سے ماں ہوتی ہے تو 'میم' سے محبوبہ بھی ہوتی ہے۔''

وہ رُک کر بولا۔ ''میں کسی کو حرف سے نہیں۔ ظرف سے پہچاننا چاہتا ہوں۔ ایک بات جانتا ہوں' عشق صرف اپنے خالق سے ہوتا ہے۔ خدا بھی پیدا کرتا ہے۔ ماں بھی پیدا کرتی ہے۔ باقی ساری رشتے آنے جانے والے ہیں۔''

''تم تو ایسے کہہ رہے ہو' جیسے ماں کے بعد کوئی دوسری عورت تمہاری زندگی میں نہیں آئے گی؟''

''آئے گی۔ مگر وہ محبوبہ نہیں۔ بیوی ہوگی۔''

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس سے آگے نکل گیا۔ وہ اپنا سر پیٹتے ہوئے بولا۔ ''میں بھی کس سے متھا پھوڑتا رہتا ہوں؟''

یاسر کی گرل فرینڈ کافی دیر سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ قریب آکر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''وہ اپنی ماں کا میاں مٹھو ہے۔ تمہاری بولی نہیں سیکھے گا۔ کیوں اس کے پیچھے پڑے رہتے ہو؟''

''عجیب شخص ہے۔ ایسی بور جوانی کسی پر نہیں آئی ہوگی۔''

''وہ تو ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر کوفت ہوتی ہے کہ وہ ہر وقت سینے پر ماں کی تصویر سجائے پھرتا ہے۔''

نبیلہ نے ان کے قریب آتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ اچھا لگتا ہے کہ وہ گرل فرینڈز کے عذاب سے دور رہتا ہے۔''

اس لڑکی نے کہا۔ ''وہ تم سے بھی دور رہتا ہے میڈم! اس گھوڑے کی لگام ماں کے ہاتھ میں ہے۔''

نبیلہ نے لاپرواہی سے کہا۔ ''میرا پیار مجھے سمجھاتا ہے' لگام ماں کے ہی ہاتھ میں ہے ناں... کسی ایری غیری کے ہاتھوں میں ہوتی تو مجھے فکر ہوتی۔''

پھر وہ یاسر کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''اور تم کیا اسے پٹیاں پڑھا رہے تھے؟''

''مجھے آنکھیں نہ دکھاؤ۔ میں تمہارے ہی لئے راستہ ہموار کرتا رہتا تھا۔''

''مجھے اپنے راستے ہموار کرنے آتے ہیں''

اس نے اپنے گریبان میں سے چین لاکٹ نکال کر انہیں دکھاتے ہوئے کہا۔ ''لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ یہ دیکھو...!''

اس نے لاکٹ کو کھولا تو وہاں نبیلہ کی ماں صنوبر کی تصویر سجی ہوئی تھی۔ یاسر نے خوش ہو کر کہا۔ ''گریٹ آئیڈیا..... تم خود کو اس کی ہم مزاج ظاہر کرو گی تو وہ ضرور متاثر ہوگا۔''

وہ مسکراتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''پھر میں کہوں گی کہ ہم مزاج مل جائے تو اسے زندگی کا ہمسفر بنالینا چاہیئے۔''

نبیلہ سجاد کی کلاس فیلو نہیں تھی۔ مگر اس کی لائف فیلو بننا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لئے اچھی طرح اس کی اسٹڈی کر رہی تھی۔ اس کے مزاج کو سمجھتی جا رہی تھی۔ محبت میں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی تھی۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ نبیلہ ممتا کی کہکشاں سے آگے جانے کے لئے کورس کی کتابوں کو پیچھے چھوڑ رہی ہے اور اسے پڑھتی جا رہی ہے۔

سب سے پہلے سجاد پر یہ تاثر ڈالنا تھا کہ وہ بھی اس کی طرح اپنی ماں کو بہت اہمیت دیتی ہے۔ جوانی کی دہلیز پر بھی کسی محبوب کو نہیں ماں کو سینے سے لگائے رکھتی ہے۔

سجاد ایک بینچ پر بیٹھا کسی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ نبیلہ سوچی سمجھی پلاننگ کے مطابق اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے پریشانی سے بولی۔ ”یا اللہ! اسے کہاں ڈھونڈوں؟“

سجاد نے ایک ذرا سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ چہرے سے پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ ادھر ادھر ایسے گھوم رہی تھی‘ جیسے کچھ تلاش کر رہی ہو۔ یاسر نے وہاں آتے ہوئے پوچھا۔ ”نبیلہ! کیا ہوا؟“

وہ تقریباً روتے ہوئے بولی۔ ”میرا لاکٹ گم ہو گیا ہے؟ اس چین سے نکل کر پتہ نہیں کہاں گر گیا ہے؟“

یاسر متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں یقین ہے‘ وہ یہیں گرا ہے؟“

”ہاں۔ میں کچھ دیر پہلے یہیں تھی۔“

وہ رونے لگی۔ یاسر اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ”مل جائے گا یار! اس میں رونے کی کیا بات ہے؟“

”تم نہیں سمجھتے۔ وہ لاکٹ بہت اہم ہے۔“

سجاد انہیں دیکھ رہا تھا۔ یاسر نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہیں کوئی لاکٹ ملا ہے؟“

وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”نہیں تو..... اگر یہ مجھ سے پہلے یہیں بیٹھی تھیں تو پھر اسے....“

وہ بات ادھوری چھوڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یاسر اور نبیلہ چور نظروں سے ایک

دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔ لاکٹ کو اس کے قریب ہی پھینکا گیا تھا۔ سجاد کی نظریں دائیں بائیں بھٹک رہی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ بینچ کے دائیں طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ”یہ... یہاں پڑا ہے۔“

اس نے لاکٹ کو اٹھایا۔ نبیلہ نے بڑے ڈرامائی انداز میں خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس لاکٹ کو جھپٹ لیا۔ ”تھینکس گاڈ!“ وہ اسے بے اختیار چومنے لگی۔ سجاد نے مسکرا کر کہا۔ ”تم تو اسے ایسے چوم رہی ہو جیسے یہ بڑی مقدس چیز ہو۔“

نبیلہ لاکٹ کھول کر ماں کی ننھی سی تصویر پر انگلی پھیرتے ہوئے بولی۔ ”ماں کا رشتہ مقدس ہی تو ہوتا ہے۔“

سجاد نے چونک کر کہا۔ ”ماں....؟“

وہ کھلے ہوئے لاکٹ کو اس کے سامنے کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ میری امی ہیں۔ ہمیشہ میرے سینے سے لگی رہتی ہیں۔“

سجاد خوش ہو کر بولا۔ ”تم اپنی ماں سے اتنا پیار کرتی ہو۔ تم نے پہلے کبھی اس لاکٹ کا ذکر نہیں کیا؟“

وہ بولی۔ ”کیا کرتی؟ یہاں کسی کی نظر پڑ جائے تو وہ مذاق اڑاتا ہے کہ اس عمر میں محبوب کے بجائے ماں کی تصویر لئے پھرتی ہوں۔“

وہ تائید میں سر ہلانے لگا۔ وہ بینچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”کیا..... میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟“

وہ فوراً ہی کھسک کر ایک طرف ہوتے ہوئے بولا۔ ”ہاں۔ ہاں۔ کیوں نہیں...؟“

یاسر نے وہاں سے جاتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔ ”اسے شہ مات کہتے ہیں۔ عورتیں چالیں چلنا خوب جانتی ہیں۔“

نبیلہ چین سے بچھڑے ہوئے لاکٹ کو جوڑتے ہوئے بولی۔ ”جب بچھڑے ہوئے مل جائیں تو انہیں جوڑ دینا چاہئے۔“

پھر وہ اسے بڑے جذبے سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ہم جسے چاہتے ہیں‘ وہ مل جائے تو کتنی خوشی ہوتی ہے؟“

"تم اپنی امی کو بہت چاہتی ہو۔"

"کیا تم اپنی امی کو نہیں چاہتے؟"

"چاہتا ہوں۔ یہ دیکھو...!"

اس نے شرٹ کے اندر سے لاکٹ نکال کر اسے کھولتے ہوئے دکھایا پھر پوچھا۔ "تمہیں یاد ہے ناں.. پرسوں مئی کے مہینے کا دوسرا اتوار ہے۔"

وہ یاد کرنے کے انداز میں بولی۔ "ہاں آج جمعہ ہے تو پرسوں اتوار ضرور ہوگا۔"

"کتنا اہم ہوتا ہے یہ دن...؟ میں تو سال بھر مئی کے اس اتوار کا انتظار کرتا رہتا ہوں۔"

اس نے مسکرا کر کہا۔ "تمہاری بے چینی دیکھ کر لگتا ہے پرسوں تمہاری برتھ ڈے ہے۔"

وہ اسے تعجب سے دیکھ کر بولا۔ "برتھ ڈے...؟ اس کا مطلب ہے' تم مئی کا دوسرا سنڈے نہیں مناتیں؟ بلکہ اس کے بارے میں جانتی ہی نہیں ہو؟"

وہ الجھ کر بولی۔ "میں سمجھ نہیں پا رہی ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"مئی کے مہینے میں دوسرے اتوار کو پوری دنیا میں ماؤں کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔"

وہ ایکدم سے چونک گئی۔ فوراً ہی سنبھلتے ہوئے بولی۔ "اوہ انٹرنیشنل مدرز ڈے...؟ ہاں۔ مناتی ہوں۔ بالکل مناتی ہوں۔"

"مگر ابھی تو تم ایسے انجان بنی ہوئی تھیں۔ جیسے اس اتوار کی اہمیت سے واقف ہی نہیں ہو؟"

وہ دل ہی دل میں اس ماں کے دُلارے سے بیزار ہو رہی تھی۔ ایک حسین اور نوجوان لڑکی اتنے قریب بیٹھی تھی۔ رومانس بھری باتیں ہونی چاہئے تھیں مگر وہ ماؤں کے عالمی دن کی بات کر رہا تھا۔ وہ اپنی طرف سے صفائی پیش کرتے ہوئے بولی۔ "وہ... دراصل میں اس اہم دن کو اتوار نہیں کہتی۔ مدر ڈے کہتی ہوں۔ اس لئے تمہاری بات سمجھ نہیں پائی۔"

"اوہ... اچھا۔ بائی دا وے تم اس روز کیا کرتی ہو؟"

وہ جبراً مسکرا کر بولی۔ "ظاہر ہے۔ امی کو گفٹ دیتی ہوں۔ کیک کاٹا جاتا ہے۔ اس روز مجھے سوائے امی کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ بس یوں سمجھو! سارا دن ان کے ساتھ گزارتی ہوں۔"

"میں بھی یہی کرتا ہوں۔ بہت کم لوگ مدر ڈے کو اتنے جوش و خروش سے مناتے ہیں۔"

وہ آگے بھی کچھ کہنا چاہتا تھا۔ وہ جلدی سے موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ "سال میں اور بھی بہت سے ڈے منائے جاتے ہیں۔ ویلینٹائن ڈے تمہیں کیسا لگتا ہے؟"

وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "اچھا لگتا ہے۔ مگر میں نے کبھی نہیں منایا۔"

"کیوں نہیں منایا؟"

وہ دوسری طرف منہ پھیرتے ہوئے بولا۔ "میں ایسی محبت کو نہیں مانتا' جو پھول کے ساتھ کھلے اور مرجھا جائے۔ ویسے بھی میری زندگی میں ابھی تک کوئی ایسی نہیں آئی جسے سرخ گلاب پیش کروں۔"

وہ اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر بولی۔ "اور آجائے تو....؟"

"وہ آنے والی بے حیا ہوگی۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا "تم نے کیسے سمجھ لیا' وہ بے حیا ہوگی؟"

"جو ماں باپ کو چھوڑ کر ایک غیر مرد کے پاس آئے تو کیا اسے بے حیا نہیں کہیں گے؟"

"دنیا کی ساری لڑکیاں ماں باپ کو چھوڑ کر ایک غیر مرد کی دلہن بن جاتی ہیں۔ کیا تم انہیں بے حیا کہو گے؟"

"کبھی نہیں۔ شادی کرنا' دلہن بننا اچھی بات ہے مگر شادی سے پہلے کسی سے ملنے والی لڑکیاں اپنے والدین کو اور پورے خاندان کو بدنام کرتی ہیں۔"

"لیلیٰ مجنوں۔ شیریں فرہاد۔ ہیر رانجھا سب ہی سچے عاشق تھے۔ کیا وہ بے شرم تھے؟"

"کم عقل تھے۔ لیلیٰ اور ہیر نے اپنے ماں باپ کو بدنام کیا۔ شیریں نے فرہاد کو اُلّو بنایا کہ پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکالو اور اس کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ دودھ گائے اور بھینسیں دیتی ہیں' پہاڑ نہیں دیتا۔"

"تم یہ کیوں نہیں سوچتے' شادی سے پہلے محبت کرنے والے ایک دوسرے کو

اچھی طرح سمجھتے رہتے ہیں۔ بعد میں ان کی ازدواجی زندگی اچھی گزرتی ہے۔"

"میری ماں نے میری ماں کی ماں نے میرے بابا کو اور میرے نانا کو شادی سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ بعد میں وہ کامیاب ازدواجی زندگی گزارتے رہے اور اب بھی گزار رہے ہیں۔"

وہ ذرا چپ ہوا پھر اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہم یہ بحث کیوں کر رہے ہیں؟"

وہ اس سوال پر ایک ذرا گڑبڑا گئی۔ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "اس لئے کہ..... ہمارے پاس محبت جیسے لطیف جذبے کو سمجھنے والا دل ہے۔"

"تم مجھ سے پوچھ رہی ہو۔ اپنی سناؤ، کبھی کسی سے محبت کی ہے؟ کبھی کسی نے تمہیں سرخ گلاب پیش کیا ہے؟"

وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ "مجھے سرخ گلاب کی نہیں.... سرخ جوڑے کی تمنا ہے۔ پھول تو سب ہی لئے پھرتے ہیں۔"

وہ اسے گہری سنجیدگی سے دیکھنے لگا۔ دیکھنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کچھ اُلجھ سا گیا ہے اور اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

☆☆☆

بانو صدیقہ کے دینی درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ مذہبی مطالعے اور مشاہدے میں بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جس گھر میں میلاد شریف کی محفل یا کوئی بھی مذہبی تقریب منعقد ہوتی تو وہاں اسے ضرور مدعو کیا جاتا تھا۔ اسلام کی روشنی میں خواتین کے مسائل حل کرتے ہوئے اسے روحانی سکون ملتا رہتا تھا۔

ایک روز وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی ایک کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی۔ ملازمہ نے آکر کہا۔ "بیگم صاحبہ! کوئی نوجوان آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

اس نے کہا۔ "تم نے نام نہیں پوچھا.....؟"

"اس نے آپ کا نام لیا۔ میں نے سوچا جان پہچان والا ہی ہوگا۔ ابھی پوچھ کر آتی ہوں۔"

صدیقہ نے کہا۔ "نام رہنے دو۔ اسے اندر بھیج دو۔"

تھوڑی دیر بعد ایک نوجوان ملازمہ کے پیچھے چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں آیا۔ وہ بڑے ادب سے سلام کرتے ہوئے بولا۔ "میرا نام وقار علی ہے۔ میں نے اپنے ایک دوست کے گھر میں آپ کو دیکھا تھا اور آپ کی باتیں سنی تھیں۔ میں آپ کی شخصیت سے بہت متاثر ہوں۔"

وہ ایک صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "وہاں بیٹھو....."

وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میں کچھ عرصہ پہلے ہی لندن سے پاکستان آیا ہوں۔ بچپن سے اب تک کی عمر پردیس میں گزری ہے۔ اس لئے اپنے دین سے ذرا دور رہا ہوں۔"

وہ اسے خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بولا۔ "میں نے سنا ہے، آپ صرف خواتین کو درس دیتی ہیں۔ کیا مجھے دین کی باتیں سکھائیں گی؟"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "کیوں نہیں...؟ تم میرے بیٹے کی طرح ہو۔ تمہاری ماں نے لندن میں تمہیں انگریزوں جیسی تربیت دی ہوگی۔ میں تمہاری اسلامی تربیت دیتے ہوئے فخر محسوس کروں گی۔ کیا تمہارے اور بہن بھائی ہیں؟"

"جی نہیں۔ میں والدین کا اکلوتا تھا۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ میں بالکل تنہا ہوں۔"

اس کے چہرے پر دُکھ اور محرومی کے تاثرات ابھر رہے تھے۔ اس نے اپنی مختصر سی روداد سناتے ہوئے کہا۔ "لاسٹ ایئر میرے ممی ڈیڈی ایک حادثے کا شکار ہو گئے۔ ان کی موت کے بعد میں نے اپنا ٹرانسفر کرا لیا اور پاکستان چلا آیا۔"

بانو صدیقہ نے اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "بہت کم نوجوان راہِ حق کی تلاش میں بھٹکتے ہیں۔ خدا مجھے ہدایت اور ہمت دے کہ میں تمہاری دینی اور اسلامی تعلیم کی کمی پوری کر سکوں۔"

پھر اس نے پوچھا۔ "یہاں تنہا رہتے ہو۔ کوئی مسئلہ ہو تو بولو؟"

"کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ لندن میں بھی کمپنی نے رہائش کا انتظام کیا تھا۔ یہاں بھی

کمپنی کی طرف سے تمام سہولتیں میسّر ہیں۔"

اُن کے درمیان تھوڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر اس نے پوچھا۔"نماز پڑھتے ہو؟"

وہ ایک ذرا ہچکچاتے ہوئے بولا۔"یہ تو میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں' پردیس میں رہنے کے باعث مذہب سے دوری رہی ہے۔"

"میں کل کی نہیں۔ آج کی بات کر رہی ہوں۔ اب تو اپنے ملک میں' اپنے مسلمانوں میں ہو۔"

"دس برس پہلے دادا جان نمازیں پڑھایا کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد یہ سلسلہ کم ہوتے ہوتے ختم ہو گیا۔ مجھے کچھ یاد تو ہے مگر یہ بھول گیا کہ کس وقت کی نماز میں کتنی رکعتیں ہوتی ہیں۔"

"کوئی بات نہیں' میں تمہیں بتاتی رہوں گی۔ بھولی ہوئی نمازیں پھر پڑھنے لگو گے۔"

اس نے ایک ذرا توقف سے پوچھا۔"کلام پاک پڑھا ہے؟"

"جی..... مگر....."

"وہ بھی بھول گئے ہو گے؟"

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ وہ افسوس ظاہر کرتے ہوئے بولی۔"ہماری جوان نسل گردشِ حالات میں رہ کر اپنے دینی فرائض کو بھول جاتی ہے۔"

وہ بڑے جذبے سے بولا۔"لیکن میں نہیں بھولا۔ دنیاوی مصروفیات کے باوجود آپ کے دروازے پر آیا ہوں۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔"اللہ تمہیں نیکی اور ایمان کی روشنی دے۔ بے شک۔ وہ جسے چاہتا ہے' ہدایت فرماتا ہے۔ میں سب سے پہلے تمہیں نماز سکھاؤں گی۔ کیونکہ روزِ قیامت پہلا سوال نماز کے بارے میں ہی کیا جائے گا۔ یاد ہے نا... نماز سے پہلے وضو ضروری ہے؟ آؤ... میں تمہیں طریقہ بتاتی ہوں۔"

وہ اسے واش روم میں لے آئی۔ ایسے وقت روحانی آسودگی حاصل ہو رہی تھی۔ اس بات کی بھی خوشی تھی کہ نوجوان نسل بالکل ہی گمراہ نہیں ہے۔ ہمارے بچے نماز کی طرف

آ رہے ہیں۔

کچھ دیر بعد ہی وہ دونوں جائے نماز پر آ گئے۔ صدیقہ اسے نماز کے طریقے بتانے لگی اور وہ اس کی ہدایات کے مطابق عمل کرنے لگا۔ نماز کے بعد اس نے سمجھایا کہ اسے چند قرآنی آیتیں حفظ کر لینی چاہئیں۔ تاکہ وہ عبادت کے دوران انہیں پڑھتا رہے۔

وہ بڑی دیر تک اس کے پاس بیٹھا دین اور دنیا کی باتیں کرتا رہا۔ پھر اٹھتے ہوئے بولا۔"آپ کے پاس بیٹھ کر یوں لگا' جیسے ممی کے پاس بیٹھا رہا ہوں۔ آپ مجھے جب بھی اجازت دیں گی' میں حاضر ہو جایا کروں گا۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولی۔"عبادت کرنے اور اللہ تعالیٰ کو راضی رکھنے کے لئے وقت یا اجازت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے لئے اس گھر کے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔"

وہ سلام کر کے وہاں سے رخصت ہو گیا۔ وہ بڑی دیر تک اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ ایک صبح کے بھولے کو شام تک گھر لانے میں بڑا سکون مل رہا تھا۔

☆☆☆

بڑی پرانی کہاوت ہے' عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ وہ عشق تو نہیں کر رہا تھا لیکن نبیلہ کی طرف کسی حد تک جھکاؤ ہونے لگا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ عشق جیسی کوئی چیز ہو رہی ہے۔ وہ نادان تو نہیں تھا مگر نادان بچے کی طرح ماں کی گود سے اتر کر رینگتا ہوا آ رہا تھا اور نبیلہ کی ادائیں ایسی تھیں' جیسے ہاتھ بڑھا کر چٹکی بجاتی ہوئی پچکار رہی ہو۔"آ.. آجا منّے.. آ.. آ.... ابھی رینگتا ہوا آ رہا ہے۔ پھر دوڑتا ہوا آئے گا۔"

نبیلہ نے کہا۔"تم فائنل ایئر میں ہو۔ چھ ماہ بعد امتحانات ہونے والے ہیں۔ اس کے بعد یونیورسٹی آنا چھوڑ دو گے۔ اس کے بعد...؟"

اس نے نبیلہ کو دیکھا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا پھر نظریں چُرانے لگا۔ وہ بولی۔"حد ہو گئی۔ ہم چھ مہینے سے روز ملتے ہیں اور تم کچھ بولتے بولتے بھی نہیں بولتے۔ تم اپنے اندر کی باتیں چھپاتے کیوں ہو؟"

"م... میں کیا چھپاؤں گا؟ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے تو میں جاؤں؟ پھر کبھی یونیورسٹی نہیں آؤں گی۔"

"کیوں نہیں آؤ گی؟"

"مجھے ہی صاف صاف بولنا پڑے گا۔ میں تمہارے لئے آتی ہوں۔ صرف تمہارے لئے..."

اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ جو اسے کہنا چاہئے تھا' وہ ایک لڑکی کی زبان کہہ رہی تھی۔ اس نے شرمندگی سے بچنے کے لئے کہا۔ "میں۔ میں بھی۔ ہاں میں بھی تو..."

"کیا میں بھی تو؟ خدا کے لئے آگے کچھ بولو۔"

"میں کیا بولوں؟ تم۔ تم مجھے اچھی لگتی ہو۔ مجھے ایسا لگنے لگا ہے' جیسے میں یہاں پڑھنے نہیں.... تمہیں دیکھنے آتا ہوں۔"

وہ خوشی سے کھل کر بولی۔ "خدا کا شکر ہے۔ میں ایک ایک دن گنتی آئی ہوں۔ پورے چھ ماہ بعد تمہاری زبان کھلی ہے۔ اب تو کھل کر باتیں کیا کرو گے نا؟"

"ہاں ضرور..."

"اچھا بتاؤ' مجھے دیکھ کر تمہارا دل کیا کہتا ہے؟"

"یہی کہ تم سے شادی کرلوں۔"

"شادی ایسے ہی نہیں ہو جائے گی۔ اپنی ماں سے اور بابا سے بات کرو۔ انہیں اپنے دل کا حال بتاؤ۔"

اس نے قائل ہونے کے انداز میں سر ہلایا۔ لیکن گھر جا کر ماں کے سامنے محبت کے موضوع پر بات کرتے ہوئے جھجکنے لگا۔ وہ دن گزر گیا۔ رات گزر گئی۔ منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی اور بات کرنی بھی ضروری تھی۔ آخر ماں تک دل کا حال پہنچانے کے لئے اس نے ایک نیا راستہ نکالا۔

یہ فلمی گیت لکھنے والے مختلف سچویشن کی مناسبت سے ایسے ایسے گیت تخلیق کرتے ہیں کہ منہ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ صرف ریکارڈر کو پلے کرنا پڑتا ہے۔ اس نے کئی گانے منتخب کئے پھر پلے کا بٹن دبا کر آواز اونچی کردی۔ ریکارڈر سے اس کے دل کی آواز ابھرنے لگی۔ "لڑکی پسند کی مشکل سے ملتی ہے۔ مل گئی.... مل گئی...."

آواز اتنی تیز تھی کہ صدیقہ کے کمرے تک پہنچ رہی تھی۔ وہ ایک کتاب کے مطالعے میں مصروف تھی۔ ایکدم سے چونک کر بولی۔ "یہ کون سن رہا ہے؟"

امجد نے مسکرا کر کہا۔ "سجاد کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے؟"

وہ بولی۔ "اس سے کہیں' والیم ذرا کم کرے۔"

"سننے دو۔ آج پہلی بار اس میں شوخی پیدا ہوئی ہے۔"

وہ کتاب بند کرتے ہوئے بولی۔ "رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ یہ شوخی کا کونسا وقت ہے؟ اونچی آواز گراں گزر رہی ہے۔ اسے کہیں سونے کی کوشش کرے۔ نیند پوری نہیں ہوگی تو صبح نماز میں آنا کانی کرے گا۔"

وہ کمرے سے جاتے ہوئے بولا۔ "اچھا کہتا ہوں۔"

سجاد نے توقع کے خلاف باپ کو کمرے سے باہر آتے دیکھا تو فوراً ہی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ "ماں کو آنا چاہئے تھا۔ بابا کیوں آرہے ہیں؟ میں ان سے کیا بات کروں گا؟ شائد ماں نے بلایا ہو؟"

باپ نے اس کے پاس آکر مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بات ہے بیٹے! بڑے زوردار گانے سنے جارہے ہیں؟"

وہ فوراً ہی والیم کم کرتے ہوئے بولا۔ "وہ۔ کچھ نہیں.... بس یونہی.."

وہ سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔ باپ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "گیارہ بج رہے ہیں۔ تمہیں سونا چاہئے۔"

اس نے بڑی مایوسی سے کہا۔ "جی بہتر..."

باپ پلٹ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ سجاد نے بند دروازے کو دیکھا۔ پھر ریکارڈر کی طرف دیکھنے لگا۔ دھیمی آواز میں گانے کے بول ابھر رہے تھے۔ اس نے جھنجھلا کر اسے آف کردیا۔ آئیڈیا فلاپ ہو گیا تھا۔ وہ بے چینی سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ ذرا سوچنے پر بات سمجھ میں آئی کہ شائد گانے کے بول اس کے دلی جذبات کی عکاسی نہ کر سکے۔ اس لئے ماں اور بابا متاثر نہ ہو سکے۔ کوئی ایسا گانا ہونا چاہئے کہ دل کی بات پلک جھپکتے ہی ان کی سمجھ میں آجائے۔

وہ ٹہلتا رہا۔ سوچتا رہا۔ پھر ڈیکوریڈر کے پاس آ کر نئی اور پرانی آڈیو کیسٹس دیکھنے لگا۔ گانوں کے انتخاب میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ ایک بجے کے بعد نیند حاوی ہونے لگی۔ مگر ماں کو دل کی بات سمجھانے کا جذبہ ایسا تھا کہ وہ سر جھٹک جھٹک کر نیند کو بھگانے کی کوششیں کرتا رہا۔

صدیقہ معمول کے مطابق فجر کی نماز کے لئے بیٹے کو جگانے آئی تو اسے لاؤنج میں دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ وہ قالین پر چاروں شانے چت گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے چاروں طرف مختلف آڈیو کیسٹس بکھری پڑی تھیں۔ ایک ہاتھ میں دبی ہوئی تھی اور کچھ سینے پر رکھی ہوئی تھیں۔

اس نے قریب بیٹھ کر بڑی محبت سے اس کی پیشانی کو چومتے ہوئے کہا۔ "سجاد میری جان....! اٹھو بیٹے! یہ سب کیا ہے؟"

وہ ایک ذرا کسمسایا پھر کروٹ بدل کر سو گیا۔ وہ اس کے گال کو تھپتھپاتے ہوئے بولی۔ "اٹھو سجاد....!"

وہ آنکھیں کھولے بغیر بولا۔ "ماں....! پلیز سونے دیں۔"

"یہ کوئی سونے کی جگہ ہے؟ اٹھو.... نماز ادا کرو۔ پھر اپنے کمرے میں جا کر سو جانا۔ چلو..."

"میں قضاء پڑھ لوں گا۔ مجھے یہیں سونے دیں۔ ابھی ابھی تو لیٹا تھا۔ بہت اچھی نیند میں ہوں۔ پلیز ماں......!"

وہ بڑی محبت سے ڈپٹتے ہوئے بولی۔ "جو سونے کا وقت تھا' اس میں گانے سنتے رہے۔ اب کاہلی دکھا رہے ہو۔ نماز کے بعد نیند پوری کر لینا۔ چلو۔ اچھے بچوں کی طرح اٹھ جاؤ..."

وہ جانتا تھا' ماں عبادت کے معاملے میں چھٹی نہیں دے گی۔ وہ جبراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ صدیقہ تمام کیسٹیں سمیٹ کر دراز میں ڈالتے ہوئے بولی۔ "یہ اچانک ہی گانوں کا کیا جنون سوار ہو گیا ہے کہ ان کی وجہ سے رات بھر جاگتے رہے ہو؟"

اس نے بڑی بے بسی سے ماں کو دیکھا۔ پھر اٹھ کر وہاں سے جاتے ہوئے زیر

لب بڑبڑایا۔ "مجنوں نے اپنی محبوبہ کو پانے کے لئے صحراؤں کی خاک چھانی تھی۔ فرہاد نے دودھ کی نہر نکالی تھی۔ رانجھا نے ہیر کی بھینسوں کی رکھوالی کی تھی۔ سب ہی عاشق محنت کرتے رہے ہیں۔ میں بھی کر رہا ہوں۔"

وہ بڑبڑاتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ صدیقہ سوچتی ہوئی نظروں سے ادھر دیکھتی رہی پھر مسکرا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اس روز وہ یونیورسٹی پہنچا تو نبیلہ کچھ پریشان سی دکھائی دی۔ اس نے پوچھا۔ "تم نے ماں سے بات کی؟"

وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "کوئی ڈھنگ کا گانا نہیں مل رہا ہے۔"

نبیلہ نے چونک کر پوچھا۔ "گانا....؟"

وہ بولا۔ "ماں کے سامنے زبان نہیں کھل رہی تھی۔ میں کسی فلمی گانے کے ذریعہ حالِ دل بیان کرنا چاہتا تھا مگر کوئی مناسب گانا ہی نہیں ملا۔ تم فکر نہ کرو۔ میں بات کر لوں گا۔"

"تمہیں جو کرنا ہے۔ جلدی کرو۔ ورنہ بہت دیر ہو جائے گی۔"

"کس بات کی دیر ہو جائے گی؟"

"کل ایک خاتون مجھے پسند کر کے.... بلکہ یہ سمجھو رشتہ کنفرم کر کے گئی ہیں۔ اب گھر میں میری مرضی پوچھی جا رہی ہے۔"

وہ بولا۔ "تم انہیں بتا دو کہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو۔"

وہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔ "خود تو مرد ہو کر اپنی ماں سے بات نہیں کر پا رہے ہو اور مجھے مشورہ دے رہے ہو' میں امی کے سامنے منہ پھاڑ کے اپنی شادی کی بات کروں۔"

وہ بولا۔ "دیکھو' ماں بیٹی تو سہیلیوں کی طرح ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے سے کافی حد تک کلوز ہوتی ہیں۔ تم بڑی آسانی سے اپنے دل کی بات کر سکتی ہو۔"

"بیٹے بھی اپنی ماؤں سے بڑے کلوز ہوتے ہیں۔ پہلے تم اپنی ماں سے بات کرو گے۔ جب وہ رشتہ لے کر آنا چاہیں گی' تب میں اپنی امی سے بات کروں گی۔ کل تم نے مایوس کیا تو میں تم سے نہیں بولوں گی۔"

وہ پلٹ کر تیزی سے چلتی ہوئی اس سے دور ہوتی چلی گئی۔ وہ زیر لب بولا۔ "!

خدایا! میری مشکل دور کردے۔ مجھے ماں سے بات کرنے کا حوصلہ دے.....''

یاسر قریب آ کر اس کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''کیا ہوا دوست...! نبیلہ کچھ برہم سی دکھائی دے رہی ہے۔ کیا تمہاری امی نے انکار کر دیا؟''

''ابھی تو بات ماں تک پہنچی ہی نہیں ہے۔ انکار اور اقرار کہاں سے آ گیا؟''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''میں وہاں کھڑا ہوا تھا۔ گانے والی بات سن رہا تھا۔ کیا وہ آئیڈیا فلاپ ہو گیا ہے؟''

''ہاں۔ سچویشن کے مطابق گانا نہیں مل رہا ہے۔''

وہ دونوں ہی خاموش ہو کر سوچنے لگے۔ پھر یاسر نے چہک کر کہا۔ ''ایک زبردست گانا یاد آیا ہے۔ ممی ڈیڈی کو سناؤ گے تو دل کی مراد ضرور پوری ہوگی۔ میں آج شام تک وہ کیسٹ تمہارے پاس پہنچا دوں گا۔'' سجاد بڑی بے چینی سے دن گزرنے اور شام ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ دوسری طرف صدیقہ بہت خوش تھی۔ ریسیور کان سے لگائے کہہ رہی تھی۔ ''میری طرف سے تو پکی ہی سمجھو۔ جہاں تک میرا خیال ہے انہیں بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

امجد مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ دوسری طرف کی باتیں سن کر بولی۔ ''ہاں۔ انہوں نے سوچنے کا وقت لیا ہے۔ لیکن میں زبان دے آئی ہوں۔ لڑکی بہت اچھی ہے۔ کوشش کرو۔ بات بن جائے۔''

وہ ذرا دیر کے لئے خاموش ہوئی پھر بولی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں تمہارے فون کا انتظار کروں گی۔ اچھا اللہ حافظ.....''

وہ ریسیور رکھتے ہوئے بولی۔ ''مشاطہ تھی۔ آج یا کل لڑکی والوں کے گھر جا کر صورتحال معلوم کرے گی۔ پھر مجھے بتائے گی۔''

امجد نے پوچھا۔ ''تم نے بیٹے کی مرضی معلوم کی؟ اسے کسی وجہ سے کوئی اعتراض ہو سکتا ہے۔''

''وہ میرا بیٹا ہے۔ میری پسند پر اعتراض نہیں کرے گا۔''

''پھر بھی تمہیں اس سے بات تو کرنی چاہئے۔''

وہ بولی۔ ''میں تو سرپرائز دینا چاہتی تھی۔ آپ کہتے ہیں تو آج رات ہی کھانے پر بیٹے سے بات کی جائے گی۔''

امجد تائید میں سر ہلانے لگا۔ وہ دونوں اپنے کمرے میں تھے۔ سجاد یاسر کی دی ہوئی آڈیو کیسٹ ہاتھ میں دبائے لاؤنج میں آیا پھر اسے ریکارڈر میں لگا کر آن کیا۔ پلے کا بٹن دباتے ہی موسیقی اُبھرنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی ریکارڈر سے گیت کے بول ابھرنے لگے۔ ''او ممی ممی.....او ڈیڈی ڈیڈی.....او ممی! ڈیڈی! ہو جاؤ ریڈی......جس لڑکی سے میری شادی ہوگی۔ آج میں نے وہ لڑکی ڈھونڈ لی ہے۔ او ممی! ممی!....''

صدیقہ اور امجد نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ بولی۔ ''پتہ نہیں۔ اس لڑکے کو کیا ہو گیا ہے؟ کل رات بھر جاگ کر گانے سنتا رہا ہے۔ آج پھر جاگتا رہے گا۔''

امجد غور سے گانے کے بول سن رہا تھا اور گہری سوچتی ہوئی نظروں سے صدیقہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ''مغرب کا وقت ہونے والا ہے اور اس پر میوزک کی دھن سوار ہے۔ میں اسے دیکھتی ہوں۔''

امجد اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ ''رکو..... پہلے یہ سمجھنے کی کوشش کرو کہ بیٹا یہ گانا سن رہا ہے یا ہمیں سنا رہا ہے؟''

وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا مطلب.....؟''

''مطلب یہ کہ کل آپ کے صاحبزادے گانے کے ذریعہ کسی لڑکی کے ملنے کی خوشخبری سنا رہے تھے اور آج تو ڈائریکٹ شادی کی بات ہو رہی ہے۔''

صدیقہ توجہ سے سننے لگی۔ پھر خوشی سے چہک کر بولی۔ ''ماں صدقے میری جان! ممی ڈیڈی تو کب سے ریڈی ہیں۔''

پھر امجد سے بولی۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ لگتا ہے اس کے کان میں رشتے کی بھنک پڑ گئی ہے۔ تب ہی ایسے گیت سن رہا ہے۔''

امجد مسکرانے لگا۔ وہ بڑی محبت سے بولی۔ ''میرا بیٹا بہت خوش ہے۔ میں ابھی اس سے بات کرتی ہوں۔''

وہ دروازہ کھول کر کمرے سے باہر آ گئی۔ سجاد نے اسے دیکھتے ہی ریکارڈر کی

آواز ذرا دھیمی کر دی۔ وہ مسکراتی ہوئی اس کے پہلو میں آکر بیٹھ گئی۔ اسے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا ہو رہا ہے؟''

ماں کے دیکھنے اور بات کرنے کا انداز ایسا تھا کہ وہ نظریں چراتے ہوئے بولا۔ ''کچھ نہیں... بس ذرا گانے سن رہا ہوں۔''

وہ اس کا چہرہ اپنی طرف کرتے ہوئے بولی۔ ''بہت اچھا گانا ہے۔''

وہ خوش ہو کر بولا۔ ''جی..... بہت اچھا ہے۔''

''کل جو سن رہے تھے' وہ بھی بہت اچھا تھا۔''

وہ تائید میں سر ہلانے لگا۔ پھر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''وہ..... ماں! میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا تھا۔''

وہ ریکارڈر کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''ہُوں..... میں سمجھ رہی ہوں۔''

وہ سر جھکا کر مسکرانے لگا۔ وہ اس کے سر پر چپت لگاتے ہوئے بولی۔ ''شادی کے لئے ہمیں نہیں... تمہیں ریڈی ہونا ہے۔ جب کہو گے' بینڈ باجے کے ساتھ تمہاری دلہن لے آؤں گی۔''

وہ ماں سے لپٹتے ہوئے بولا۔ ''او ماں! آئی لو یو.....!''

امجد بھی اپنے کمرے سے نکل کر وہاں چلا آیا تھا۔ صدیقہ نے بیٹے کو چوم کر میاں سے کہا۔ ''اس کی خوشی دیکھ رہے ہیں آپ....؟ میں نے کہا تھا نا..... میری پسند میرے بیٹے کی پسند ہو گی۔''

سجاد نے ایک ذرا چونک کر اسے دیکھا۔ وہ چہک کر بول رہی تھی۔ ''دیکھے بغیر ہی میری پسند پر سر جھکا رہا ہے۔ مجھے فخر ہے' اس دور میں اتنا فرمانبردار بیٹا کسی کا نہ ہو گا۔''

امجد بھی اس کی تائید میں کچھ نہ کچھ کہہ رہا تھا۔ سجاد حیرانی پریشانی سے انہیں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ماں! آپ.... کیا کہہ رہی ہیں؟ آپ کی پسند.....؟''

وہ اس کی پشت پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ''اب انجان نہ بنو۔ وہ لڑکی ہیرا ہے ہیرا....''

امجد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری ماں تو اس سلسلے میں سرپرائز دینا چاہتی تھیں۔ مگر نہ جانے' تم نے کہاں سے سن گن لے لی؟''

وہ ان دونوں کی باتیں سن کر الجھ سا گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کیا کہے' کیا نہ کہے؟ وہ اپنی بات ان تک پہنچانا چاہتا تھا۔ لیکن ایک نئی بات سامنے آرہی تھی۔ صورتحال بڑی تشویشناک ہو گئی تھی۔ صدیقہ ہونے والی بہو کی تعریف میں پل باندھ رہی تھی۔ بڑے ذوق وشوق سے اس کا ذکر کئے جارہی تھی۔

وہ تذبذب میں تھا۔ سمجھ نہیں پارہا تھا' کیسے اپنے دل کی بات کہہ کر ماں کا دل توڑ دے؟ وہ بہت خوش تھی۔ اس کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرنا لازمی ہو رہا تھا۔ لیکن اب معاملہ صرف اس کی اپنی ذات کا نہیں تھا۔ نبیلہ کی خوشیوں کا بھی سوال تھا اور یہ سوال اس کے اندر چیخ رہا تھا کہ اپنی محبوبہ کے سامنے کیا منہ لے کر جائے گا...؟

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن ماں... امم۔ میں کچھ اور کہنا چاہتا ہوں۔''

انہوں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ سر جھکا کر بولا۔ ''وہ..... میں کسی اور کو پسند کرتا ہوں۔''

ماں باپ کو ایکدم سے چپ لگ گئی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس نے اٹک اٹک کر کہا۔ ''وہ..... وہ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔''

صدیقہ نے پوچھا۔ ''یہ سلسلہ کب سے چل رہا ہے؟''

''میں کیا بتاؤں؟ پتہ نہیں وہ مجھے کب سے اچھی لگ رہی ہے؟''

''تم تو مجھے ایک ایک بات بتایا کرتے ہو۔ پھر یہ اتنی اہم بات کیوں چھپائی؟''

''وہ۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا' آپ سے اس موضوع پر کیسے بات کروں۔''

امجد نے کہا۔ ''یہ عمر ایسی ہی ہوتی ہے۔ کبھی کوئی پسند آجاتی ہے اور کبھی کسی اور سے محبت ہو جاتی ہے پھر یہ کہ تم ایک لائف پارٹنر کے انتخاب میں دھوکا کھا سکتے ہو۔ ہم بوڑھے اور زمانہ شناس ہیں۔ ہمارے دھوکا کھانے کے امکانات کم ہوتے ہیں۔''

صدیقہ نے کہا۔ ''تم نے زندگی بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا ہو گا۔ میں نے بھی لڑکی والوں کو زبان دی ہے۔ میں جبر نہیں کروں گی۔ تم خود ہی سوچو' میرا فیصلہ قبول کر سکتے ہو یا

نہیں؟ سوچنے کے بعد تمہارا جو بھی فیصلہ ہوگا' مجھے منظور ہوگا۔''

وہ ان کے درمیان سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ سجاد اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر بولا۔''بابا! آپ ماں کو سمجھائیں۔ میں ان کا دل دکھا کر اپنی خوشیاں پوری نہیں کرنا چاہتا۔''

''وہ تمہاری خوشی میں خوش رہتی ہیں۔ اگر تم انہیں پہلے ہی اپنی پسند کے بارے میں بتادیتے تو وہ لڑکی والوں کو زبان نہ دیتیں۔ اُدھر تم نے کسی کو زبان دی ہے۔ اب تو بات یہاں آ کر اٹکی ہے کہ کس کی زبان کا پاس رکھا جائے گا...؟''

وہ بھی وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ سجاد گہری سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ اسے ماں کی باتیں یاد آنے لگیں۔''بیٹا! انسان کا دل خدا کا گھر ہوتا ہے۔ اس لئے کسی کا دل نہیں دکھانا چاہیے۔''

وہ اٹھ کر ٹہلتے ہوئے سوچنے لگا۔''نبیلہ بھی انسان ہے' اس کا دل بھی ٹوٹنا نہیں چاہیے اور ماں....؟'' اس نے بے اختیار اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ وہاں دل کی دھڑکنوں پر ماں کا لاکٹ تھا۔ اس لاکٹ کے اندر ممتا بڑے اعتماد سے مسکرا رہی تھی۔ وہ پریشان ہو کر زیر لب بڑبڑایا۔''یا خدا! میں کیا کروں؟ تو ہی میری راہ نمائی فرما....''

وہ مغرب کی نماز کے بعد ذرا دیر کے لئے لیٹا تو آنکھ لگ گئی۔ جب سے ہوش سنبھالا تھا' ماں اس کے حواس پر چھائی ہوئی تھی۔ خواب میں ماں کی آبدیدہ آنکھیں دیکھ کر تڑپ گیا۔ آنکھ کھل گئی۔ ایکدم سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بے چینی اور بڑھ گئی' کیا کرے اور کیا نہ کرے؟ کھانے کا وقت ہوا تو ماں اور بیٹے کو بھوک نہیں لگی۔ امجد نے زبردستی کی تو وہ دو چار لقمے زہر مار کر کے اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

عشاء کی نماز کے بعد سونے کی کوشش [illegible] نیند نے جواب دے دیا۔ بستر پر کانٹے سے چبھنے لگے تھے۔ وہ کبھی اُٹھ رہا تھا' کبھی بیٹھ رہا تھا۔ یوں رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی۔ دوسری طرف صدیقہ بھی جاگ رہی تھی۔ اس نے ایک بہت ہی شریف گھرانے میں رشتہ طے کیا تھا۔ اب زبان سے پھرنے کی بات سوچ کر شرم آ رہی تھی۔ اور یہ بات بھی دل میں تھی کہ بیٹا سیدھا سادہ' بھولا بھالا ہے۔ کوئی بھی لڑکی اپنی اداؤں سے اسے اُلّو بنا سکتی

ہے۔ وہ بچپن سے اُس کی ہر ضد پوری کرتی آئی تھی لیکن جوانی کی نادانی اور ضد کے آگے جھکنے سے بیٹے کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔

اب وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس نے بیٹے کی تربیت میں کس بات کی کمی کی ہے؟ وہ ہمیشہ اسے بزرگوں کے فیصلوں کے سامنے سر جھکانے کی ہدایت کرتی رہی ہے۔ آج پہلی بار امتحان کی گھڑی آئی تھی۔ اسے اپنی تربیت پر بھروسہ تھا پھر بھی نتیجے کا بے چینی سے انتظار تھا۔

رات کیسے گزرتی چلی گئی' کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ فجر کی اذان ہوئی تو صدیقہ معمول کے مطابق بیٹے کو نماز کے لئے جگانے آئی۔ وہ بیٹے کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر عبادت کے لئے اسے جگانا ضروری تھا۔

اس نے ہینڈل پر ایک ہلکا سا دباؤ ڈالا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔ سامنے ہی بڑا سا بیڈ تھا۔ اس وقت بستر بیٹے کے وجود سے خالی تھا۔ اس نے واش روم کی طرف دیکھا تو وہاں روشنی دکھائی دی۔ وہ مطمئن ہو کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

دونوں کمروں میں جائے نماز بچھی ہوئی تھی۔ ایک طرف ماں اور دوسری طرف بیٹا عبادت الٰہی میں مصروف تھے۔ ماں کے دل سے رہ رہ کر دعا ہمک رہی تھی کہ بیٹا ماں کی تربیت کا بھرم رکھے اور بیٹے کا دل کہہ رہا تھا۔''اے دلوں کا حال بہتر جاننے والے! مجھے ماں کی اطاعت و فرمانبرداری میں ثابت قدم رہنے دے۔ میں اور کچھ نہیں چاہتا...!''

صبح ناشتے کی میز پر اس نے ایک نظر باپ پر ڈالی پھر ماں کا ہاتھ تھام کر کہا۔''مجھے آپ کا فیصلہ عزیز ہے۔ آپ نے ایک بار کہا تھا' کبھی کسی کا دل نہ دکھاؤ' یہ خدا کا گھر ہوتا ہے۔ میرے اس فیصلے سے اس لڑکی کا دل دکھے گا لیکن اس کی دل جوئی کرنے والے بہت مل جائیں گے مگر آپ کا دل رکھنے والا تو میں ہی ایک بیٹا ہوں۔ ماں! وہ آپ سے افضل نہ ہے' نہ ہو سکتی ہے۔''

صدیقہ کی آنکھیں خوشی سے بھیگ گئیں۔ اس نے سر گھما کر امجد کو دیکھا۔ پھر شدت جذبات سے بیٹے کو گلے لگا لیا۔ اسے چومتے ہوئے کہا۔''میرے بیٹے! میری جان! تم نے میری تربیت کا بھرم رکھا ہے۔ ایک پیدا کرنے والی ماں اور کیا چاہتی ہے...؟ بس یہی کہ وہ اولاد کے لئے دنیا ہار جائے' کوئی بات نہیں مگر بیٹے کو ہر حال میں جیت لے۔''

جب بیٹا پیدا نہیں ہوا تھا اور وہ اپنے وجود کے اندر اسے لئے پھرتی تھی‘ تب ہی سے ذہن میں یہ بات سمائی ہوئی تھی کہ جو میری تخلیق ہے۔ جو نو ماہ تک میرے خون میں پرورش پا کر اپنا وجود مکمل کر رہا ہے اور جو مجھے دردِزہ کے کرب سے گزار کر اس دنیا میں آنے والا ہے۔ اس پر صرف میرا حق ہوگا۔ وہ صرف میری ملکیت ہوگا۔ ایک شہنشاہ نے صدیوں سے تاج محل کو اپنے نام رکھا ہے۔ دنیا کی ہر ماں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ آئندہ نسلوں تک اپنے بچے کے وجود پر اپنے نام کی نیم پلیٹ لگا دے کہ یہ تاج محل اسی ایک ماں کی تخلیق ہے۔

جبکہ ایسا نہیں ہوتا۔ مرد اس بچے پر اپنے نام کی تختی لگا کر آئندہ نسلوں تک اسے اپنے نام کر لیتا ہے۔ فصل یہ اُگاتی ہے۔ آبیاری یہ کرتی ہے اور نام میاں صاحب کماتے رہتے ہیں۔ صدیقہ کے اندر یہ بات تھی کہ دستور کے مطابق نام میاں کا ہو‘ کوئی بات نہیں‘ مگر وہ بیٹے کے دل و دماغ پر ایسے نقش ہو جائے کہ وہ ہمیشہ تمام رشتوں پر ماں کی برتری قائم رکھا کرے۔

☆☆☆

سجاد کا سر جھکا ہوا تھا۔ نبیلہ بھی خاموش تھی۔ اسے گہری چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ مجرم بنا بیٹھا تھا۔ کچھ بول نہیں سکتا تھا۔ وہی بولی۔ ”یہ تمہارے جیسے ڈرپوک عاشق ہی ہوتے ہیں جو عشق فرماتے ہیں اور ہم لڑکیوں کو بدنام ہونے کے لئے چھوڑ جاتے ہیں۔ کیا ایک بار اپنی ماں کو میرے گھر نہیں بھیج سکتے؟ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ایک بار مجھے اور میرے خاندان کو دیکھ لیں۔ انہیں بیٹے کی بھی بات ماننی چاہئے۔“

وہ دھیرے سے بولا۔ ”ماں کے فیصلے پر اپنا فیصلہ مسلّط کرنا بہت مشکل ہے۔“

”محبت کا دوسرا نام ہی دشواری ہے۔ زمانے سے اپنی بات منوانا آسان نہیں ہوتا۔ اسے آسان بنایا جاتا ہے۔ کیا میرے لئے فائٹ نہیں کر سکتے؟“

”کیا ماں سے ضد بحث کروں؟“

”کبھی کبھی اپنا جائز حق حاصل کرنے کے لئے والدین سے باغی ہو کر ضد بحث کرنی ہی پڑتی ہے۔“

پھر وہ اس کا ہاتھ تھام کر بڑی محبت سے بولی۔ ”پلیز سجاد! میری خاطر.....“

اس نے بڑی بے بسی سے کہا۔ ”پلیز نبیلہ! اس معاملے کو یہیں ختم کر دو۔“

وہ غصے سے تلملا گئی۔ یوں لگ رہا تھا‘ جیسے وہ اس کی محبت کو اس کے تمام جذبات کو ٹھوکریں مار کر ذلت کی گہری پستیوں میں گرا رہا ہے۔ اس سے یہ توہین برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ایکدم سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”میں نے تمہیں سمجھنے میں بڑی بھول کی سجاد! مجھے معلوم ہوتا کہ تم ابھی تک دودھ پیتے بچے ہو‘ ماں کی گود سے باہر نہیں آسکو گے تو کبھی تم سے دل نہ لگاتی۔“

وہ بھی اُٹھتے ہوئے بولا۔ ”تم مجھے بے وفا کہو یا ہرجائی.... لیکن میرے دل کا حال خدا جانتا ہے۔ بے شک۔ یہ سر ماں کے فیصلے کے سامنے جھک رہا ہے مگر یہ دل..... صرف تمہارے نام پر دھڑک رہا ہے اور دھڑکتا رہے گا۔“

وہ منہ بنا کر بولی۔ ”ایسی لفاظی محبت کی شروعات میں اچھی لگتی ہے۔ اختتام پر نہیں...تم مجھ پر ماں کو فوقیت دے کر میری انسلٹ کر چکے ہو پھر بھی آخری بار پوچھ رہی ہوں‘ مجھ سے شادی کرو گے یا نہیں؟“

اس نے سر جھکا لیا۔ ان کے درمیان تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر نبیلہ نے سمجھ لیا کہ بچے کا سر اس کے سامنے نہیں‘ اپنی ماں کے سامنے جھکا ہوا ہے۔ وہ تڑخ کر بولی۔ ”آئی ہیٹ یو۔ جاؤ اپنی اماں کا دودھ پیتے رہو۔“

وہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے جانے لگی۔ سجاد نے ایک گہری سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ دل کو سمجھانے لگا ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ یہ بند آنکھوں کے پیچھے ایک خواب ہے‘ ختم ہو جائے گا۔ آنکھ کھلے گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

☆☆☆

دو روز بعد وقار علی صدیقہ کے پاس آیا تو وہ اسے نماز میں پڑھی جانے والی آیتیں یاد کرانے لگی۔ اس دوران ہر نماز کی رکعتیں بھی بتاتی جا رہی تھی۔ وہ اس کی ایک ایک ہدایت کو ذہن نشیں کرتا جا رہا تھا۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ امجد اور سجاد نے گھر میں قدم رکھتے ہوئے ایک اجنبی نوجوان کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

صدیقہ اپنے میاں سے وقار کا ذکر کر چکی تھی۔ اس نے تعارف کراتے ہوئے

کہا۔ ''یہ میرے میاں امجد علی ہیں اور یہ میرا بیٹا سجاد علی ہے۔ اور یہ وقار علی ہے۔ اس کا ذکر میں آپ سے کر چکی ہوں۔''

امجد نے سر ہلا کر کہا۔ ''میں دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا۔''

وقار نے آگے بڑھ کر ان دونوں سے مصافحہ کیا۔ امجد نے کہا۔ ''یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ تم دین کی طرف دل سے مائل ہو اور بھولی ہوئی اسلامی تعلیمات حاصل کر رہے ہو۔''

اس نے بڑی عقیدت سے صدیقہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''امی کا دست شفقت سر پر رہے گا تو انشاءاللہ میں دینی احکامات کی تعمیل کرتا رہوں گا۔''

اس نے پہلی بار اسے امی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ صدیقہ خوشی سے سرشار ہو کر بولی۔ ''کیوں نہیں بیٹے! تم مجھے ماں کہہ رہے ہو۔ میں سجاد کی طرح تمہیں بھی دینی تربیت دیتی رہوں گی۔''

پھر وہ سب دینی و دنیاوی گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ سجاد چپ چپ سا تھا۔ کسی بات میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ صدیقہ چُپ چاپ اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا جھکا ہوا سر بتا رہا تھا کہ وہ ماں کا فیصلہ قبول تو کر رہا ہے۔ مگر اندر ہی اندر الجھ کر رہ گیا ہے۔

وقار باتوں کے دوران صدیقہ کو بار بار امی کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ وہ خوش ہو رہی تھی۔ وقار سے اس لئے اُنسیت بڑھتی جا رہی تھی کہ وہ اس کے مزاج کے مطابق دین و ایمان کی طرف راغب اسی کے مطابق زندگی گزار رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا' جیسے وہ ایک بیٹے کی نہیں بلکہ دو بیٹوں کی ماں بن گئی ہے۔ وہ کبھی اپنے دائیں طرف بیٹھے ہوئے سجاد کو دیکھ رہی تھی' کبھی بائیں طرف وقار علی کو دیکھنے لگتی تھی۔ وقار صرف اسے ہی نہیں' امجد علی کو بھی متاثر کر رہا تھا۔

سجاد تھوڑی دیر تک وہاں بیٹھا رہا۔ پھر ان سے معذرت چاہتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ وقار نے کہا۔ ''آپ کے پاس آ کر یوں لگتا ہے' جیسے اپنے والدین کے سائے میں پہنچ گیا ہوں۔''

امجد نے کہا۔ ''یہ تو تمہاری امی بن ہی چکی ہیں۔ مجھے بھی سجاد کی طرح بابا کہا کرو۔''

وہ خوش ہو کر بولا۔ ''مجھے آپ جیسے والدین مل رہے ہیں۔ میں گھر جا کر دو رکعت نفل پڑھوں گا۔''

پھر وہ اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے' اب مجھے چلنا چاہئے۔''

امجد نے کہا۔ ''یہ کیا بات ہوئی؟ کھانے کا وقت ہوا تو جانے کی بات کر رہے ہو۔ بیٹھے رہو۔ رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھاؤ۔''

صدیقہ بھی اصرار کرنے لگی۔ ''تمہیں ہم سے مل کر ہی نہیں... ہمارے گھر کا کھانا کھا کر بھی بہت خوشی ہو گی۔ میں ملازمہ سے کہتی ہوں۔ وہ ابھی کھانا لگائے گی۔ تم بیٹھو....''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کا بہت وقت لے چکا ہوں۔ آپ بھی کہہ رہی ہوں گی' یہ کیسا لڑکا ہے' چپک کر ہی رہ گیا ہے؟''

وہ فوراً ہی اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''کیسی باتیں کرتے ہو؟ مجھے تو ایک پلا پلایا قابل فخر بیٹا مل گیا ہے۔ تم میرے سجاد کی طرح ہو۔ آئندہ خود کو اس گھر میں غیر نہ سمجھنا۔ میں کھانا کھلائے بغیر جانے نہیں دوں گی۔''

امجد نے کہا۔ '' اور ماں کی بات حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ اب تم کھائے بغیر نہیں جا سکو گے۔''

انہوں نے بڑے پیار سے اصرار کیا' وہ انکار نہ کر سکا۔ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ صدیقہ وہاں سے کچن کی طرف جانا چاہتی تھی مگر بیٹے کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ ایک کرسی پر سر جھکائے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے قریب آتے ہوئے بڑی محبت سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے بیٹے! جب سے آئے ہو بجھے بجھے سے لگ رہے ہو؟''

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ پھر جبراً مسکراتے ہوئے کہا۔ ''نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔''

وہ اس کے برابر دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میرا فیصلہ مان کر پچھتا رہے ہو؟''

''نہیں ماں!.. ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''تو پھر کیا بات ہے؟ تم اس طرح رہو گے تو میں اپنے فیصلے پر پچھتاؤں گی۔''

وہ فوراً ہی اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولا۔ ''آپ کا فیصلہ کبھی غلط

نہیں ہوسکتا۔آپ کی پسند میری پسند سے کہیں زیادہ اچھی ہوگی۔''

وہ بیٹے کو خوش دیکھ کر کھل گئی۔اس کی پیشانی چومتے ہوئے بولی۔''میں نے لڑکی کی تصویر منگوائی ہے۔دیکھو گے تو میری پسند کی داد دو گے۔''

پھر وہ اٹھتے ہوئے بولی۔''چلو۔منہ ہاتھ دھو کر ڈائننگ روم میں آجاؤ۔وقار کھانا کھا کر جائے گا۔اس سے باتیں کرو۔اسے کمپنی دو۔بہت اچھا لڑکا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔آپ چلیں۔میں پانچ منٹ میں آتا ہوں۔''

کھانے کے دوران سجاد نے وقار سے پوچھا۔''آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟''

وہ بولا۔''ممی ڈیڈی کے بعد میں بالکل ہی ٹوٹ گیا تھا۔خود کو سنبھالنا تھا۔ٹرانسفر کا معاملہ بھی تھا۔پاکستان سیٹل ہونے میں بہت مصروف رہا۔ممی زندہ تھیں تو ہر وقت بہو لانے کی باتیں کرتی رہتی تھیں۔''

صدیقہ اس کے ہاتھ کو تھپکتے ہوئے بولی۔''میری کوشش ہوگی' تمہیں ماں کی کمی محسوس نہ ہو۔''

سجاد نے کہا۔''اب میری ماں ایک اور بہو لانے کی فکر میں مبتلا ہو جائیں گی۔ آپ بہت جلد دولہا بننے والے ہیں۔''

وہ خوش ہو کر بولا۔''میری شریکِ حیات کا انتخاب امی کریں گی۔''

امجد نے صدیقہ سے کہا۔''لو بھئی۔تمہاری ذمہ داریاں بڑھتی جارہی ہیں۔''

وہ بولی۔''میں آج ہی سے لڑکی ڈھونڈنا شروع کرتی ہوں۔اس طرح دونوں بھائیوں کی شادی ایک ساتھ کر دی جائے گی۔''

پھر اس نے وقار سے کہا۔''لیکن بیٹے! تم نے کہا تھا' ٹرانسفر ہو گیا تو واپس لندن چلے جاؤ گے؟''

امجد نے کہا۔''تو کیا ہوا؟ شادی کے بعد آپ کی بہو بھی ساتھ جائے گی۔''

وہ بولی۔''پھر تو لڑکی والوں سے یہ بات طے کرنی ہوگی۔''

وہ چاروں کچھ دیر تک خوش گپیوں میں مصروف رہے۔پھر وقار دوسرے روز آنے

کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

بہو لانے کے سلسلے میں صدیقہ کی بے چینی بڑھ گئی۔اس نے اسی شام مشاطہ کو بلا کر کہا۔''سجاد کی ہونے والی دلہن کی تصویر لے آؤ۔ایک اور اچھی خاندانی لڑکی دیکھو اور مجھے دکھاؤ۔اب اس گھر میں میرے ایک نہیں...دو بیٹے ہیں۔میں دو بہوئیں لاؤں گی۔''

مشاطہ نے دوسرے دن لڑکی کی تصویر پہنچا دی اور یہ کہہ کر سجاد کی بھی تصویر لے گئی کہ ان کی لڑکی بھی اسے دیکھنا چاہتی ہے۔عصر کی نماز کے بعد صدیقہ بڑی بے صبری سے بیٹے کا انتظار کرنے لگی۔اسے اپنی پسند دکھانے کی بے چینی تھی۔جب تک بیٹا نہیں آیا' تب تک وہ ہونے والی بہو کی تصویر ہاتھ میں لئے گھومتی رہی۔اسے دیکھ دیکھ کر سوچتی رہی۔''سجاد کو پسند آئے گی یا نہیں...؟ آئے گی کیوں نہیں...ضرور پسند آئے گی؟''

وہ ڈرائنگ روم میں ٹہل رہی تھی۔ایسے ہی وقت سجاد نے اندر آتے ہوئے اسے سلام کیا۔اس نے سلام کا جواب دیا پھر اس کا ہاتھ تھام کر اسے ایک صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا۔''کہاں رہ گئے تھے؟ میں کب سے انتظار کر رہی ہوں؟''

وہ مسکرا کر بولا۔''آپ کب میرا انتظار نہیں کرتی ہیں؟ یہاں گھر سے قدم باہر نکالتا ہوں' اور آپ کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔یہ تو روز کا معمول ہے۔''

وہ اس کے سامنے ایک لفافہ لہراتے ہوئے بولی۔''ذرا بوجھو تو۔اس میں کیا ہے؟''

وہ اسے دیکھتے ہوئے بولا۔''میں کیسے بتا سکتا ہوں' اس بند لفافے میں کیا ہے؟''

''کل میں نے تم سے کچھ کہا تھا۔ذہن پر زور ڈالو' یاد آجائے گا۔''

وہ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا پھر انکار میں سر ہلا کر بولا۔''آپ پہیلیاں بجھوا رہی ہیں۔پلیز بتائیں ناں....کیا ہے اس میں...؟''

''اس میں میری پسند ہے...میں نے کہا تھا' لڑکی کی تصویر منگوانے والی ہوں۔''

''او اچھا...ہاں۔یاد آیا۔''

وہ لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔''لو۔اپنی ماں کی پسند دیکھو....''

وہ اس کے ہاتھ سے لفافہ لے کر کھولنے لگا۔یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بہت بڑا سرپرائز ملنے والا ہے۔لفافے سے تصویر کیا نکلی حیرت سے آنکھیں باہر نکل آئیں۔وہ

ایکدم سے اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ بے یقینی سے کبھی ماں کو اور کبھی اس تصویر کو تکنے لگا۔ صدیقہ نے پریشان ہوکر پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

وہ تصویر کو ماں کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا....؟ کیا یہی آپ کی پسند ہے؟''

''ہاں۔ تمہیں اچھی نہیں لگی؟''

تصویر کو دیکھتے اور سمجھتے ہوئے بھی یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ ماں کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''اس کا نام نبیلہ ہے نا....؟''

وہ اثبات میں سرہلا کر بولی۔ ''ہاں۔ نبیلہ ہے۔''

پھر اس نے چونک کر پوچھا۔ ''تمہیں اس کا نام کیسے معلوم ہوا؟''

وہ مارے خوشی کے اس سے لپٹتے ہوئے بولا۔ ''ماں! یہ وہی نبیلہ ہے.... جسے۔ جسے میں پسند کرتا ہوں۔''

اس نے خوش ہوکر پوچھا۔ ''کیا واقعی....؟''

وہ ماں کو چومتے ہوئے بولا۔ ''آئی لو یو ماں...! یو آر گریٹ... سچ پوچھیں تو مجھے ماں کی اطاعت کا انعام مل رہا ہے۔''

''خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے' میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوگیا۔''

سجاد کو اپنے ہاتھ میں نبیلہ کی تصویر ایسی لگ رہی تھی' جیسے وہ دنیا کی بھیڑ میں گم ہوجانے والی دور جاکر اس کے ہاتھ آرہی ہے۔ قسمت اس طرح مہربان ہوگی' وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایسے وقت اسے ماں پر بڑا پیار آرہا تھا۔ یہ سچائی دل میں جڑ پکڑ رہی تھی کہ خدا ماں کے ہر حکم اور اس کی ہر بات کے پیچھے کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ رکھتا ہے۔

بیٹے کے کھلے ہوئے چہرے سے صدیقہ کو بڑی آسودگی مل رہی تھی۔ اب ماں کے ساتھ بیٹا بھی خوش اور مطمئن تھا۔ یوں ہنستا بولتا پھر رہا تھا جیسے ہواؤں میں اُڑ رہا ہو۔

اُدھر نبیلہ کے سامنے وقار کی تصویر پہنچی تو وہ بھی اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ اسی بچے کی دلہن بننے والی ہے' جس نے ماں کی گود میں رہ کر اسے ٹھکرا دیا تھا۔ یہ توہین اس نے کیسے برداشت کی تھی' یہ وہی جانتی تھی۔ اب اس کی تصویر دیکھ کر غصہ بھی آرہا تھا اور پیار سے دل بھی دھڑک رہا تھا۔

اس وقت اپنی ذلت کا احساس حاوی ہورہا تھا۔ جی چاہتا تھا' جس طرح اس نے دل توڑا ہے' اسی طرح اس کی تصویر کے ٹکڑے ٹکڑے کردے پھر عقل کہہ رہی تھی ایسے دودھ پیتے بچے کے ساتھ کیسے گزارا ہوگا' جو ماں سے جاکر پوچھے گا کہ دلہن کا گھونگھٹ اُٹھانا ہے یا نہیں؟ اگر ماں نے تھپک تھپک کر لوری سنائی تو وہ وہیں گود میں سوجائے گا۔ سہاگ کی سیج تک نہیں آئے گا۔

وہ ہاتھ میں تصویر لئے کشمکش میں مبتلا تھی۔ اس کی ماں اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ پریشان ہوکر بولی۔ ''کیا بات ہے؟ یہ تمہیں پسند نہیں ہے؟''

''امی! آپ مجھے یونیورسٹی میں پڑھا رہی ہیں۔ خود ایجوکیٹڈ ہیں۔ مگر میری شادی کے معاملے میں دادا' پردادا کے دستور پر چل رہی ہیں کہ شریف زادیوں کو ماں باپ کی پسند سے شادی کرنی چاہئے۔ جبکہ میں اعتراض کرتی رہی ہوں۔''

''تم اچھی طرح جانتی ہو۔ اس گھر میں مجھ سے زیادہ تمہارے ڈیڈی کا حکم چلتا ہے۔ انہوں نے لڑکے کا نام اور خاندان کا ذکر سنتے ہی رشتے کے لئے ہاں کردی۔ مجھے بھی قائل کردیا کہ ایسے اُونچے دولت مند گھرانے میں نصیب والیاں ہی بیاہ کر جاتی ہیں۔''

وہ بیٹی کے قریب آکر بولی۔ ''لڑکا تو بہت خوبرو اور اسمارٹ ہے۔ تمہیں پسند کیوں نہیں ہے؟''

''میں اسے جانتی ہوں۔ اسے چاہتی بھی ہوں مگر یہ دودھ پیتا بچہ ہے۔''

ماں نے حیرانی سے پوچھا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو؟ اسے کب سے جانتی ہو؟''

وہ اپنی ماں کو اس کی تمام باتیں' تمام عادتیں بتانے لگی۔ وہ مسکرا کر بولی۔ ''تم خوش نصیب ہو۔ ایسے لڑکے جو ماں کے لاڈلے ہوتے ہیں' وہ شادی کے بعد بیوی کے لاڈلے بن جاتے ہیں۔ میں تمہیں سمجھاؤں گی اور گائیڈ کروں گی کہ تم کس طرح اسے اپنا میاں مٹھو بنالو گی؟ مجھ پر بھروسہ کرو۔ دلہن بن کر اسی گھر میں جاؤ۔''

ماں نے اسے اچھی طرح سمجھایا۔ نہ سمجھاتی' تب بھی اس کا دل سجاد کو ہی پکار رہا تھا۔ اس پر غصہ تو آرہا تھا۔ مگر کیا کرتی' پیار بھی آرہا تھا۔ ایسے وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس کی امی نے ریسیور اُٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ ''ہیلو کون..؟''

ماں نے دوسری طرف کی بات سن کر نبیلہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم سجاد بول رہے ہو..؟''

نبیلہ نے چونک کر فون کی طرف دیکھا۔اس کی امی کہہ رہی تھیں۔ ''ہاں۔اچھا۔ نبیلہ سے بات کرنا چاہتے ہو؟ ہُوں۔ہُوں...نہیں بیٹے!ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔میں ابھی اسے بلاتی ہوں۔''

ماں نے ریسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے بیٹی کو دیکھا پھر کہا۔''منہ نہ بناؤ۔جیسا سمجھاتی ہوں'ویسا کرتی رہو۔چلو آؤ۔اس سے باتیں کرو۔''

اس کا دل خود ہی کھنچا جا رہا تھا۔وہ ہاری ہوئی بازی جیتنے والی تھی۔اس نے آگے بڑھ کر ریسیور لیا پھر ماں کو ایسے دیکھا جیسے تنہائی چاہتی ہو۔وہ مسکراتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

اس نے ریسیور کو کان سے لگا کر ذرا بے رُخی سے کہا۔''ہیلو۔فرمایئے...''

وہ بڑے جوش وجذبے سے بولا۔''ہیلو نبیلہ!میں تو خوشی سے پاگل ہو رہا ہوں...''

''سوری۔یہ پاگل خانہ نہیں ہے۔''

وہ ریسیور کو کریڈل پر رکھ کر مسکرانے لگی۔یہ خوب جانتی تھی کہ دیوانہ پھر پکارے گا...اور یہی ہوا پھر فون کی گھنٹی بجنے لگی۔وہ ریسیور اٹھا کر بولی۔''اب کون ہے...؟''

''نبیلہ!میں بول رہا ہوں۔فون بند نہ کرنا۔ارے! یہ تو پیار میں معجزہ ہوگیا۔اچانک تمہاری تصویر میرے ہاتھ میں ایسے آئی جیسے میرے نام کی لاٹری نکل آئی ہو۔ماں نے میری تصویر بھی تمہارے پاس بھیجی ہے۔شائد تمہیں ابھی تک نہیں ملی؟''

''مل چکی ہے۔میں نے اس تصویر کو ایسے پھینک دیا ہے'جیسے تم مجھے پھینک کر چلے گئے تھے۔''

''یہ۔یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟نہیں تم ایسا نہیں کرسکتیں۔پلیز'میری اس وقت کی مجبوریوں کو اور حالات کو سمجھو۔میں تم سے دور ہونے کے بعد بھی دن رات تمہیں یاد کرتا رہا۔تمہارے لئے تڑپتا رہا۔''

''خواہ مخواہ ایک عاشق کی زبان سے نہ بولو۔اگر تمہاری ماں یہ رشتہ طے نہ کرتیں تو

تم ابھی عاشق بن کر حالِ دل بیان نہ کرتے۔ماں جو دلہن لاتیں'اسی کے پاس چلے جاتے۔''

''دیکھو مجھے شرمندہ نہ کرو۔جو ہوگیا'اسے نظرانداز کردو۔خدا کا شکر ادا کرو۔وہ بڑا کارساز ہے ہماری بگڑی بنا رہا ہے۔وعدہ کرو'ابھی فون بند کرنے کے بعد شکرانے کی نماز ادا کروگی۔''

وہ ناگواری سے بولی۔''ایک تو یہ بڑی مصیبت ہے۔تمہارے گھر آکر پانچوں وقت کی نمازیں پڑھنی ہوں گی۔''

''کیا تم نماز سے بیزار ہو؟تم نے ایک بار کہا تھا کہ نمازیں پڑھتی ہو۔''

''میں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ دن رات پڑھتی ہوں۔ہاں یہ ہے کہ ہر جمعہ کو...اور رمضان کے مہینے میں پڑھ لیا کرتی ہوں۔تمہارے پاس گفتگو کے لئے کوئی اور موضوع نہیں ہوتا؟یا تو ماں کی باتیں کرتے ہو یا نماز کی۔ہمارا گزارہ کیسے ہوگا؟''

وہ تذبذب میں پڑ گیا۔نبیلہ نے پوچھا۔''کیا ہوا؟چپ کیوں ہوگئے؟''

وہ نصیحت کرنے کے انداز میں بولا۔''دیکھو نبیلہ!بہترین شریکِ حیات وہ ہوتی ہے جو اپنے مجازی خدا کے رنگ میں رنگ جاتی ہے۔''

''اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو پہلے یہ سمجھو کہ محبت میں دونوں ہاتھوں سے تالی بجائی جاتی ہے۔ہم ایک دوسرے کے رنگ میں رنگتے رہیں گے۔تب ہی ازدواجی زندگی کی گاڑی چل سکے گی۔''

''تم درست کہہ رہی ہو۔میں وعدہ کرتا ہوں۔ہم ایک دوسرے کے مزاج کے مطابق زندگی گزاریں گے مگر تم پانچوں وقت کی نمازیں ضرور پڑھا کروگی۔''

''بے شک۔اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے'اس سے کچھ مانگنے کے لئے نمازیں پڑھی جاتی ہیں۔میں تمہیں راضی رکھنے اور تم سے بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے صوم وصلواۃ کی پابند رہوں گی۔''

وہ خوش ہوگیا۔نبیلہ کی بات کے اس پہلو پر دھیان نہیں دیا کہ وہ نمازیں خدا کے لئے نہیں'مجازی خدا کا دل رکھنے کے لئے پڑھا کرے گی۔دراصل اسی دل کو جیتنا تھا'جہاں ماں کا لاکٹ لٹکتا رہتا تھا۔

☆☆☆

دوسری طرف وقار کی دلہن کی تلاش پورے زور و شور سے جاری تھی۔ ایک روز وہ کچھ بے چین سا تھا۔ باتوں کے دوران بار بار صدیقہ کو ایسے دیکھ رہا تھا' جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ وہ اس کی بے چینی محسوس کرتے ہوئے بولی۔ ''کیا بات ہے وقار! کچھ کہنا چاہتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''جی۔ کل ایک شعر میری نظروں سے گزرا ہے۔ تب سے ممی بہت یاد آ رہی ہیں۔''

وہ بڑی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''ایسا کون سا شعر ہے' جسے پڑھ کر ماں یاد آ رہی ہے؟''

وہ صدیقہ کو ایسے دیکھنے لگا' جیسے اپنی ممی کو دیکھ رہا ہو۔ پھر بڑے کھوئے ہوئے لہجے میں اسے یہ شعر سنانے لگا۔ ''ایک مدت سے میری ماں نہیں سوئی تابش

میں نے اک بار کہا تھا' مجھے ڈر لگتا ہے

اور مجھے یاد ہے۔ میں چھ برس کا تھا۔ ممی نے بتایا کہ میں ایک بار خوف زدہ ہو کر چیخ مارتے ہوئے نیند سے اٹھ بیٹھا تھا۔ ممی نے مجھے سینے سے لگا لیا تھا۔ تھپک تھپک کر تسلیاں دیتی رہی تھیں۔ اس کے بعد میں نے بیس برس تک یہی دیکھا کہ آدھی رات کے بعد جب کبھی میں کسی ضرورت سے اپنے کمرے کی لائٹ آن کرتا تھا تو ممی فوراً دروازے پر دستک دے کر پوچھتی تھیں۔ ''بیٹے! کیا بات ہے۔ خیریت تو ہے؟ کسی چیز کی ضرورت ہے تمہیں....؟''

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ ''محبت کرنے والے اتنی جلدی کیوں بچھڑ جاتے ہیں۔ میں بیس برس کا تھا' تب ممی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔''

صدیقہ بڑے پیار سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ صوفہ سے اتر کر اس کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''اب تو تصور میں آپ ہی کا چہرہ ابھرتا رہتا ہے۔''

اس نے خوش ہو کر پوچھا۔ ''میرا چہرہ....؟''

''ہاں۔ یہ دل آپ کی طرف کھنچا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے' میری ممی زندہ ہیں۔ آپ کے روپ میں میرے سامنے چلی آئی ہیں۔''

وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''میں نے تو پہلے دن سے ہی تمہیں اپنا بیٹا مان لیا ہے۔ تمہاری ماں واقعی تم سے دور نہیں ہے۔ میں ہوں ناں.... میں ہوں

تمہاری ماں....''

وقار نے بڑی محبت اور عقیدت سے اپنا سر اس کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔ وہ اسے تھپکتے ہوئے بولی۔ ''ہم دونوں خوش نصیب ہیں۔ تمہیں ایک ماں مل گئی ہے اور مجھے ایک جوان بیٹا... پہلے میرا ایک بازو تھا' اب دو ہو گئے ہیں۔ خدا مجھ سے راضی ہے۔ میں تم سے راضی ہوں۔ ہمیشہ تمہیں ایک ماں کی بھرپور ممتا دیتی رہوں گی۔''

وہ دونوں کچھ دیر تک اپنے اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے رہے۔ یے وقت سجاد وہاں آ گیا۔ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''کیا ہو رہا ہے؟''

وقار نے بڑے جذب کے عالم میں کہا۔ ''پتہ نہیں دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ میں تو اپنی ماں کی ممتا میں گم ہو چکا ہوں۔''

سجاد نے کہا۔ ''میری ماں کی تجوری میں ممتا کا اتنا خزانہ ہے کہ یہ دنیا کے سارے بچوں پر لٹاتی رہیں گی' تب بھی ختم نہیں ہوگا۔''

سجاد کی یہ عادت تھی۔ وہ وقتاً فوقتاً اپنے لاکٹ کو ہاتھ میں لے کر کھیلتا رہتا تھا۔ اسے کھول کر ماں کی تصویر دیکھتا رہتا تھا۔ وقار علی نے کہا۔ ''یہ آئیڈیا بہت زبردست ہے۔ ماں ہمیشہ سینے سے لگی رہتی ہیں۔ میں بھی ایسا لاکٹ بنواؤں گا۔''

وہ بولا۔ ''یہ میرا نہیں ماں کا آئیڈیا ہے۔ انہوں نے مجھے برتھ ڈے پر گفٹ دیا تھا۔ تب سے یہ ہر وقت میرے سینے سے لگا رہتا ہے۔''

وقار نے شکایتی انداز میں صدیقہ سے کہا۔ ''پھر تو میرے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ آپ نے مجھے بیٹا بنایا ہے۔ مگر اتنا خوبصورت گفٹ نہیں دیا۔ میں بھی آپ کو اپنی دھڑکنوں سے لگائے رکھنا چاہتا ہوں۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''اچھی بات ہے۔ میں کل ہی آرڈر دوں گی۔ جیولر ایک دو روز میں ایسا لاکٹ تیار کر کے لے آئے گا۔''

رات کے کھانے پر صدیقہ نے امجد سے کہا۔ ''مشاطہ نے وقار کے لئے ایک بہت ہی اچھی لڑکی دکھائی ہے۔ میں سوچتی ہوں' کل ہی بات پکی ہو جائے۔''

وہ لقمہ چباتے ہوئے بولا۔ ''اچھی بات ہے۔'' مگر وقار کو پہلے لڑکی کی تصویر دکھاؤ۔

وہ ہاں کہے تو بات آگے بڑھاؤ۔‘‘

’’ہاں۔ ہاں۔ میں نادان نہیں ہوں۔ وہ لڑکی پسند کرے گا' راضی ہوگا۔ تب ہی بات آگے بڑھاؤں گی۔ بس میری تو یہی خواہش یہی ہے کہ دونوں بہوئیں ایک ہی دن اس گھر میں آئیں۔‘‘

’’اس سلسلے میں تو وقار سے بات کرنی ہوگی۔ ہوسکتا ہے' وہ اپنی دلہن کو سیدھا اپنے فلیٹ میں لے جانا چاہے۔‘‘

’’میں اس سے بات کر چکی ہوں۔ وہ اپنی دلہن کے ساتھ ایک ماہ تک یہاں رہے گا۔ پھر وہ اپنے فلیٹ میں شفٹ ہو جائیں گے۔‘‘

جیولر نے تیسرے روز ہی ایک لاکٹ ان کے پاس پہنچا دیا۔ وہ اس چین لاکٹ کو وقار کے گلے میں پہناتے ہوئے بولی۔ ’’خدا کرے' ہمارے اس محبت بھرے رشتے کو کسی کی نظر نہ لگے۔‘‘

وہ لاکٹ کھول کر اس کی تصویر کو چومتے ہوئے بولا۔ ’’میں وعدہ کرتا ہوں' آپ کی محبت اور ممتا کا یہ تمغہ ہمیشہ اپنے سینے پر سجائے رکھوں گا۔‘‘

وہ اس کی پیشانی کو چومتے ہوئے بولی’’تم تو میرے دل میں ایسے آ کر بیٹھ گئے ہو' جیسے سجاد پیدائش سے پہلے میری کوکھ میں سما گیا تھا۔ اب تو دل سے یہی دعائیں نکلتی ہیں' کبھی تمہارا ٹرانسفر نہ ہو۔ تم ہمیشہ سجاد کی طرح میری نظروں کے سامنے' میرے آس پاس رہو۔‘‘

سجاد نے پوچھا۔ ’’کیا ٹرانسفر ہونا ضروری ہے؟‘‘

وہ بولا۔ ’’ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی' فی الحال ایسی کوئی بات نہیں ہے۔‘‘

صدیقہ کے دل سے آواز ابھری۔ ’’اور خدا کرے آئندہ بھی ایسا کوئی معاملہ نہ ہو۔ میرا بیٹا ہمیشہ میرے قریب رہے۔‘‘

وہ دونوں بیٹوں کی شادی کے سلسلے میں بڑی بے چین تھی۔ ان کے سر پر سہرا سجانے کا اشتیاق ایسا تھا' راتوں کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ چند ہی روز میں وقار کا رشتہ پکا ہو گیا تھا۔ پھر تو وہ دن رات شادی کی تیاریوں میں مصروف رہنے لگی تھی۔ شہنائیوں کی گونج میں دو بہوئیں اس گھر میں قدم رکھنے والی تھیں۔

امجد اس کی خوشیاں دیکھ رہا تھا۔ تنہائی میں اس سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا مگر موقع نہیں مل رہا تھا۔ کبھی وہ بیٹوں کے ساتھ لگی رہتی تھی' کبھی شادی کی شاپنگ میں مصروف رہتی تھی۔ جب گھر آتی تو ایسی تھک جاتی کہ کسی بھی موضوع پر بات کرنے کے قابل نہیں رہتی تھی۔

ایک روز تنہائی میں موقع ملا تو امجد نے کہا۔ ’’خود کو اتنا مصروف رکھو گی تو بہو لانے سے پہلے ہی بیمار پڑ جاؤ گی۔‘‘

وہ چہک کر بولی۔ ’’اس مصروفیت میں بڑا مزہ آ رہا ہے۔ دو دو بیٹوں کو دولہا بنانے کی ایسی خوشی ہے کہ ایک ذرا تھکن کا احساس نہیں ہوتا۔‘‘

پھر وہ اسے تازہ ترین شاپنگ کی چیزیں دکھانے لگی۔ وہ بولا۔ ’’تم نے دونوں بیٹوں کے سینوں پر اپنی تصویر سجائی ہے۔ مگر اب بہوئیں آ رہی ہیں۔‘‘

وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کی بات سنتے ہی تیور بدل کر بولی۔ ’’بہوئیں آ رہی ہیں تو کیا ہوا؟‘‘

’’نئے رشتے بنتے ہیں تو مزاج بدل جاتے ہیں۔ محبت کے انداز بدل جاتے ہیں۔ ماں کی جگہ بیوی کی تصویر لگ جاتی ہے۔‘‘

اس نے گھبرا کر پوچھا۔ ’’آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟‘‘

بیڈ روم کی دیوار پر صدیقہ کی بڑی سی تصویر لگی رہتی تھی۔ امجد اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ’’پہلے یہاں میری امی کی تصویر تھی۔ وہ دن رات میری نگاہوں کے سامنے رہتی تھیں۔ لیکن تم دلہن بن کر آئیں تو میری محبت کا انداز ہی بدل گیا۔‘‘

اس نے ایکدم سے چونک کر اپنی تصویر کو دیکھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ’’یہاں ماں کی جگہ تم آ گئیں۔ کیسے آ گئیں؟ کیسے تمہارا جادو چلتا رہا؟ مجھے پتہ ہی نہ چلا۔‘‘

اس نے ایک ذرا بے چین ہو کر اسے دیکھا۔ وہ اس کے ہاتھ کو تھپکتے ہوئے بولا۔ ’’ایک کی جگہ دوسرا کب آ جاتا ہے؟ دیوار پر لگی ہوئی تصویر اور مکان کے گیٹ پر لگی ہوئی نیم پلیٹ کیسے بدل جاتی ہے؟ کچھ پتہ نہیں چلتا۔ وقت خود کو دہرانے والا ہے۔ اس گھر میں تم میری دلہن بن کر آئی تھیں۔ اب بیٹوں کی دلہنیں آنے والی ہیں۔‘‘

وہ کبھی اپنی تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ کبھی امجد کے چہرے کو تکنے لگتی تھی۔ اس کی باتیں دماغ پر ہتھوڑے کی طرح لگ رہی تھیں۔ نگاہوں کے سامنے بیٹے گھوم رہے تھے۔ ان کے لاکٹس کے ننھے سے فریم میں وہ مسکرا رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”نہیں۔ میرے بیٹے کبھی اپنی ماں کو خود سے الگ نہیں کریں گے۔ میں کچھ زیادہ تو نہیں مانگ رہی ہوں۔ بس ان کے دل کے قریب ایک ذرا سی جگہ چاہتی ہوں۔ آپ خواہ مخواہ مجھے ڈرا رہے ہیں۔“

”ڈرا نہیں رہا ہوں۔ وقت سے پہلے سمجھا رہا ہوں تا کہ ایسی کوئی بات ہو تو تمہیں زیادہ صدمہ نہ پہنچے۔ انسان کو ذہنی طور پر کسی بھی سانحے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔“

وہ ایکدم سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ احتجاج کرنے کے انداز میں بولی۔ ”میرے بیٹے ایسے نہیں ہیں۔ میں نے دونوں کو ایسی تربیت دی ہے کہ وہ اپنی ماں کو اس کے مقام سے ہرگز نہیں گرائیں گے۔ میں نئی آنے والیوں کو اپنے دل میں جگہ دوں گی۔ اپنے سر پر بٹھاؤں گی تو وہ میری جگہ کبھی نہیں لیں گی۔“

وہ زیرِ لب بڑبڑاتا ہوا وہاں سے جانے لگا۔ ”میری امی بھی تمہیں سر پر بٹھاتی رہی تھیں۔ انسان کو زبان سے سمجھاؤ' نہیں سمجھتا۔ وہی بات وقت اسے سمجھا دیتا ہے.....“

اس نے بڑبڑاہٹ نہیں سنی۔ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی اور اپنے طور پر دل کو سمجھاتی رہی۔

☆☆☆

شام کے بعد ایک میرج ہال میں نکاح کی رسم ادا ہونے والی تھی۔ دونوں بیٹوں کا ایک ساتھ نکاح ہونے والا تھا۔ انہیں ایک کمرے میں دولہا بنایا جا رہا تھا۔ صدیقہ کے تو جیسے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ وہ کبھی مہمانوں کے درمیان نظر آتی تھی۔ کبھی بیٹوں کے حجلہء عروسی میں جا کر دیکھتی تھی کہ سجاوٹ میں کہیں کوئی کمی نہ رہ گئی ہو۔ پھر اس کمرے کی طرف دوڑی جاتی تھی' جہاں سجاد کے کزنز انہیں دولہا بنا رہے تھے۔

وہ نوکروں کو ہدایت دیتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی۔ امجد نے کہا۔ ”نو بج چکے ہیں۔ کب بارات جائے گی؟ کب نکاح ہوگا؟ کب رخصتی ہوگی؟ وقت کا خیال رکھو بیگم.....!“

وہ جیولری پہنتے ہوئے بولی۔ ”میں تو بالکل تیار ہوں۔“

”یہ تم پچھلے تین گھنٹوں سے کہہ رہی ہو اور یہاں سے بار بار بیٹوں کی طرف جا رہی ہو۔“

”کیوں نہ جاؤں؟ وہ دولہا بن رہے ہیں۔ اَن کی تیاری میں کوئی کمی رہ گئی تو.....؟“

”ان کے کزن انہیں تیار کر رہے ہیں مگر تم مطمئن ہونے والی نہیں ہو۔ وہاں دونوں لڑکیوں کی فیملیاں پہنچ گئی ہوں گی۔ بس۔ اب نکل چلو۔“

”ہاں۔ ہاں۔ چلتے ہیں۔ میرا خیال ہے' وہ دونوں تیار ہو گئے ہوں گے۔ میں دیکھ کر آتی ہوں۔“

وہ مسکرا کر بولا۔ ”تمہیں تو بس اس طرف جانے کا بہانہ چاہئے۔“

وہ دروازہ کھول کر جانا چاہتی تھی۔ مگر بیٹوں کو دیکھ کر رک گئی۔ وہ دولہا بنے اپنے کزنز کے درمیان اسی طرف آ رہے تھے۔ وہ آگے بڑھ کر ان کی بلائیں لیتے ہوئے بولی۔ ”ماشاءاللہ.....خدا میرے شہزادوں کو نظرِ بد سے بچائے۔“

پھر وہ ہزار ہزار کے دو نوٹ ان کے سروں سے وار کر ملازموں کو دینے لگی۔ امجد نے وہاں آتے ہوئے کہا۔ ”کیا بیٹوں کے ہی صدقے واری جاتی رہو گی؟ بہوؤں کے لئے بھی تھوڑا پیار بچا کر رکھو۔ وہ بے چاریاں وہاں انتظار کر رہی ہوں گی۔ اب یہاں سے چل بھی پڑو۔“

باراتی مہمان میرج ہال پہنچنے کے لئے کوٹھی سے روانہ ہو رہے تھے۔ صدیقہ بیٹوں کے ساتھ گھر سے نکلنے لگی تو بیڈ روم میں اپنی تصویر دیکھ کر ایک ذرا ٹھٹک گئی۔ کانوں میں امجد کی آواز گونجنے لگی۔ ”نئے رشتے بنتے ہیں تو مزاج بدل جاتے ہیں۔ محبت کے انداز بدل جاتے ہیں۔ ماں کی جگہ بیوی کی تصویر لگ جاتی ہے۔“

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی۔ پھر وہاں سے پلٹ کر اسٹور روم کی طرف چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں امجد کی والدہ کی یعنی اپنی ساس کی بڑی سی تصویر تھی۔ وہ اسے ایک ملازم کے حوالے کرتے ہوئے بولی۔ ”میری تصویر اتار کر اسٹور روم میں رکھ دو اور اِسے یہاں دیوار پر لگا دو۔“

ملازم نے فوراً ہی حکم کی تعمیل کی۔ امجد اسے ڈھونڈتا ہوا کوٹھی میں آیا تو بیوی کی جگہ اپنی ماں کی تصویر دیکھ کر ایکدم سے ٹھٹھک گیا۔ حیران ہو کر صدیقہ کو دیکھنے لگا۔ وہ اس سے کترا کر باہر جاتے ہوئے بولی۔ ''چلیں۔ دیر ہو رہی ہے۔''

وہ میاں کی طرف دیکھے بغیر وہاں سے چلی گئی۔ بچوں کو ہدایات دینے سے پہلے بزرگوں کو اپنا محاسبہ کرنا چاہئے۔ وہ بھی یہی کر رہی تھی۔ مگر ذرا دیر سے کر رہی تھی۔ امجد زیر لب مسکراتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے جانے لگا۔

☆☆☆

صبح کے پانچ بجتے ہی اس کی آنکھ ایسے کھل گئی' جیسے وہ جاگ رہی تھی۔ دور و نزدیک کی مسجدوں سے اللہ اکبر کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ برابر ہی امجد گہری نیند سو رہا تھا۔

وہ دو گھنٹے پہلے دونوں دلہنوں کو ان کے کمروں میں پہنچا کر اپنے بیڈ روم میں آئی تھی۔ رات کو ہی تمام مہمان رخصت ہو گئے تھے۔ کوٹھی میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ بیڈ سے اتر کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ معمول کے مطابق بیٹے کو نماز کے لئے جگانا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک کھڑی سوچتی رہی' پھر ایک ایک قدم اٹھاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

کروٹ بدلتے وقت امجد کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر پوچھا۔ ''کہاں جا رہی ہو...؟''

وہ پلٹ کر بولی۔ ''نماز کا وقت ہو رہا ہے۔''

وہ اس کے ارادے کو سمجھ گیا تھا کہ بیٹے کو جگانے جا رہی ہے۔ پھر بھی انجان بنتے ہوئے بولا۔ ''تو وضو کر کے نماز پڑھو۔ باہر کہاں جا رہی ہو؟''

وہ ایک ذرا ہچکچا کر بولی۔ ''وہ۔ میں سجاد کو جگانے جا رہی ہوں۔ آج تو وقار بھی یہاں ہے۔ اسے بھی جگانا ہے۔ دونوں کو اب اُٹھ جانا چاہئے۔''

وہ کروٹ بدلتے ہوئے بولا۔ ''یا خدا! کچھ تو عقل سے سوچو.. وہ ابھی سوئے ہوں گے اور تم انہیں جگانے جا رہی ہو؟''

''کچھ بھی ہو۔ اپنی سانسیں چھوڑی جا سکتی ہیں۔ نمازیں نہیں چھوڑی جا

سکتیں۔ وہ پڑھ کر پھر سو جائیں گے۔''

وہ دروازہ کھول کر جانا چاہتی تھی۔ امجد نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ ''نہیں صدیقہ..! انہیں سونے دو۔ تم یہاں آؤ۔''

وہ دروازے سے پلٹ کر اس کے پاس آ گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہاری بے چینی سمجھ رہا ہوں۔ جب سے بستر پر آئی ہو' مسلسل کروٹیں بدلتی رہی ہو۔ بیٹے کی طرف دھیان لگا رہا کہ لاڈلے کو تنہا سونے کی عادت ہے۔ پتہ نہیں' بہو کے ساتھ نیند آئے گی یا نہیں؟''

وہ بولی۔ ''جی نہیں۔ میں ایسا کچھ نہیں سوچ رہی تھی۔ آپ تو خواہ مخواہ بیٹے کی محبت کا طعنہ دیتے رہتے ہیں۔ میں تو نماز کے لئے....''

وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''حالات کو سمجھو۔ اب بہو آ گئی ہے۔''

''یعنی بہو آ گئی ہے تو بیٹا صبح کی نماز نہیں پڑھے گا؟''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''پڑھے گا۔ کیوں نہیں پڑھے گا؟ لیکن آج شادی کی پہلی صبح ہے۔ انہیں اپنی مرضی سے سونے جاگنے دو۔''

وہ درست کہہ رہا تھا۔ مگر صبح سویرے بیٹے کا چہرہ دیکھنے کی ایسی عادت تھی کہ وہ بدلے ہوئے حالات کو نظر انداز کر کے اس کی طرف دوڑی چلی جا رہی تھی۔ امجد نے سمجھایا تو جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ پھر وہاں سے اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ''ٹھیک ہے۔ لیکن کل یہ کوتاہی برداشت نہیں کروں گی۔ کتنا اچھا لگتا' اگر چاروں بیٹے بہوئیں اور میں... ہم سب مل کر نماز ادا کرتے؟''

وہ بولتی ہوئی واش روم میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وضو کر کے باہر آئی تو امجد آنکھیں بند کئے لیٹا ہوا تھا' شائد سو گیا تھا۔ وہ مصلّے پر آ کر نماز ادا کرنے لگی۔ مگر اندر سے بے چین تھی۔ یہ پہلی صبح تھی کہ وہ بیٹے کو جگائے بغیر نماز ادا کر رہی تھی۔

صبح کا اجالا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا' نو بجنے والے تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ امجد کو اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''نو بج رہے ہیں۔ آپ سب کی نیندیں کب پوری ہوں گی؟ پورے گھر میں سناٹا چھایا ہوا ہے۔''

وہ کسمسا کر آنکھیں کھولتے ہوئے بولا۔ ''ایک ہفتے بعد نیند پوری کرنے کا موقع ملا ہے۔ شادی کے ہنگامے نے تھکا مارا ہے۔''

وہ بیڈ سے اترتے ہوئے بولی۔ ''بس بہت نیند ہو چکی۔ اب اٹھ جائیں۔ میں سجاد کے پاس جا رہی ہوں۔ جب اس کی پیشانی چومتی ہوں' تب ہی وہ جاگتا ہے۔ ورنہ سوتا ہی رہتا ہے۔ مجھے کم از کم اسے جگانے کے لئے وہاں جانا چاہیے۔''

وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ امجد نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''اپنی ممتا کو اب اسی کمرے تک رہنے دو۔ وہ کمرہ صرف تمہارے بیٹے کا نہیں ہے۔ بہو کا بھی ہے۔''

وہ الجھ کر بولی۔ ''میں جب بھی بیٹے کے پاس جانا چاہتی ہوں' آپ روکنے لگتے ہیں۔ آخر بات کیا ہے؟ میں نادان بچی تو نہیں ہوں۔ اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ بیٹا اب بہو کی ذمہ داری ہے۔ وہی اسے سلائے گی' وہی جگائے گی مگر...''

''جب سمجھتی ہو تو پھر اگر مگر کیا...؟''

''اچھا ٹھیک ہے۔ اندر نہیں جاؤں گی۔ دروازے پر دستک تو دے سکتی ہوں؟''

''میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ جب تک وہ دروازہ نہیں کھولیں گے' تم ان کے سر پر کھڑی رہو گی۔''

''توبہ ہے۔ آپ تو میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ میں وہاں کیوں کھڑی رہوں گی؟ اور بہت سے کام ہیں۔ سب کی پسند کا ناشتہ تیار کروانا ہے۔ خدا کے لئے اب پیچھے سے آواز نہ دیں۔ میں جا رہی ہوں۔''

وہ کچھ سنے بغیر ایک جھٹکے سے دروازہ کھولتی ہوئی باہر چلی گئی۔

سجاد کی آنکھیں بند تھیں۔ آنکھیں بند ہوں تو دنیا کے نظارے گم ہو جاتے ہیں۔ مگر اسے تو بند آنکھوں کے پیچھے بھی وہی نظارہ دکھائی دے رہا تھا جو تمام رات کھلی آنکھوں کے سامنے تھا۔ پہلے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اب آ کر پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ رات بھر دلہن کی ادائیں کبھی جگاتی' کبھی تھپکتی رہی تھیں۔ ماں کی لوری نے سلایا ہوتا تو صبح سویرے ہی آنکھ کھل جاتی۔

[illegible] کی پھوہار سی چہرے پر پڑی تو اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ

ہوش اڑانے والی اسے ہوش میں لا رہی تھی۔ سیاہ ریشمی گھٹاؤں سے پانی برسا رہی تھی۔ سجاد نے اسے اپنی طرف کھینچا تو وہ کٹی پتنگ کی طرح آغوش میں چلی آئی۔ وہ بڑے شاعرانہ انداز میں بولا۔ ''نہ جھٹکو زلف سے پانی۔ یہ موتی ٹوٹ جائیں گے......''

وہ بھی شاعرانہ انداز میں جواباً بولی۔ ''نہ یوں جھٹکے سے تم کھینچو۔ یہ ڈالی ٹوٹ جائے گی۔''

وہ اس سے آگے بھی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن چپ ہو گئی۔ سجاد اسے ذرا ہٹا کر اپنے سینے پر کچھ تلاش کر رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا ڈھونڈ رہے ہو؟''

وہ گردن کے پیچھے ہاتھ لے جا کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''جسٹ اے منٹ...''

تھوڑی دیر بعد ہی اس کے ہاتھ میں ماں کا لاکٹ تھا۔ وہ اسے کھول کر چومتے ہوئے بولا۔ ''بچپن سے عادت ہے' آنکھ کھلتے ہی پہلے ماں کو دیکھتا ہوں' انہیں چومتا ہوں پھر بستر سے اترتا ہوں۔''

نبیلہ اس لاکٹ کو دیکھ رہی تھی۔ یہ عجیب سا لگا تھا کہ شوہر پہلی صبح نئی نویلی کو ایک طرف ہٹا کر ماں کو پیار کر رہا ہے۔ وہ محبت سے پاس آئی تھی۔ مگر ان لمحات میں ایسا لگ رہا تھا' جیسے ممتا نے اسے میاں کے بستر سے گرا دیا ہے۔ وہ بے دلی سے مسکرا کر بولی۔ ''مگر آج معمول کے خلاف ہو گیا۔ تم نے آنکھ کھلتے ہی مجھے دیکھا ہے۔''

وہ اسے اپنی گرفت میں لیتے ہوئے بولا۔ ''مگر چوما تو پہلے ماں کو ہے۔''

وہ ایک جھٹکے سے الگ ہو گئی۔ بیڈ سے اُترتے ہوئے بولی۔ ''ماں کے پاس جاؤ اور انہیں گلے لگا کر چومتے رہو۔''

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولا۔ ''پلیز ناراض نہ ہونا۔ میں معمول کے مطابق اپنا فرض ادا کر رہا تھا۔ اب ہمارے درمیان کوئی ہستی نہیں آئے گی۔''

وہ تنبیہ کے انداز میں انگلی دکھاتے ہوئے بولی۔ ''کوئی نہیں....؟''

''کوئی نہیں....''

''پرومس....؟''

''یس.. جنٹلمین پرومس....''

پھر اس پر جھکتے ہوئے گنگنایا۔ ''یار کو میں نے۔ مجھے یار نے سونے نہ دیا۔ پیار ہی پیار کیا۔ پیار نے سونے نہ دیا.....''

وہ ہنسنے کھکھلانے لگی۔ اس نے ماں کے لاکٹ کو سینے کی طرف سے ہٹا کر پشت کی طرف پہنچا دیا گیا تھا۔ کامیابی ایک ہی چھلانگ میں حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے لئے مرحلہ وار ایک ایک قدم چلنا پڑتا ہے۔

وہ تھوڑی دیر بعد آئینے کے روبرو آ گئی۔ گیلے بالوں میں برش کرنے لگی۔ سجاد اس کے پیچھے آ کر ایک ہائے کے ساتھ بولا۔ ''ہائے...! آئینے کے سامنے تو سب ہی نظر آتے ہیں۔ میرا کمال یہ ہے کہ میں بند آنکھوں کے پیچھے بھی تمہیں دیکھنے لگا ہوں۔''

وہ خوشی سے کھل گئی۔ تھوڑی دیر پہلے ذرا بجھ سی گئی تھی' مگر اب اس کی باتیں سن کر اندر ہی اندر خوشی سے لہرا رہی تھی۔ مسکرا کر بولی۔ ''بند آنکھوں کے پیچھے تاریکی میں مجھے دیکھنے لگے ہو۔ کوئی اس طرح دل و دماغ پر چھا جائے تو اسے آسیب کہتے ہیں۔''

''تم آسیب نہیں' سیب ہو۔ میری جھولی میں آ گری ہو۔ پہلے شجرِ ممنوعہ تھیں۔ اب نہیں ہو۔ شائد کبھی جنت سے نکالا گیا تھا۔ اب واپس اپنی جنت میں پہنچ گیا ہوں۔''

وہ اور بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ایکدم سے چُپ لگ گئی۔ دروازے پر دستک یوں سنائی دی' جیسے بہشت سے نکالے جانے کی منادی ہو رہی ہو۔ باہر سے صدیقہ کی آواز سنائی دی۔ ''سجاد بیٹے! میری جان! اٹھ جاؤ...''

ماں کی آواز سنتے ہی وہ فوراً دروازہ کھولنے کے لئے آگے بڑھا۔ نبیلہ نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر سرگوشی میں کہا۔ ''کیا کرتے ہو؟ میں نائٹ ڈریس میں ہوں۔''

وہ اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہاں۔ لیکن باہر ماں ہیں۔''

''آواز دے کر کہہ دو۔ جاگ گئے ہو۔''

سجاد نے سر گھما کر دروازے کو دیکھا پھر بیوی کو دیکھا۔ ماں کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ''سجاد! بیٹا اب اٹھ بھی جاؤ۔''

نبیلہ نے ٹہوکا دیا کہ جواب دے۔ وہ بے بسی سے بولا۔ ''بند دروازے کے پیچھے سے جواب دینا اچھا نہیں لگ رہا ہے۔''

''بالکل ہی نادان بچے ہو؟ کیا چاہتے ہو' اسی حالت میں ان کا سامنا کروں؟''

دستک ایک بار پھر سنائی دی۔ سجاد تذبذب میں تھا۔ ہچکچاتے ہوئے دو قدم آگے بڑھ کر بولا۔ ''جی۔ جی ماں! ہم جاگ گئے ہیں۔''

صدیقہ بند دروازے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''جاگ گئے ہو تو دروازہ کھولو۔''

اندر سے کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ وہ بے چین سی ہو کر کبھی بند کھڑکیوں کی طرف اور کبھی دروازے کے پاس ادھر سے ادھر منڈلانے لگی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو جھک کر دروازے کے کی ہول سے جھانکنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ مہذب تعلیم یافتہ تھی لیکن ان لمحات میں ممتا باؤلی ہو رہی تھی۔ بیٹے کو باہر نکالنے کے لئے اخلاقی حدود کو بھول رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک جھکی رہی مگر کچھ دکھائی نہیں دیا۔ شاید اندر سے چابی لگی ہوئی تھی۔

امجد وہاں آتے ہوئے ایکدم سے ٹھٹھک گیا۔ دبی زبان میں اسے ڈپٹتے ہوئے بولا۔ ''یہ کیا حرکت ہے...؟''

وہ ایکدم سے چونک کر دروازے سے دور ہو گئی۔ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''وہ۔ میں سجاد....''

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے جاتے ہوئے بولا۔ ''کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کیسی بے تکی حرکتیں کر رہی ہو؟''

وہ چور سی ہو گئی تھی۔ کوئی جواب نہ دے سکی۔ ہاتھ چھڑا کر چپ چاپ کچن کی طرف چلی گئی۔

کمرے کے اندر نبیلہ کہہ رہی تھی۔ ''اب تم کنوارے بچے نہیں رہے ہو جو بے دھڑک دروازہ کھولنے جا رہے تھے۔''

وہ ہنس کر بولا۔ ''مجھے تمہارا خیال ہی نہیں رہا تھا۔''

''یہ میری بدنصیبی ہے کہ ماں کی آواز سنتے ہی مجھے بھول گئے۔''

''یہ بات نہیں ہے۔ وہ دراصل...''

''بات اب وہی ہو گی جو میں چاہوں گی۔ شادی کے بعد زندگی کے طور طریقے بدل جاتے ہیں۔ کچھ سمجھا کرو۔ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے میاں بیوی ایک دوسرے

سے صلح مشورہ کرتے ہیں۔ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو پھر یہاں میری ضرورت کیا ہے....؟"

وہ بولا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو؟ تم تو آتے ہی میری ضرورت بن گئی ہو۔"

وہ سر جھٹک آئینے کے روبرو آتے ہوئے بولی۔ "تقدیر میں لکھا تھا اس لئے ضرورت بن گئی ہوں، ورنہ تم تو ماں کی مرضی سے کسی دوسری کو ضرورت بنانے والے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ دوسری میں ہی نکل آئی۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "لگتا ہے، ساری زندگی یہ طعنہ سننا پڑے گا۔ رات کو جب گھونگھٹ اٹھایا تھا، تب بھی تمہاری زبان پر یہی شکوہ تھا کہ میں نے تمہیں حاصل کرنے کے لئے کوئی جدوجہد نہیں کی ہے۔"

وہ بولی۔ "بے شک۔ یہی حقیقت ہے۔"

پھر وہ اسے واش روم کی طرف دھکیلتے ہوئے بولی۔ "جاؤ۔ فٹافٹ شاور لو۔ ابھی پھر دستک ہونے لگے گی۔"

وہ واش روم میں چلا گیا۔ وہ ذرا سنجیدگی سے بند دروازے کو دیکھتی رہی۔ پھر سر جھٹک کر بالوں میں برش کرتے ہوئے گنگنانے لگی۔

ڈائننگ ٹیبل ایک سرے سے دوسرے سرے تک ناشتے سے لدی ہوئی تھی۔ صدیقہ ایک تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے ملازمہ سے بولی۔ "ہوں۔ کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ وہ سب آجائیں تو فریج سے مکھن لے آنا۔"

ملازمہ سر ہلاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ امجد ایک کرسی پر آکر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "بہت خوب۔ کوئی بارات آنے والی ہے کیا....؟"

وہ چمچ اور فورک کو ترتیب سے رکھتے ہوئے بولی۔ "میرے بیٹے اور بہوئیں آنے والی ہیں۔ یہ کیا کم ہے؟"

"جہاں تک میرا خیال ہے، پہلی صبح دلہن کے میکے سے ناشتہ آتا ہے۔ ہماری بہوؤں کے گھر والے نہیں آئے؟"

"وہ تو آنا چاہتے تھے۔ میں نے ہی منع کر دیا۔ مجھے یہ رسم اچھی نہیں لگتی۔"

پھر وہ بے چین ہو کر اُدھر دیکھنے لگی، جدھر سے بیٹوں اور بہوؤں کو آنا تھا۔ وہ سجاد

کے دروازے پر دستک دینے کے بعد امجد سے کترا کر وقار کی طرف گئی تھی۔ ادھر بھی بند دروازے کے پیچھے سے بیٹے کی آواز سنائی دی تھی کہ وہ دونوں جاگ گئے ہیں۔ ابھی تیار ہو کر باہر آتے ہیں۔

ایک گھنٹہ گزر گیا تھا۔ صدیقہ کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے سر گھما کر امجد کو دیکھا۔ پھر ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "وہ۔ آپ کہیں تو.... ایک بار پھر دستک دے دوں؟ ایسا نہ ہو، وہ دوبارہ سو گئے ہوں۔ بچے ہی تو ہیں۔"

"وہ بچے نہیں ہیں۔ تم بچی بن رہی ہو۔ آرام سے بیٹھی رہو۔"

وہ پہلو بدل کر رہ گئی۔ ایسے ہی وقت وقار اور اس کی دلہن ندا نے آکر انہیں سلام کیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کی بلائیں لینے لگی۔ "ماشاءاللہ... کتنے پیارے لگ رہے ہو۔ تم دونوں کے یہاں رہنے سے میرا گھر آباد ہو گیا ہے۔"

وہ بہو کی پیشانی کو چومتے ہوئے بولی۔ "آؤ دلہن! تم میرے برابر والی کرسی پر بیٹھو۔"

وہ دونوں اس کے دائیں طرف کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اسی وقت سجاد نے نبیلہ کے ساتھ آکر سلام کیا۔ صدیقہ فوراً ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے بولی۔ "بہت انتظار کرایا ہے۔"

پھر وہ ان کی بلائیں لیتے ہوئے نبیلہ سے بولی۔ "آؤ دلہن! یہاں میرے برابر بیٹھو۔"

وہ اسے اپنی بائیں طرف ایک کرسی پر بٹھانے لگی۔ سجاد نے جلدی سے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "یہ تو میری سیٹ ہے۔"

نبیلہ بیٹھتے بیٹھتے رک گئی۔ صدیقہ نے بیٹے سے کہا۔ "اب تمہاری سیٹ یہاں نہیں... دلہن کے برابر ہے۔ چلو وہاں بیٹھو۔"

وہ ناراضی دکھاتا ہوا دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ نبیلہ ایک بار پھر بجھ گئی۔ وہ بچہ ماں کے برابر بیٹھنے کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔ دل نے کہا۔ "ایسی بات نہیں ہے۔ یہ حضرت ماں سے ظاہری لاڈ کر رہے ہیں۔ محبت کا دکھاوا کر رہے ہیں۔ میں ذرا انہیں آزماتی ہوں۔"

صدیقہ نے کہا۔ ''بیٹھو بیٹی..!''

اس نے سجاد کو دیکھا پھر کہا۔ ''میں نہیں چاہتی' میرے آنے سے اس گھر کے معمولات میں فرق آئے۔ سجاد! آپ اپنی سیٹ پر آجائیں۔''

اس کا خیال تھا' وہ انکار کردے گا۔ مگر اس کی توقع کے خلاف ہوا۔ وہ فوراً ہی اپنی کرسی پر ماں کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''تھینک یو نبیلہ.....!''

اس کا چہرہ اتر گیا۔ وہ بے دلی سے دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ صدیقہ نے نہال ہوکر بیٹے کو دیکھا پھر کہا۔ ''یہ تو میرا دیوانہ ہے۔''

امجد نے کہا۔ ''بھئی ناشتہ شروع کرو۔ ہم سب انتظار کررہے ہیں۔''

وہ سب ناشتہ کرنے لگے۔ کھاتے وقت نبیلہ دیکھ رہی تھی۔ سجاد کوئی بھی ڈش اٹھاتا تو پہلے ماں کو پیش کرتا پھر اس کی طرف بڑھا دیتا تھا۔ دوسری طرف وقار بھی یہی کررہا تھا۔ نبیلہ ندا کو دیکھ کر سوچ رہی تھی۔ ''یہ بھی اندر ہی اندر کڑھ رہی ہوگی۔ چہرے سے تو ایسا ظاہر کررہی ہے' جیسے کسی بات کا نوٹس ہی نہیں لے رہی ہے اور کیوں لے گی؟ اسے سدا یہاں نہیں رہنا ہے۔ ایک دو ہفتے بعد اپنے گھر چلی جائے گی۔ پھر تو میں رہوں گی اور ساسو ماں رہیں گی۔''

یہ ساس بھی عجیب شے ہوتی ہے۔ اسے دیکھ کر بہوؤں کی سانسیں رکنے لگتی ہیں۔ صدیقہ روایتی ساس نہیں بننا چاہتی تھی۔ نبیلہ بھی یہی سوچ کر آئی تھی کہ اس گھر میں بہو نہیں' بیٹی بن کر رہے گی۔ سوچنے کو تو انسان بہت کچھ سوچ لیتا ہے۔ مگر یہ بعد میں پتہ چلتا ہے کہ ایک دوسرے کے مدِ مقابل آکر سوچ کیسے بدل جاتی ہے؟

ایک ماہ بعد وقار اور ندا اپنے فلیٹ میں چلے گئے۔ اس عرصہ میں وقار نے صدیقہ کو ایک بیٹے کی بھرپور محبتیں دی تھیں۔ اس معاملے میں وہ کبھی کبھی سجاد پر سبقت لے جاتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد صدیقہ ایک طرح کی کمی محسوس کرنے لگی تھی۔ ویسے ہر اتوار کو ہفتے میں ایک بار چاروں بیٹے اور بہویں گھر میں خوشیوں کا میلہ سا لگا دیتے تھے۔

سجاد کو پھولوں کے گہنے بہت اچھے لگتے تھے' وہ اکثر آفس سے گھر آتے ہوئے نبیلہ کے لئے موتیا کے گجرے لایا کرتا تھا۔ جب اس کے لئے لاتا تو ماں کو بھی ضرور پہناتا تھا۔ دو طرفہ محبت میں توازن برقرار رکھنے کے لئے ایسا کرنا ضروری تھا۔ نبیلہ کو اس کی مجبوری

کا احساس تھا لیکن یہ بات کھٹکتی رہتی تھی کہ وہ گجرے لے کر پہلے ماں کے پاس ہی کیوں جاتا ہے؟ اگر جاتا ہے تو کیا اپنے ہاتھوں سے پہنانا بہت ضروری ہے؟

ہر عورت اپنی برتری' اپنی اولیت چاہتی ہے' خاص طور پر شوہر کے معاملے میں سب ہی انتہا پسند ہوتی ہیں اور تنہائی پسند بھی... اپنے اور شوہر کے درمیان اس کی پیدا کرنے والی ماں کو بھی برداشت نہیں کرنا چاہتیں۔

ایک رات وہ نبیلہ کی کلائیوں میں گجرے پہنا رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''تمہیں بہت پسند ہیں ناں؟''

وہ اس کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے بولا۔ ''ہاں۔ کیونکہ تمہارے ہاتھ پھولوں کو چھونے کے لئے بنے ہیں۔''

''ایک بات بتاؤ' یہ تو گجرے ہیں۔ میرے لئے لاتے ہو تو ماں کے لئے بھی ضرور لاتے ہو۔ کیا ایسا ہر معاملے میں ہوا کرے گا؟''

اس نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا مطلب۔؟''

''کیا اس گھر میں کوئی بھی چیز صرف اور صرف میرے لئے نہیں آئے گی؟ اس روز تم اپنی پسند سے ایک لان کا سوٹ لائے تھے۔ ویسا ہی ماں کے لئے بھی لے آئے۔ کیا ان کے لئے کوئی دوسرا پرنٹ نہیں لاسکتے تھے؟''

''یہ کیسی باتیں کررہی ہو؟ مجھے جو چیز پسند آجاتی ہے۔ وہ میں دونوں کے لئے خریدتا ہوں۔ اس میں حرج کیا ہے؟''

سجاد کے تیور ایک ذرا بدل گئے تھے۔ وہ اس کا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ فوراً ہی بات بناتے ہوئے بولی۔ ''تم میری بات سمجھ نہیں رہے ہو۔ کچھ چیزیں صرف جوان لڑکیوں پر ہی سوٹ کرتی ہیں۔ تم جو پرنٹ لائے تھے' وہ بزرگ خواتین کے پہننے کا نہیں تھا۔ خواتین کی شاپنگ کچھ اور طرح کی ہوتی ہے۔ مرد حضرات کے پلے نہیں پڑتی۔''

''تو یوں کہو ناں' مجھے شاپنگ کرنی نہیں آتی؟ ٹھیک ہے آئندہ تم ساتھ رہا کرو گی۔''

وہ خوش ہوگئی۔ دل ہی دل میں مسکرا کر سوچنے لگی۔ ''خدا کا شکر ہے' میاں صاحب اس حد تک تو فرمانبردار ہوئے۔''

بس یہ عجیب سی فطرت ہے۔ جو ازل سے ہے' ابد تک رہے گی۔ بیویاں اپنے میاؤں کو "میاؤں میاؤں" کراتے ہوئے اپنی ڈگر پر چلا کر بڑی خوش ہوتی ہیں۔

وہ لوہا تھا تو وہ اسے پیار سے پگھلانا جانتی تھی۔ یہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ بڑے صبر سے کام لینا ہوگا۔ ماں اٹھائیس برسوں سے اپنا نسخہ گھول کر پلا رہی تھی۔ اب نئی لیڈی ڈاکٹر آگئی تھی۔ آئندہ نئے نسخے کی اثر پذیری میں کچھ وقت لگنے والا تھا۔

وہ آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ اس کی نک ٹائی درست کرنے کے لئے قریب آئی تو لاکٹ شرٹ سے باہر جھول رہا تھا۔ وہ آگے بڑھتے بڑھتے ایکدم سے ایسے رک گئی جیسے کوئی بدروح کسی عامل کو دیکھ کر پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ اس سے کتراتی ہے۔

وہ بھی کنی کترا گئی۔ پاس آ کر دور چلی گئی۔ نک ٹائی درست کرتی تو ہاتھ لاکٹ سے مس ہوتے جبکہ وہ اسے چھونا تو کیا دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتی تھی۔ ایسا لگتا تھا' جیسے ساس ہر وقت بیٹے کے سینے پر رہ کر بہو کے سینے مونگ دلتی رہتی ہے۔ تنہائی میں بھی وہ تنہا نہیں ہوتے تھے۔ ساس ان کے ساتھ لگی رہتی تھی۔ یہ احساس نبیلہ کو چپ چاپ چباتا رہتا تھا۔

اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میرے گھر والے کہتے ہیں' میں بہت بدل گئی ہوں۔ خاص طور پر امی تو یہی شکایت کرتی رہتی ہیں۔"

وہ بریف کیس میں ضروری کاغذات رکھتے ہوئے بولا۔ "کیوں بھئی؟ انہیں شکایت کا موقع کیوں دیتی ہو؟"

"تم ہی بتاؤ۔ جب شادی ہو جاتی ہے تو میاں بیوی کی ہر چیز' ہر بات ایک دوسرے سے وابستہ ہو جاتی ہے یا نہیں؟"

"بالکل ہو جاتی ہے۔"

"ازدواجی رشتہ اتنا اہم ہوتا ہے کہ باقی تمام رشتے اس کے پیچھے رہ جاتے ہیں۔"

سجاد نے لاکٹ کو شرٹ کے اندر کر لیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آگئی۔ اس سے لگ کر بڑی محبت سے بولی۔ "میں تم سے وابستہ ہو کر ایک بہت اہم چیز کو خود سے الگ کر چکی ہوں۔ وہ میرے لئے ایسے ضروری تھی' جیسے زندہ رہنے کے لئے سانسیں ضروری ہوتی ہیں۔ لیکن تم نے کبھی نوٹس ہی نہیں لیا۔"

سجاد نے چونک کر پوچھا۔ "کس کی بات کر رہی ہو؟"

اس نے اپنے سینے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "وہ یہاں میری دھڑکنوں سے لگی رہتی تھی۔"

"کون...؟"

"میری امی۔"

"ارے ہاں۔ مجھے تو خیال ہی نہیں رہا۔ تم بھی اپنی امی کا لاکٹ پہنا کرتی تھیں۔ کہاں ہے وہ.....؟"

وہ مسکرا کر بولی۔ "چھوڑ آئے ہم وہ گلیاں.."

اس نے اس کے سینے پر ایسی جگہ سر رکھا' جہاں وہ لاکٹ نہیں تھا۔ پھر کہنے لگی۔ "میرے اندر اور باہر صرف تم ہی تم ہو۔ مجھے اپنے اور تمہارے درمیان کسی تیسرے کو شریک کرنا اچھا نہیں لگتا۔"

دل کی بات زباں پر آ ہی گئی۔ سجاد سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ ایسے وقت بے خیالی میں اس کا ہاتھ اپنے سینے پر چلا گیا تھا۔ اس کی خاموشی سمجھا رہی تھی کہ لوہا گرم ہے۔ نبیلہ فوراً ہی ضرب لگاتے ہوئے بولی۔ "میں امی سے کہتی ہوں' محبت دکھاوا نہیں مانگتی۔ سچائی مانگتی ہے۔ لاکٹ اتارنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ میرے دل سے اتر گئی ہیں۔ ماں کی محبت تو لافانی ہوتی ہے۔ ہے نا سجاد....؟"

وہ چونک کر بولا۔ "آں۔ ہاں۔ مگر مجھ سے یہ توقع نہ رکھنا۔ ماں کی یہ لافانی محبت ہمیشہ میری دھڑکنوں سے لگی رہے گی۔"

پھر وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ "دیر ہو رہی ہے۔ مجھے چلنا چاہئے۔"

وہ بریف کیس اٹھا کر کمرے سے جانے لگا۔ نبیلہ نے وہ لاکٹ اتروانے کے لئے زبردست حملہ کیا تھا۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اتنی آسانی سے وار خالی جائے گا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی پورچ میں آگئی۔ صدیقہ بھی معمول کے مطابق وہاں پہنچی ہوئی تھی۔ زیر لب کچھ پڑھ کر اس پر پھونکتے ہوئے بولی۔ "بیٹا! خود بھی سفر کی دعا پڑھتے ہو ناں؟"

وہ کار کا دروازہ کھول کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "بھلا آپ کا یاد کرایا ہوا سبق بھول سکتا

ہوں؟ مگر آپ کو اطمینان نہیں ہوتا۔ جب تک خود پڑھ کر دم نہیں کرتیں آپ کا دل نہیں مانتا۔"

پھر وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے کوٹھی سے باہر جانے لگا۔ نبیلہ ادھر دیکھ رہی تھی اور دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔ "پتہ نہیں۔ ساس صاحبہ ایسا کیا پڑھ پڑھ کر پھونکتی رہتی ہیں کہ میاں جی میرا سبق پڑھنا ہی نہیں چاہتے۔ یا خدایا! میں کیا کروں؟ کیسے ماں کا سحر توڑوں اور اپنا جادو چلاؤں؟"

چوکیدار گیٹ بند کر رہا تھا۔ صدیقہ نے مسکرا کر بہو کو دیکھا پھر قریب آتے ہوئے کہا۔ "وہ جا چکا ہے۔"

اس نے چونک کر اسے دیکھا پھر دونوں ہنستی بولتی ہوئی کوٹھی کے اندر چلی گئیں۔

ان کے درمیان کبھی خانہ جنگی کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ ساس بہو کے روایتی جھگڑے سے دور رہتی تھیں۔ ایک دوسرے سے ایسی محبت اور اپنائیت ظاہر کرتی تھیں کہ دوسرے کبھی ان کے اندر کے گرد و غبار کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔

ویسے بہو کی طرح ساس بھی اندر سے کچھ بے چین سی رہنے لگی تھی۔ بیٹا صرف کھانے پینے اور نماز پڑھنے کے وقت ساتھ رہتا تھا۔ باقی اس کا سارا وقت بیگم کے ساتھ گزرتا تھا۔ بیٹے کی محبت میں کمی تو نہیں آئی تھی لیکن پلڑا اُدھر جھکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

پہلے وہ ماں کے ساتھ کہیں جایا کرتا تھا' اب بیوی کے ساتھ آؤٹنگ کے لئے جانے لگا تھا۔ بیگم نے پہلی بار اسے شوخ رنگ کی ایک شرٹ پہنائی تو اس نے پہن لی۔ یوں ماں کو لگا کہ خربوزہ رنگ پکڑ رہا ہے۔ ایسی ہی چھوٹی چھوٹی کئی باتیں تھیں' جو اس کے نوٹس میں آتی تھیں' تو سر دکھنے لگتا تھا۔

وقار کے گلے میں صدیقہ کا لاکٹ جھولتا رہتا تھا۔ ایسی والہانہ محبت اور لگاوٹ دیکھ دیکھ کر نبیلہ کے اندر یہ بات مستحکم ہوتی جا رہی تھی کہ ساسو ماں ضرور کوئی جادو ٹونا جانتی ہیں۔ دونوں بیٹوں کے گلے میں لاکٹ کی لگام ڈال رکھی ہے۔ وہ سگا نہ ہوتے ہوئے بھی اُس ماں کا ایسا دم بھرتا ہے' جیسے اسی کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔

کوٹھی میں عقیدت مند خواتین وقتاً فوقتاً آتی جاتی رہتی تھیں۔ نبیلہ کے اندر یہ بات پکنے لگی تھی کہ صدیقہ روحانی عملیات جانتی ہے' دینی درس و تدریس کا تو بہانہ ہے۔

در پردہ بڑی بی تعویز گنڈے کرتی ہیں۔ تب ہی درجنوں خواتین کی آمد و رفت کا سلسلہ رہا کرتا ہے۔

ایک روز یاسر کی گرل فرینڈ نے فون پر پوچھا۔ "اور سناؤ نبیلہ! ازدواجی زندگی کیسی جا رہی ہے؟"

"بہت اچھی جا رہی ہے۔ سجاد تو میرے دیوانے ہیں۔ بس ہر وقت میرا ہی دم بھرتے رہتے ہیں۔"

اس نے تعجب سے کہا۔ "اچھا..؟ اس کا مطلب ہے' ماں کا میاں مٹھو بیوی کی بولی بولنے لگا ہے؟"

وہ چہک کر بولی۔ "جی جناب! میری بولی ایسی دلکش ہے کہ وہ پچھلی تمام بولیاں بھول گئے ہیں۔ ویسے بھی بچے نیا سبق پڑھتے پڑھتے پرانا سبق بھول جایا کرتے ہیں۔"

وہ بولی۔ "پھر تو وہ پرانی نیم پلیٹ سینے سے اتر گئی ہوگی؟"

اس نے بے اختیار کہا۔ "ہاں۔ میں نے تو صرف سجاد کو متاثر کرنے کے لئے وہ لاکٹ بنوایا تھا۔ تم تو جانتی ہی....."

وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ "میں تمہارے نہیں... سجاد کے لاکٹ کی بات کر رہی ہوں۔ تمہاری باتوں سے اندازہ ہو رہا ہے' یقیناً ماں کی جگہ تم نے لے لی ہوگی؟"

اس کی بات سنتے ہی دل ڈوبنے لگا۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "وہ لاکٹ تو وہیں ہے۔ سجاد کہتے ہیں' میں ان کے دل میں رہتی ہوں' ماں کو سینے پر رہنے دو۔"

وہ بولی۔ "یعنی بیٹے کی دھڑکنوں پر اب تک ماں کا راج ہے؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بولی۔ "ایک بات کہوں نبیلہ! شوہر کا دل بیوی کا گھر ہوتا ہے اور کوئی گھر اس وقت تک اپنا نہیں ہوتا' جب تک وہاں ہمارے نام کی تختی نہ لگ جائے۔ برا نہ ماننا لیکن یہ سن کر عجیب سا لگا ہے' سجاد کے دل میں تم رہتی ہو اور باہر نیم پلیٹ ماں کی لگی ہوئی ہے۔"

وہ کسی پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ ساس کی تصویر سے جلتی کڑھتی رہتی ہے۔ یہ جتانا بھی ضروری تھا کہ شوہر اس سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس نے بات بناتے ہوئے

کہا۔ ''اب کیا کیا جائے؟ وہ بھی مجبور ہیں۔ ماں کا دل نہیں توڑنا چاہتے۔ ورنہ بیڈروم میں تو میری ہی بڑی سی تصویر لگا رکھی ہے۔''

وہ ذرا طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''یعنی ماں دل کے اندر ہے اور تم صرف بیڈروم میں ہو؟''

یہ طنزیہ بات پتھر کی طرح لگی۔ اس نے کسی طرح باتیں بنا کر فون بند کر دیا۔ اس رات وہ میاں کے پہلو میں رہ کر بھی دیر تک تنہا تنہا سی رہی۔ اس نے پیار سے اسے اپنی طرف کھینچا تو وہ بڑی بے دلی سے اس پر آ گری۔ گرتے ہی سینے پر سانس چبھنے لگی۔ وہ فوراً ہی الگ ہو کر ناگواری سے سوچنے لگی۔ ''یہ تو ناگن کی طرح کنڈلی مارے بیٹھی رہتی ہے۔ کب تک مجھے ڈستی رہے گی؟ اس کا سر کچلنا ہی ہوگا۔''

سجاد نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

اس نے ایک نظر لاکٹ پر ڈالی پھر میٹھی ناراضی سے کہا۔ ''تمہیں میرے جذبات کا احساس نہیں ہے۔''

وہ اسے پھر اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا۔ ''احساس ہے، تب ہی تو پاس بلا رہا ہوں۔''

وہ ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی۔ ''کیسے آؤں، جب کوئی تیسری ہستی ہمارے درمیان رہتی ہے؟''

اس نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا کہہ رہی ہو؟''

وہ بولی۔ ''تو اور کیا۔ میں جب بھی قریب آتی ہوں، تمہاری ماں درمیان میں آ جاتی ہیں۔ محبت سے سینے پر سر رکھتی ہوں تو یہ لاکٹ دیوار بن جاتا ہے۔''

''میری جان! یہ محض تمہارے احساسات ہیں۔ ورنہ ماں تمہیں میرے پاس آنے سے نہیں روکتیں۔ تم خود رک جاتی ہو اور الزام انہیں دیتی ہو۔''

''احساسات اور جذبات کی بنیاد پر ہی محبت ہوتی ہے۔ تم مرد کے جذبات کو اور اس کی فطرت کو سمجھتے ہو۔ اگر ایسے جذباتی لمحات میں اپنا ننھا سا بچہ دودھ کے لئے رونے لگے تو مرد جھنجھلا جاتا ہے۔ کہتا ہے، بچے کو افیون دے کر سلا دیا کرو۔ یعنی وہ یہ برداشت نہیں کرتا کہ اپنا بچہ بھی ایسے لمحات میں دیوار بنے۔ پھر میں کیسے برداشت کروں؟ کیا میں انسان نہیں ہوں؟ کیا میرے سینے میں دل نہیں ہے؟ کیا میں احساسات اور جذبات سے خالی ہوں؟''

''یہ بیوی کی نہیں۔ بہو کی زبان بول رہی ہے۔''

وہ اس سے دور ہو کر پیروں کی طرف آ کر کہنے لگی۔ ''اس وقت مجھے نہ بیوی کہو، نہ بہو... میں صرف ایک عورت ہوں۔ عورت کی فطرت کو سمجھو سجاد! یہ سب کچھ برداشت کر سکتی ہے مگر اپنے اور شوہر کے درمیان کسی کا سایہ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔''

وہ سر اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میرے پاس آؤ....''

وہ منہ پھیر کر بولی۔ ''نہیں آؤں گی۔''

ایسا کہتے وقت وہ اس کے پیروں کو یوں چھو رہی تھی، جیسے بے خیالی میں سہلا رہی ہو۔ اس کی ناراضی اور محبت کا امتزاج ایسا تھا کہ وہ اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ لیٹے لیٹے اٹھ کر اس کی جانب جھکتا چلا گیا۔ اس کی کلائی پکڑ کر بولا۔ ''آؤ ناں....''

وہ اپنی اداؤں سے انکار کرنے لگی۔ اپنی کلائی یوں نزاکت سے چھڑانے لگی جیسے سمجھا رہی ہو.. ذرا جم کے تو پکڑو... جب کوئی چیز ملتے ملتے نہ ملے تو اس کی طلب بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ وہ بڑی عاجزی سے اسے مناتے ہوئے بولا۔ ''آ بھی جاؤ نا۔ کیوں تڑپا رہی ہو؟''

وہ ایک جھٹکے سے کلائی چھڑاتے ہوئے بولی۔ ''سینے سے لگا کر نشتر چبھوتے ہو۔ میری تکلیف کا ایک ذرا احساس نہیں کرتے۔ اس سے تو اچھا ہے، مجھے مار ہی ڈالو۔''

وہ اور ذرا دور ہو کر بیڈ کے سرے پر چلی آئی۔ ایسے ہی وقت سمجھ میں آتا ہے کہ دیوانے کچے دھاگے سے کس طرح بندھے چلے آتے ہیں؟ وہ کھسکتا ہوا قریب آیا تو وہ بڑی ادا سے لچکتی ہوئی سرہانے چلی گئی۔ وہ تڑپ کر بولا۔ ''سمجھا کرو جان! یہ لاکٹ دن رات میرے سینے سے لگا رہتا ہے۔ میں اسے الگ کیسے کروں؟''

''کیا جب سے پہنا ہے، کبھی اسے نہیں اتارا؟''

''صرف نماز کے وقت اتارتا ہوں۔ ماں کہتی ہیں، عبادت کے وقت خدا اور بندے کے درمیان کسی تیسری ہستی کو نہیں رہنا چاہئے۔''

''یہی تو میں کہتی ہوں۔ میرے اور تمہارے درمیان کوئی تیسری ہستی نہ رہے۔ اسے بیڈ پر آ کر تو الگ کر سکتے ہو؟''

''یعنی رات بھر ماں سے دور رہوں؟''

"عبادت تمہیں ماں سے دور کرتی ہے تو یہ قیامت بھی دور کرے گی۔ سوچ لو... میں قیامت تک ہاتھ نہیں آؤں گی۔"

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ پھر بولا۔ "ماں کو معلوم ہوگا تو انہیں کتنا دکھ پہنچے گا؟"

وہ بڑی حد تک قائل ہو رہا تھا۔ نبیلہ نے کہا۔ "بند کمرے میں ماں کو کیسے معلوم ہوگا؟ کیا وہ جھانک کر دیکھتی رہتی ہیں؟ کیوں بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو؟"

وہ بڑی مشکل میں پڑ گیا تھا۔ اسے ایسے تک رہا تھا، جیسے پیاسا لبِ دریا بیٹھا ہوا۔ آخر اس نے بڑے بے بسی سے لاکٹ کو اتارتے ہوئے کہا۔ "اچھی بات ہے۔ لیکن فجر کی نماز پڑھتے ہی اسے پہن لوں گا۔"

نبیلہ کے تو من کی مراد پوری ہو رہی تھی۔ وہ لاکٹ جو پتھر کی لکیر بن گیا تھا۔ وہ لکیر اب ہر رات مٹنے والی تھی۔ بات تو رات کی ہی ہوتی ہے۔ جو رات کو جیت لے وہ دنوں کا پھونک میں اڑا دیتی ہے۔ وہ خوشی سے نہال ہو کر بولی۔ "فکر نہ کرو۔ تمہیں یاد نہیں رہے گا تو میں ہر صبح اپنے ہاتھوں سے پہنا دیا کروں گی۔"

اس نے وہ چین لاکٹ لے کر سرہانے والی میز کی دراز میں ایسے رکھ دیا، جیسے ساس کو دفن کر رہی ہو۔

☆☆☆

چند ماہ بعد ہی دونوں طرف سے یہ نوید سننے کو ملی کہ بہوئیں گھر کے آنگن میں پھول کھلانے والی ہیں۔ صدیقہ تو دادی بننے کے تصور سے ہی نہال ہوئی جا رہی تھی۔ بہوؤں کے لئے ہدایت نامہ زچہ و بچہ بن گئی۔ انہیں طرح طرح کی نصیحتیں کرنے لگی۔ اس کا ایک قدم وقار کے گھر میں ہوتا تھا تو دوسرا اپنے گھر میں... اس کی ہدایات کے مطابق دونوں گھروں میں دیسی گھی کے پکوان تیار کئے جانے لگے۔ ہوٹلنگ اور فاسٹ فوڈ پر سخت پابندی لگا دی گئی۔

وقار اکثر آفس جاتے ہوئے ندا کو ماں کے پاس چھوڑ جاتا تھا اور شام کو لینے آ جاتا تھا۔ اس روز بھی ندا وہاں آئی ہوئی تھی۔ صدیقہ بہوؤں کے لئے مختلف میوؤں کا حلوہ تیار کر کے لائی تو سجاد نے کہا۔ "ایسی خوراک تو انہیں پہلوان بنا دے گی۔ آپ بہوؤں

کو پہلوان بنا رہی ہیں تاکہ یہ ہم پر حاوی رہیں۔"

نبیلہ نے ایک ذرا فاتحانہ انداز میں اس کے لاکٹ کو دیکھا۔ پھر سجاد کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرانے لگی۔ وہ نظریں چرا کر ماں کو دیکھنے لگا۔ صدیقہ نے کہا۔ "نبیلہ تو بالکل ہی چھوئی موئی ہے۔ بلڈ ٹیسٹ کے لئے ایک ذرا سا خون نکالا تھا تو اسے چکر آنے لگے تھے۔ دو دن تک بستر سے لگی رہی تھی۔ آج کل کی لڑکیاں اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتیں؟ ایسی خوراک ہی انہیں ذرا توانائی دے گی۔ ماں صحت مند رہے گی تو بچہ بھی صحت مند ہوگا۔"

نبیلہ نے اپنی پلیٹ میں حلوہ نکالا تو سجاد بھی کھانے لگا۔ صدیقہ اس کے ہاتھ سے چمچ لیتے ہوئے بولی۔ "یہ صرف زچہ کے لئے ہوتا ہے۔ ندیدے نہ بنو...؟"

رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ صدیقہ نے کہا۔ "یہ وقار کہاں رہ گیا؟ سات بجے تک آ جاتا ہے۔"

ندا نے کہا۔ "آج ان کی میٹنگ ہے۔ کہہ کر گئے تھے، دیر ہو جائے گی۔"

رات کے نو بجے وہ گھر پہنچا تو بجھا بجھا سا تھا۔ صدیقہ نے پوچھا۔ "کیا بات ہے۔ تمہارا چہرہ کیوں اترا ہوا ہے؟"

اس نے ماں کو دیکھا۔ پھر سر جھکا کر مایوسی سے کہا۔ "میرا ٹرانسفر ہو رہا ہے۔"

اس کی بات سن کر سب ہی چونک گئے۔ وہ ایکدم سے تڑپ کر بولی۔ "یہ اچانک ٹرانسفر کیوں ہو رہا ہے؟"

"اچانک نہیں... ایک مہینے پہلے لیٹر آیا تھا۔ میری کوشش تھی کہ ٹرانسفر رک جائے مگر آج کی میٹنگ میں یہ معاملہ ڈن ہو گیا ہے۔"

صدیقہ نے پوچھا۔ "کیا بہو بھی جائے گی؟"

سجاد نے مسکرا کر کہا۔ "ظاہر ہے۔ وجود کے ساتھ پرچھائیں تو لازمی رہے گی۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "اس کی حالت دیکھو۔ پردیس کا معاملہ ہے۔ وہاں اس کی دیکھ بھال کرنے والا کون ہوگا؟"

نبیلہ نے کہا۔ "بزرگوں سے دور رہ کر زندگی کے معاملات سے نمٹنا آ ہی جاتا ہے۔ کیوں ندا! تم پریشان ہو؟ کیا جانا نہیں چاہو گی؟"

وہ بولی۔ ''وقار کے بغیر یہاں رہنا مشکل ہو گا۔ یہ جنگل میں رہنے کو کہیں گے تو وہاں بھی رہ لوں گی۔''

ایک ماہ بعد وہ لندن کے لئے روانہ ہونے لگے تو صدیقہ رو رہی تھی۔ اگرچہ سگا بیٹا ہمیشہ ساتھ رہنے والا تھا۔ اس کے باوجود منہ بولے بیٹے کی جدائی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

وقار نے بڑے جذبے سے کہا۔ ''آیا تھا تو بالکل خالی تھا۔ اب سینے میں ایمان کی روشنی اور ممتا کا خزانہ سمیٹ کر لے جا رہا ہوں۔ میں دور جا کر بھی آپ سے دور نہیں رہوں گا۔ جب جب سجدہ کروں گا' خدا کے بعد آپ ہی کو یاد کرتا رہوں گا۔''

فلائٹ کی روانگی سے پہلے وہ بار بار ماں کے لاکٹ کو چھو رہا تھا۔ کبھی اسے کھول کر دیکھنے لگتا تھا۔ ندا نے مسکرا کر اپنی ساس سے کہا۔ ''یہ تو صبح و شام مجھے آپ کی تصویر دکھاتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں' الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ میں بیٹی کی خبر ملی ہے۔ اس کی صورت میری ماں جیسی ہونی چاہئے۔''

صدیقہ نے خوش ہو کر کہا۔ ''ادھر سجاد بھی یہی کر رہا ہے۔ تمہاری تو بیٹی ہونے والی ہے۔ نبیلہ کے بیٹا ہونے والا ہے تب بھی اسے میری تصویر دکھا کر کہتا ہے' بیٹے کی صورت ایسی ہونی چاہئے۔ نبیلہ سے پوچھو' یہ جب تک جاگتی رہتی ہے' اسے میری تصویر دکھاتا رہتا ہے۔''

نبیلہ تائید میں سر ہلانے لگی۔ ساس کی خوش فہمی پر دل ہی دل میں مسکرانے لگی۔ جس طرح قبر کا حال مردہ جانتا ہے' اسی طرح بند کمرے کا حال وہ جانتی تھی۔

فلائٹ کی روانگی کا اعلان ہو رہا تھا۔ وقار نے رخصت ہونے سے پہلے ماں کی پیشانی کو چومتے ہوئے کہا۔ ''ایک برس کے اندر ہی آپ کی بہو اور پوتی کو لے کر ضرور آؤں گا۔ خدا حافظ....''

ایک بیٹا اور بہو رخصت ہو گئے۔ وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا چلا گیا۔ ایک صبح وقار نے پوتی کی خوش خبری سناتے ہوئے کہا۔ ''یہاں ہوسپٹل میں ایک مولانا ہیں۔ وہ بچی کے کانوں میں اذان دینا چاہتے تھے مگر میں نے انکار کر دیا۔ آپ بابا کو فون پر بلائیں۔ میں اپنا فون بچی کے کان سے لگاتا ہوں۔ وہ اپنے دادا کی اذان سنے گی۔''

سجاد نے فون کو ہاتھ میں لیا۔ امجد دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر اذان دینے

لگا۔ پاکستان میں ابھرنے والی ''اللہ اکبر۔ اللہ اکبر'' کی صدائیں سات سمندر پار اس بچی کے کانوں تک پہنچنے لگیں۔

صدیقہ پوتی کی آواز سننے اور صورت دیکھنے کے لئے بے چین تھی۔ وقار نے اسے بچی کی آواز سنا کر کہا۔ ''میں موبائل کیمرے سے تصویر اتار کر سجاد کے فون پر سینڈ کر رہا ہوں۔ آپ اپنی پوتی کو دیکھ لیں۔''

تھوڑی دیر بعد ہی سجاد کے فون پر بچی کی تصویر آ گئی۔ صدیقہ اسے چوم کر اس کی بلائیں لینے لگی۔ اسی رات تقریباً ایک بجے نبیلہ کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔

ایک طرف پوتی تھی۔ دوسری طرف پوتا آ گیا۔ صدیقہ کی تو خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ ایک بچے کے آ جانے سے پوری کوٹھی میں رونق آ گئی تھی۔ پوتے کا نام عاصم رکھا گیا۔

ایک روز نبیلہ کی ماں نے بیٹی سے فون پر کہا۔ ''روایتی ماں بن کر نہ رہو۔ میاں پر بھی کڑی نظر رکھا کرو۔ صرف بیٹے کو گود میں لئے پھرتی رہو گی تو وہ میاں صاحب اپنی ماں کی گود میں چلے جائیں گے۔''

نبیلہ نے مسکرا کر اپنے کمرے کی طرف دیکھا پھر فون پر کہا۔ ''فکر نہ کریں امی! میں نے مسافر کو راستہ بھولنا سکھا دیا ہے اور جو سبق میں بھلا دیتی ہوں وہ پھر اسے یاد نہیں کر پاتے۔ ابھی تو بے چارے اپنے کپڑے پریس کر رہے ہیں۔ ملازمہ نے چھٹی کی ہے۔''

''وہ کیوں پریس کر رہا ہے؟ یہ کام تمہیں کرنا چاہئے تھا۔ یہ غلط بات ہے۔ سجاد کے کسی معاملے میں تمہیں پیچھے نہیں رہنا چاہئے۔ ایسے میں ساس کو آگ لگانے کا موقع ملتا ہے۔''

''میں کیا کروں؟ وہ مجھے کوئی کام کرنے ہی نہیں دیتے۔ کہتے ہیں' سارا دن بچے میں مصروف رہتی ہو' تھک جاتی ہو۔ چھوٹے موٹے کام میں خود کر لوں گا۔ اس سے اندازہ کریں' میرا جادو کیسے سر چڑھ کر بول رہا ہے؟''

''پھر بھی احتیاط کیا کرو۔ میں فون بند کر رہی ہوں۔ جب تک میاں گھر میں رہے' اس کے آس پاس ہی رہا کرو۔''

ماں نے رابطہ ختم کر دیا۔ وہ ریسیور رکھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ چار ماہ کا عاصم بیڈ پر گہری نیند میں تھا۔ وہ سجاد کو دیکھ کر بولی۔ ''یا خدا! ابھی تک شرٹ ہی پریس ہو رہی ہے؟

آدھے گھنٹے پہلے شروع کی تھی۔"

"جب تک کپڑے کی ایک ایک شکن دور نہیں ہوتی۔ میرا دل مطمئن نہیں ہوتا۔"

وہ پیچھے سے آکر اس سے لپٹتے ہوئے بولی۔ "لاؤ... میں پریس کردوں۔"

وہ شوخی سے بولا۔ "کیسے...؟"

ایسے ہی وقت کمرے کا دروازہ کھلا۔ نبیلہ فوراً ہی اس سے الگ ہوگئی۔ صدیقہ ہاتھ میں اخبار لئے اندر آتے ہوئے بولی۔ "پرائز بانڈ کی لسٹ آگئی ہے۔ نبیلہ! تمہارے بانڈز کہاں ہیں؟ آؤ۔ نمبر چیک کرو۔ میں بھی کررہی ہوں۔"

وہ ایک صوفے پر بیٹھ کر نمبر ڈھونڈنے لگی۔ نبیلہ بھی الماری سے بانڈز نکال کر اس کے پاس آگئی۔ لسٹ کو غور سے دیکھنے لگی۔ سجاد نے کہا۔ "تم بھی ماں کی طرح گھر بیٹھے دولت کمانا چاہتی ہو۔ مگر اب تک تمہارے نام کوئی بہت بڑا انعام نہیں نکلا۔"

نبیلہ نے کہا۔ "ہاں یہ تو ہے۔ مگر بانڈز کا بڑا فائدہ ہے۔ چھوٹی بڑی رقم ملتی ہی رہتی ہے۔ نہ ملے تب بھی ضرورت کے وقت اسے فوراً ہی کیش کرایا جاسکتا ہے۔"

صدیقہ نے کہا۔ "دو برس پہلے پندرہ لاکھ روپے ملے تھے۔ میں نے فوراً ہی سجاد کے نام فکس ڈیپازٹ کردیئے تھے۔"

وہ بولی۔ "اب تو میں بھی اپنے بیٹے عاصم کے نام سے بینک بیلنس بڑھاتی رہوں گی۔"

وہ دونوں لسٹ پر جھکی ہوئی تھیں۔ باتوں کے دوران اپنے اپنے بانڈز کے نمبر بھی چیک کرتی جارہی تھیں۔ ایسے ہی وقت نبیلہ نے خوشی سے چیخ کر کہا۔ "سجاد! دس لاکھ روپے..... او مائی گاڈ! ہمارا نمبر لگ گیا..."

سجاد نے چونک کر اسے دیکھا۔ صدیقہ نے بے یقینی سے کہا۔ "کیا واقعی...؟ ذرا دکھاؤ تو...."

وہ لسٹ اور بانڈ ساس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولی۔ "یہ دیکھیں.... یہی نمبر ہے۔ دس لاکھ کا پرائز نکلا ہے۔ مائی گڈنس۔ میرا بیٹا بہت لکی ہے۔ اس کا نام لیتے ہی مقدر جگمگانے لگا ہے۔"

ادھر وہ چیخی تھی۔ ادھر عاصم چونک کر اٹھ گیا تھا۔ کروٹ بدل کر رونے لگا۔ سجاد نے پریس کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارا بیٹا بھی خوب ہے۔ ہنسنے کے وقت رو رہا ہے۔ اسے دیکھو! کیا پریشانی ہے؟"

صدیقہ اپنی لسٹ پر جھکی ہوئی تھی۔ نبیلہ بانڈ کا نمبر نوٹ کرتے ہوئے بولی۔ "آئی بیٹے!.... آئی۔ بس آرہی ہوں...."

عاصم ایک اور کروٹ بدل کر بستر کے سرے پر پہنچ گیا۔ صدیقہ نے ذرا سر اٹھا کر پوتے کو دیکھا تو چیخ کر بہو سے کہا۔ "ارے نبیلہ! ادھر دیکھو...! عاصم گرنے والا ہے۔"

پھر وہ خود ہی پوتے کو سنبھالنے کے لئے اٹھنے لگی۔ ایسے ہی وقت سجاد کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ بے خیالی میں اس کا ہاتھ استری کے ننگے تار پر چلا گیا تھا۔ صدیقہ اور نبیلہ دونوں ہی بدحواس ہوگئیں۔ کیا کریں' کیا نہ کریں؟

کون کدھر جائے؟ بیوی اپنے بچے کو سنبھالے یا شوہر کی خبر لے؟

ماں اپنے بیٹے کی مصیبت کو دیکھے یا پوتے کو گرنے سے بچائے؟

آزمائش کی گھڑیوں میں انسانی جذبہ پکارتا ہے یا لہو کے رشتے....؟

لہو پکارتا ہے لہو.... ماؤں کو دردزہ نے پکارا... دودھ کی نہر منہ زور ہوئی... نبیلہ ایکدم سے اچھل کر عاصم کے پاس پہنچی۔ وہ بیڈ کے بالکل سرے پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے گرنے سے پہلے ہی اسے تھام لیا۔

صدیقہ دوڑتی ہوئی بیٹے کے پاس پہنچی۔ سجاد کو بجلی کے جھٹکے لگ رہے تھے۔ ممتا سے بڑی کوئی طاقت نہیں ہوتی۔ یہ حادثات کا رُخ بدل دیتی ہے۔ اس نے وہاں پہنچتے ہی سوئچ کو آف کردیا۔

سجاد نڈھال سا ہو کر فرش پر گرنے کے انداز میں بیٹھنے لگا۔ صدیقہ اسے سنبھالتے ہوئے' اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولی۔ "ٹھیک تو ہو میری جان....! تمہیں سمجھایا تھا' استری کے ٹوٹے ہوئے تار کو جوڑا گیا ہے۔ ادھر ہاتھ نہ لے جانا۔ مگر بیٹا رونے لگا تو تم اپنے آپ کو ہی بھول گئے۔"

وہ اپنے ہاتھ کو سہلاتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کی چیخ سن کر پریشان ہوگیا تھا۔"

"ہائے۔ میں صدقے! میں قربان... کیا ماں کے لئے جان دے دو گے؟"

نبیلہ عاصم کو سینے سے لگائے فرطِ جذبات سے چوم رہی تھی۔ اسے اپنے دھڑکتے ہوئے دل سے لگائے ہوئے تھی۔ ان لمحات میں وہ ساری دنیا کو بھول گئی تھی۔ پھر اس نے چونک کر سجاد کی طرف دیکھا۔ وہاں سے چلتی ہوئی ان کے پاس آ گئی۔ میاں کے قریب ہی فرش پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "سوری..... میں تمہارے پاس نہ آسکی۔"

وہ بیٹے کو گود میں لے کر چومتے ہوئے بولا۔ "تم شرمندہ کیوں ہو رہی ہو؟ میں تو خوش ہوں۔ تم نے میرے بیٹے کو بچایا ہے۔"

صدیقہ نے کہا۔ "یہی ہوتا ہے۔ ہر ماں اپنے ہی لہو کی طرف دوڑتی ہے۔"

وہ بولا۔ "ماں! ذرا سوچیں... یہ عین وقت پر عاصم کے پاس نہ پہنچتی تو کیا ہوتا؟"

صدیقہ نے بڑے دکھ سے بیٹے کو دیکھا۔ پھر دل ہی دل میں کہا۔ "اور میں تمہارے پاس نہ پہنچتی تو کیا ہوتا؟ بیوی کا دم بھر رہے ہو۔ بے شک۔ اس نے جو کیا... اچھا کیا۔ میں بھی تو داد کی مستحق ہوں۔"

وہ اٹھ کر وہاں سے جانا چاہتی تھی۔ ایسے ہی وقت چونک گئی۔ پریشان ہو کر بولی۔ "سجاد...! تمہارا لاکٹ کہاں ہے؟"

وہ فوراً ہی سر جھکا کر اپنے سینے کی طرف دیکھنے لگا۔ دونوں ہاتھوں سے گردن کو ٹٹولا تو صرف چین ہاتھ میں آئی۔ وہ سب ادھر ادھر لاکٹ کو تلاش کرنے لگے۔ سجاد استری اسٹینڈ کے نیچے ہاتھ لے جا کر ڈھونڈ رہا تھا۔ پھر چہک کر بولا۔ "مل گیا....."

بیٹے کی بات سن کر ماں کی دھڑکنوں کو آرام آیا۔ وہ لاکٹ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "اس کا ہک ٹوٹ گیا ہے۔ پہن نہیں سکوں گا۔"

صدیقہ نے کہا۔ "لاؤ میں سنار سے بنوا کر لے آؤں گی۔"

سجاد نے سر گھما کر بیوی کو دیکھا پھر لاکٹ کو مٹھی میں جکڑ کر اٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ پتہ نہیں کب جائیں گی؟ میں ابھی بنوا کر لے آتا ہوں۔"

وہ پلٹ کر جانے لگا۔ صدیقہ نے اس کے پیچھے آتے ہوئے کہا۔ "میں کہہ رہی تھی، شام تک..."

وہ دروازے پر رک کر بولا۔ "اور میں کہہ رہا ہوں، اسے زیادہ دیر تک اپنے دل سے دور نہیں رکھوں گا۔ بس ابھی گیا اور ابھی آیا..."

نبیلہ زیرِ لب مسکرا کر اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ لاکٹ کو چومتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ ممتا کے سینے سے بیٹے کے لئے دعائیں نکل رہی تھیں۔ وہ پلٹ کر بہو کے پاس آ گئی۔ پوتے کو گود میں لے کر پیار کرتے ہوئے بولی۔ "پتہ نہیں، کون سی نیکی آڑے آئی ہے؟ بیٹا بھی بال بال بچا ہے اور پوتا بھی...."

بہو نے کہا۔ "ساری مصیبت لاکٹ پر ٹل گئی۔ میں دس نفل شکرانے کے ادا کروں گی۔"

ساس نے تیور بدل کر پوچھا۔ "کیا لاکٹ ٹوٹنے کے نفل ادا کرو گی؟"

"میں کہہ رہی ہوں، سجاد اور بچے کو جو نقصان پہنچنا تھا، وہ نقصان لاکٹ کو پہنچا ہے۔ اس طرح بلا ٹل گئی ہے۔ میں کہتی کچھ ہوں، آپ سمجھتی کچھ ہیں۔"

"سوری۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں صدقہ خیرات دیتی رہتی ہوں.. اسی لئے یہ مصیبت آتے آتے ٹل گئی۔ آج ہی بکرے منگوا کر دونوں کے نام کا صدقہ دوں گی۔"

ایسے ہی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ پوتے کو اس کے حوالے کر کے ڈرائنگ روم میں آئی۔ ریسیور اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے بولی۔ "ہیلو...؟"

دوسری طرف سے امجد کی آواز سنائی دی۔ "سجاد کہاں ہے؟ ابھی تک آفس کیوں نہیں پہنچا؟"

وہ اسے تمام صورتحال بتانے لگی۔ وہ پریشان ہو کر بولا۔ "یا خدا! یہ ہم پر کیسی مصیبت آنے والی تھی؟ فوراً بیٹے اور پوتے کا صدقہ اتارو۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔"

فون کا رابطہ ختم ہو گیا۔ سجاد لاکٹ بنوا کر آیا تو اسے فوراً ہی بکرا منڈی روانہ کر دیا گیا۔ پھر شام تک بکروں کا انتظار ہونے لگا۔ ایک دو بار اس کے فون پر رابطہ کیا گیا تو یہی پتہ چلتا رہا کہ منڈی میں ہے۔ کالے رنگ کے بکرے ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ امجد نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے پال پوس کر لائے گا۔ اب تک اسے آ جانا چاہئے۔"

شام کے چار بجے وہ گھر پہنچا تو تھکن سے برا حال تھا۔ چہرے پر دھول جمی ہوئی

تھی۔ وہ ایک صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ "مائی گاڈ! ان بکروں کے چکر میں میری حالت خراب ہوگئی ہے۔"

امجد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "منڈی میں ہزاروں بکرے ہوتے ہیں۔ لگتا ہے ایک ایک کو چیک کرتے رہے ہو؟"

"ماں نے کہا تھا' دونوں بکرے سر سے پاؤں تک کالے ہونے چاہئیں۔ ایک تو مل گیا تھا۔ دوسرا نہیں مل رہا تھا۔ تھک ہار کر منڈی سے نکلنے لگا تو دوسرا قسمت سے مل گیا۔"

صدیقہ نے پوچھا۔ "صحت مند ہیں نا...؟ ہڈیوں کے ڈھانچے تو نہیں لے آئے؟"

"دونوں تگڑے ہیں۔ ایک پانچ ہزار میں مل گیا۔ دوسرا آٹھ ہزار کا ہے۔"

وہ بولی۔ "میں آٹھ ہزار والے سے تمہارا صدقہ اتاروں گی۔"

نبیلہ نے جلدی سے کہا۔ "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ آپ کو مہنگا صدقہ پوتے کے نام سے کرنا چاہئے۔"

"عاصم ابھی چھوٹا ہے۔ اس کے لئے چھوٹا بکرا مناسب رہے گا۔"

نبیلہ نے سجاد کو دیکھا۔ وہ اس کی آنکھوں کی زبان سمجھنے لگا تھا۔ اس نے کہا۔ "ماں! ایک بار آپ نے کہا تھا' جب میں عاصم جتنا تھا۔ تب جانور سستے تھے ایک ہزار میں اچھا بکرا مل جاتا تھا۔ پھر بھی آپ نے دو ہزار کا مہنگا بکرا خرید کر صدقہ اتارا تھا۔ آج بھی مہنگی قربانی پوتے کے نام سے کردیں۔"

اس نے بہو کی گود میں پوتے کو دیکھا۔ پھر کہا۔ "یہ میرا پوتا ہے۔ میں کب انکار کرتی ہوں۔ کل منڈی جا کر آٹھ کا تو کیا' دس ہزار کا جانور لے آؤ۔"

نبیلہ شکایتی نظروں سے شوہر کو دیکھنے لگی۔ امجد ان میاں بیوی کی بے چینی کو سمجھ رہا تھا۔ نظروں کی چوری دیکھ رہا تھا اور زیر لب مسکرا رہا تھا۔ سجاد نے آخری حربہ آزمایا۔ وہ ماں کی کمزوری کو سمجھتا تھا فوراً ہی لاکٹ کو چومتے ہوئے بولا۔ "پلیز ماں...!"

امجد نے کہا۔ "اب تو یہ انکار کر ہی نہیں سکتیں۔"

اس نے بڑے پیار سے مسکرا کر بیٹے کو دیکھا پھر اس کے گال پر چپت مارتے ہوئے کہا۔ "چلو۔ فٹافٹ قصائی کو بلاؤ۔ مہنگا صدقہ پوتے کے نام سے ہی ہوگا۔"

نبیلہ نے خوش ہو کر بیٹے کو چوم لیا۔ صدیقہ سمجھ نہیں پائی کہ بہو کس طرح سبقت لے گئی ہے؟

☆☆☆

گھریلو ماحول بڑا خوشگوار تھا۔ امجد ٹی وی کے ایک پروگرام میں دلچسپی لے رہا تھا لیکن توجہ پوتے کی طرف تھی۔ وہ تین برس کا بچہ بار بار اپنی شرارتوں سے دادا جان کو متوجہ کر رہا تھا۔

ساس اور بہو بھی اچھے موڈ میں تھیں۔ اگرچہ کبھی کبھی ان کے درمیان ٹھن جاتی تھی۔ مگر معاملہ جلد ہی نمٹ جاتا تھا۔ چونکہ وہ مہذب اور تعلیم یافتہ تھیں۔ اس لئے زیادہ ٹوٹو میں میں نہیں ہوتی تھی۔ بعض اوقات وہ بچہ ان کے درمیان صلح کی جھنڈی بن جایا کرتا تھا۔ دو ماہ پہلے ہی لیڈی ڈاکٹر نے نبیلہ کا معائنہ کرکے یہ خوش خبری سنائی تھی کہ وہ پھر ماں بننے والی ہے۔ یہ ایسی خبر تھی کہ گھریلو ماحول کچھ زیادہ ہی بہتر ہوگیا تھا۔

صدیقہ نے پوتے کی شرارتوں سے محظوظ ہو کر اسے آغوش میں سمیٹ لیا۔ ایک انگلی سے اپنی آنکھ کا کاجل لے کر اس کے بالوں میں لگاتے ہوئے کہا۔ "آج ماشاءاللہ بہت کھلکھلا رہا ہے۔ نبیلہ! اس کی نظر اتار دینا۔"

وہ گود میں آ کر مچلنے لگا۔ فوراً ہی اتر کر پھر اپنی شرارتوں میں مگن ہوگیا۔ نبیلہ نے وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "پتہ نہیں کہاں رہ گئے ہیں؟ ایک کھلونا کار خریدنے میں اتنی دیر تو نہیں لگتی۔"

عاصم دوڑتا ہوا آکر کبھی دادی کو ہاتھ لگاتا تھا' کبھی پلٹ کر دادا کی طرف چلا جاتا تھا۔ صدیقہ ایک بار پھر اسے پکڑتے ہوئے بولی۔ "آج تمہارے پاپا بیٹری سے چلنے والی کار لائیں گے۔ تم تو بڑی شان سے چلاؤ گے۔"

نبیلہ نے کہا۔ "ابھی یہ اتنا بڑا نہیں ہوا ہے کہ کار چلا سکے۔ یہاں دیواروں سے اور فرنیچر سے ٹکراتا پھرے گا۔"

وہ پوتے کے چہرے کو چومتے ہوئے بولی۔ ’’ڈیکوریشن کی ساری چیزیں توڑتا رہے گا اور ہم اس کے پیچھے بھاگتے پھریں گے۔ ہے نا عاصم...!‘‘

وہ گاڑی کا سن کر خوش ہو گیا۔ دونوں ہاتھوں کو اسٹیرنگ کی طرح گھماتا ہوا ادھر سے ادھر دوڑنے لگا۔ امجد ٹی وی کی طرف متوجہ تھا۔ پروگرام کے دوران بریکنگ نیوز آرہی تھیں۔ طارق روڈ کی مارکیٹ میں بم دھماکا ہوا تھا۔ نبیلہ اور صدیقہ بھی چونک کر اُدھر دیکھنے لگیں۔ پریشانی یہ تھی کہ سجاد طارق روڈ کی طرف ہی گیا تھا۔

نیوز ریڈر کہہ رہی تھی۔ ’’طارق روڈ میں ٹوائے لینڈ کے سامنے زبردست بم دھماکا ہوا ہے۔ اطلاع کے مطابق دکانوں کے سامنے کھڑی ہوئی ایک کار میں بم رکھا گیا تھا۔ وہ کار کسی نامعلوم شخص کی تھی۔ اس کے آگے پیچھے کھڑی ہوئی متعدد گاڑیوں کو بھی نقصان پہنچا ہے۔‘‘

صدیقہ نے پریشان ہو کر کہا۔ ’’یا اللہ۔ میرا سجاد وہاں گیا ہوا ہے۔ اسے فون کریں۔ اس کی خیریت معلوم کریں۔ میرا تو دل ڈوب رہا ہے۔‘‘

امجد فوراً ہی بیٹے کے موبائل فون پر رابطہ کرنے لگا۔ ٹی وی اسکرین پر متاثرہ علاقہ دکھایا جارہا تھا۔ ایک افراتفری کا عالم تھا۔ تباہ شدہ گاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ نیوز ریڈر کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ’’تازہ ترین اطلاع کے مطابق دو افراد ہلاک اور چھ زخمی ہو چکے ہیں۔ زخمیوں کو فوری طور پر جناح ہوسپٹل پہنچایا جارہا ہے۔‘‘

ایسے ہی وقت نبیلہ اچھل کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ ٹی وی اسکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چیخ کر بولی۔ ’’بابا! سجاد.....وہ.....‘‘

بہو کی چیخ سن کر ان کا دل دھک سے رہ گیا۔ صدیقہ نے تڑپ کر پوچھا۔ ’’کیا ہوا؟ کیا سجاد نظر آیا ہے؟‘‘

وہ اسکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ’’نن...نہیں۔ وہاں ہماری کار تھی۔ مم.....میں نے اس کی نمبر پلیٹ پڑھی ہے۔ اسی کار میں سجاد یہاں سے گئے تھے.....‘‘

صدیقہ سینے پر ہاتھ مار کر روتے ہوئے بولی۔ ’’کیا کہہ رہی ہو؟ ہائے میرا بچہ.....‘‘

امجد اسے تسلی دیتا ہوا ٹی وی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ’’یہ تو دور سے گاڑیاں دکھا رہے ہیں۔ تم نے نمبر کیسے پڑھ لیا؟‘‘

اس کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ ’’کیمرہ جب گاڑی کے قریب تھا‘ تب میں نے نمبر پڑھے ہیں۔ پلیز بابا! کچھ کریں۔‘‘

وہ دونوں ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ وہ بار بار کوشش کر رہا تھا مگر بیٹے سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ دماغ میں خطرے کی گھنٹی بج رہی تھی۔ پھر بھی وہ خود کو پرسکون ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گھر میں ماتمی ماحول چھا گیا تھا۔ ماں اور دادی کی آہ و بکا دیکھ کر عاصم بھی رونے لگا تھا۔ کوٹھی کے تمام ملازمین لاؤنج میں دوڑے چلے آئے تھے۔ وہ سب ہی صورت حال کو سمجھنا چاہ رہے تھے۔

امجد نے جھنجلا کر فون کو دیکھا۔ پھر بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ’’زخمیوں کو جناح ہوسپٹل پہنچایا جارہا ہے۔ میں وہاں جا کر دیکھتا ہوں۔‘‘

صدیقہ پر سکتے کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ نبیلہ نے پریشان ہو کر سسر سے کہا۔ ’’بابا! امی کو دیکھیں کیا ہوا ہے؟ یہ کچھ بول نہیں رہی ہیں۔‘‘

وہ دروازے سے پلٹ کر بیگم کے پاس آ گیا۔ اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ ’’صدیقہ...! ہوش میں رہو۔ ہمارے بیٹے کو کچھ نہیں ہوگا۔ صدیقہ...!‘‘

وہ ہوش میں نہیں آرہی تھی۔ امجد نے مجبوراً ایک زور کا طمانچہ مارا تو وہ ایک گہری سانس لے کر سکتے سے نکل آئی۔ حلق پھاڑ کر چیختے ہوئے بولی۔ ’’میرا بچہ...‘‘

وہ وہاں سے جاتے ہوئے بولا۔ ’’میں ہوسپٹل جارہا ہوں۔ فون پر رابطہ رکھوں گا۔ نبیلہ! انہیں سنبھالو۔‘‘

وہ تڑپ کر اس کے پیچھے آتے ہوئے بولی۔ ’’تنہا کہاں جارہے ہیں؟ کیا مجھ سے گھر میں بیٹھا جائے گا؟ میں بھی چلوں گی۔‘‘

نبیلہ بھی اصرار کرنے لگی۔ امجد نے کہا۔ ’’تم دونوں میرے ساتھ کہاں ماری ماری پھرو گی؟ ہوسپٹل میں ایک ہجوم ہوگا۔ پھر عاصم کا بھی مسئلہ ہے۔‘‘

صدیقہ ضد پر اڑی ہوئی تھی۔ اسے سمجھانا مشکل تھا۔ نبیلہ سسر کو قائل کرتے ہوئے بولی۔ ’’عاصم ملازمہ کے ساتھ گاڑی میں رہے گا۔ پلیز بابا! ہم ساتھ جائیں گے۔‘‘

وہ بحث میں وقت برباد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ فوراً ہی ان کے ساتھ ہوسپٹل کی طرف

چل پڑا۔وہاں ایمرجنسی وارڈ کے اندر اور باہر افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ ایمبولینس پر ایمبولینس آرہی تھیں۔زخمیوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔خون میں لتھڑے ہوئے وجود دیکھ دیکھ کر دل ہول رہا تھا۔زخمیوں سے زیادہ ان کے لواحقین اور امدادی کارکنوں کا ہجوم تھا۔وہ تینوں بڑی مشکل سے جگہ بناتے ہوئے وارڈ کے اندر پہنچے۔

کتنے ہی ڈاکٹر ادھر سے ادھر بھاگ رہے تھے۔زخمیوں کو اٹینڈ کررہے تھے۔ہر طرف سے آہ وبکا سنائی دے رہی تھی۔کہیں مائیں بلک رہی تھیں، کہیں بہنیں اپنے بھائیوں کو رورہی تھیں۔ایسے ماحول میں ہیبت طاری ہونے لگی تھی۔امجد معلومات حاصل کرتا پھر رہا تھا۔نبیلہ اور صدیقہ بدحواس سی تھیں۔ایک ایک زخمی کے پاس جارہی تھیں۔خون آلود چہروں میں سجاد کا چہرہ ڈھونڈ رہی تھیں۔وہاں سب ہی اپنوں کی شناخت کررہے تھے۔

ایک طرف ایسے دو تین اسٹریچر بھی تھے۔جن پر زخمیوں کو لایا گیا تھا اور وہ وہاں پہنچتے پہنچتے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ چکے تھے۔انہیں سر سے پاؤں تک سفید چادروں میں چھپا دیا گیا تھا۔

ایسے ہی وقت صدیقہ کی چیخ سنائی دی۔نبیلہ نے تیزی سے پلٹ کر ادھر دیکھا۔وہ ایک اسٹریچر کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔لہو میں نہائے ہوئے زخمی کو ادھر ادھر سے چھو رہی تھی۔پھر اس سے لپٹ کر روتے ہوئے بولی۔"سجاد...! آنکھیں کھول میری جان...! اپنی ماں کو دیکھ....امجد! آپ کہاں ہیں؟ میرا سجاد مل گیا ہے۔ڈاکٹر کو بلائیں۔"

نبیلہ تیزی سے دوڑتی ہوئی اس کے پاس آگئی۔وہ سجاد ہی تھا۔لہو سے تربتر تھا۔بے ہوشی میں کراہ رہا تھا۔صدیقہ کی چیخ سن کر امجد دوڑتا ہوا وہاں آیا پھر فوراً ہی پلٹ کر ڈاکٹر کو بلانے چلا گیا۔

سجاد کی حالت دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا، جیسے اب تب میں زندگی سے اس کا ہاتھ چھوٹنے والا ہے۔نبیلہ بدحواس سی ہوکر وہاں سے گزرتے ہوئے ڈاکٹرز کو روکنے لگی۔شوہر کی جلد سے جلد ٹریٹمنٹ کے لئے التجائیں کرنے لگی۔وہاں سب ہی اپنے پیاروں کی جانیں بچانے کے لئے ڈاکٹروں سے التجائیں کررہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد امجد ایک ڈاکٹر کے ساتھ بیٹے کے پاس آیا۔صدیقہ نے تڑپ کر

پوچھا۔"ڈاکٹر! یہ بولتا کیوں نہیں ہے...؟ آنکھیں بھی نہیں کھول رہا ہے؟ اسے بچالیں۔ میری زندگی دے کر اسے بچالیں۔کچھ کریں۔جلدی کریں۔"

نبیلہ اور صدیقہ کا رو رو کر برا حال تھا۔ڈاکٹر نے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے ایک نرس سے کہا۔"انہیں یہاں سے ہٹائیں۔"

نرس انہیں ہٹانے لگی۔وہ جانا نہیں چاہتی تھیں۔امجد نے سمجھایا۔"بیٹے کی زندگی چاہتی ہو تو ڈاکٹر کو ڈسٹرب نہ کرو۔جاؤ۔ادھر بینچ پر جاکر بیٹھو۔"

وہ جبراً وہاں سے ذرا دور ایک بینچ پر آگئیں۔امجد نے پوچھا۔"ڈاکٹر! کیا بہت سیریس کنڈیشن ہے؟"

ڈاکٹر انجکشن لگاتے ہوئے بولا۔"ویری سیریس... میٹالک (Metalic) ذرّات جسم میں کے اندر کئی جگہ پیوست ہوگئے ہیں۔"

اس نے فوراً ہی دو وارڈ بوائز کو بلا کر کہا۔"اسے آپریشن تھیٹر پہنچاؤ۔ہری اَپ...."

انہوں نے فوراً ہی حکم کی تعمیل کی۔اسٹریچر ٹرالی کو دھکیلتے ہوئے آپریشن تھیٹر کی طرف چلے گئے۔امجد نے پوچھا۔"ہمارا بیٹا بچ جائے گا ناں...؟"

وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔"کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ہم دوا کررہے ہیں۔آپ دُعا کریں۔"

صدیقہ نے چیخ کر کہا۔"میرے بیٹے کو کچھ نہیں ہوگا۔اسے ماں کی دعائیں بچائیں گی۔میں سجدے میں گروں گی تو سر نہیں اٹھاؤں گی۔"

ڈاکٹر آپریشن تھیٹر میں چلا گیا تھا۔نرس نے امجد سے کہا۔"آپریشن کے دوران خون کی ضرورت پڑے گی۔آپ فوراً کسی بلڈ بنک سے رابطہ کریں۔وہ سامنے انکوائری کاؤنٹر ہے۔وہاں سے کسی بھی بلڈ بنک کا نمبر مل جائے گا۔"

صدیقہ نے کہا۔"سجاد کا بلڈ گروپ بی پازیٹو ہے۔نبیلہ! تمہارا بھی یہی گروپ ہے۔فوراً اسے خون دو۔"

امجد ان کے ساتھ انکوائری کاؤنٹر کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔"کیسی باتیں کرتی ہو؟ بہو امید سے ہے۔ایسی حالت میں یہ بلڈ کیسے دے سکتی ہے؟ ٹیسٹ کے لئے ایک ذرا

ساخون نکالا جاتا ہے تو اس کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔"

وہ تینوں کاؤنٹر پر آ گئے تھے۔ امجد نے کسی بھی بلڈ بنک کا نمبر طلب کیا تو کاؤنٹر مین نے کہا۔ "اس وقت صورتحال ایسی ہے کہ بنک والے صرف انہیں بلڈ فراہم کر رہے ہیں، جو اپنا خون دے کر دوسرے گروپ کا خون حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "میں خون نہیں دے سکتا۔ شوگر کا مریض ہوں۔"

صدیقہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا۔ "میرا گروپ بی نگیٹو ہے۔ ابھی میرا خون لیں۔ آخری قطرہ تک نچوڑ لیں۔ جتنی جلدی ہو سکے۔ میرے بیٹے کے لئے وہاں خون پہنچائیں۔"

وہ کاؤنٹر کے پیچھے سے نکلتے ہوئے بولا۔ "آپ میرے ساتھ آئیں۔"

امجد ایک بینچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "نبیلہ! تم وہاں بیٹھو۔ میں ان کے ساتھ جاتا ہوں۔"

وہ تینوں وہاں سے چلے گئے۔ وہ بینچ پر آ گئی۔ رو رو کر خدا سے التجائیں کرنے لگی۔ ایسے ہی وقت اس کی نظر استقبالیہ پر پڑی۔ اس کے والدین کاؤنٹر پر معلومات حاصل کر رہے تھے۔ وہ روتی ہوئی، تقریباً دوڑتی ہوئی ان کی طرف لپکی۔ ماں نے بیٹی کو دیکھتے ہی سینے سے لگا لیا۔ اسے تھپکتے ہوئے پوچھا۔ "سجاد کہاں ہے؟ وہ خیریت سے تو ہے ناں...؟"

وہ ہچکیوں کے درمیان انہیں تمام صورتحال بتاتے ہوئے بولی۔ "ان کے لئے بلڈ کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ ماں اپنا خون دیں گی تو بنک والے سجاد کو بلڈ فراہم کریں گے۔"

وہ پھر رونے لگی۔ وہ دونوں اسے تسلیاں دے رہے تھے۔ باپ نے کہا۔ "رونے سے کچھ نہیں ہوگا، اللہ کو یاد کرتی رہو۔ وہاں دوا ہو رہی ہے، یہاں دعا کرتی رہو۔ وہی بگڑی بنانے والا ہے۔"

ماں بیٹی دونوں ہی سر پر آنچل رکھ کر سجاد کے لئے دعائیں مانگنے لگیں۔ بارگاہِ الٰہی میں گڑگڑانے لگیں۔

ایک کمرے میں صدیقہ کا خون لیا جا رہا تھا۔ وہ بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند کئے دل ہی دل میں خدا کو یاد کر رہی تھی۔ امجد اس کے پاس تھا۔ کبھی بیٹھ رہا تھا، کبھی اٹھ کر

ٹہلنے لگتا تھا۔ بلڈ بنک والوں نے فوراً ہی خون کی بوتلیں مہیا کر دی تھیں۔ ڈاکٹر آپریشن میں مصروف تھے۔

صدیقہ نے آنکھیں کھول کر شوہر کو دیکھا۔ پھر کہا۔ "آپ یہاں نہ رہیں۔ وہاں بیٹے کے پاس جائیں۔ پل پل کی خبر لیتے رہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔"

وہ کمرے سے نکل کر آپریشن تھیٹر کی طرف جانے لگا تو نبیلہ اور اس کے والدین بھی ساتھ ہو گئے۔ سب ہی ایک دوسرے کو تسلیاں دے رہے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے تک آپریشن جاری رہا۔ ڈاکٹر اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ باہر آیا تو امجد نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔ "میرا سجاد کیسا ہے...؟"

ڈاکٹر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "خدا کا شکر ہے۔ پیشنٹ خطرے سے باہر ہے۔"

نبیلہ نے تڑپ کر پوچھا۔ "کیا ہم ان سے مل سکتے ہیں؟"

"ابھی نہیں۔ فی الحال اسے آئی۔ سی۔ یو میں رکھا جائے گا۔"

یہ خوشخبری سنتے ہی وہ سب تیزی سے چلتے ہوئے صدیقہ کے پاس آ گئے۔ امجد اس کے قریب بیڈ کے سرے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "مبارک ہو۔ آپریشن کامیاب رہا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے، ہمارا بیٹا خطرے سے باہر ہے۔"

شوہر نے اتنی بڑی خوشخبری سنائی تھی کہ وہ شدتِ جذبات سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ فوراً ہی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ سجدے میں گر کر اپنے معبود کا شکر ادا کرنے لگی۔ وہاں سبھی کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ نبیلہ ساس کے پاس رہنا چاہتی تھی لیکن عاصم کافی دیر سے بچھڑا ہوا تھا۔ دل بیٹے کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ شوہر کی طرف سے اطمینان ہوا تو وہ بیٹے کے پاس چلی گئی۔

امجد اور صدیقہ اپنے اپنے جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔ ایسے ہی وقت چار افراد ویڈیو کیمرے کے ساتھ اندر آ گئے۔ ایک نے آگے بڑھ کر امجد سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہم ایک پرائیویٹ ٹی وی چینل سے آئے ہیں۔ پرسوں مدر ڈے ہے۔ اس سلسلے میں خصوصی پروگرام ریکارڈ کر رہے ہیں۔ یہاں کسی کی ماں اور کسی کا بیٹا لہولہان ہو کر آیا

ہے۔ہم اس سلسلے میں ان کا انٹرویو لینا چاہتے ہیں۔"

وہ شاید کترا جاتی۔لیکن مدرڈے کا سن کر بولی۔"کیسا انٹرویو لینا چاہتے ہیں؟"

ایک شخص اس کی طرف مائیک بڑھاتے ہوئے بولا۔"ہوسپٹل میں زخمیوں کے لئے خون کی کمی ہے۔سنا ہے' آپ نے اپنا خون دے کر بیٹے کے لئے بلڈ حاصل کیا ہے؟اس کی زندگی بچائی ہے؟"

وہ بولی۔"ماں نے اپنے بیٹے کے لئے خون دیا ہے۔یہ کوئی انوکھی بات تو نہیں ہے۔مائیں تو نو ماہ تک اپنے خون میں اولاد کی پرورش کرتی ہیں۔پھر آخری سانسوں تک انہی کے لئے جیتی اور مرتی رہتی ہیں۔"

نبیلہ کے والدین کمرے میں ہجوم دیکھ کر باہر ایک بینچ پر آ گئے تھے۔اس شخص نے صدیقہ سے سوال کیا۔"آپ اپنے بیٹے کے بارے میں کچھ کہنا چاہیں گی؟"

"میرا بیٹا...."

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ایک نرس کمرے میں آ کر سجاد کا چین لاکٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔"ہم نے آپریشن کے وقت اسے پیشنٹ کے گلے سے اتارا تھا۔"

لاکٹ دیکھ کر اس کا چہرہ کھل گیا۔وہ اسے ہاتھ میں لے کر بولی۔"میرے دو بیٹے ہیں۔دونوں کے سینوں پر یہ لاکٹ سجا رہتا ہے۔جانتے ہیں کیوں؟"

سب نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔وہ بولی۔"کیونکہ اس میں میری تصویر ہے۔میں دن رات اپنے بیٹوں کے سینے سے لگی رہتی ہوں۔"

سب ہی تعریفی انداز میں اس لاکٹ کو دیکھنے لگے۔ماں بیٹے کی مثالی محبت کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہنے لگے۔وہ بولی۔"میرے بیٹوں نے وعدہ کیا ہے' کبھی مجھے اپنے دھڑکتے ہوئے دل سے دور نہیں کریں گے۔وہ آج بھی اپنے وعدے پر قائم ہیں اور ہمیشہ قائم رہیں گے۔یہ ایک ماں کا اعتماد ہے۔"

کیمرہ مین نے کہا۔"پلیز۔آپ لاکٹ کو کھول کر کیمرے کے سامنے کریں۔"

امجد اس کے قریب آ گیا۔اس نے لاکٹ کو کھولا تو دونوں ایکدم سے چونک گئے۔یکبارگی صدمے سے ٹوٹ کر رہ گئے۔وہاں ماں کی جگہ بیوی کی تصویر مسکرا رہی تھی۔

صدیقہ نے بڑے صدمے سے سر اٹھا کر شوہر کو دیکھا۔کیمرہ مین اور اس کے ساتھی لاکٹ دیکھنے کے لئے بے چین تھے۔ایک نے کہا۔"پلیز۔تصویر کا رخ ادھر کریں۔"

تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں۔وہ ماں کون سا رخ اُدھر کرتی؟اس کا سر گھوم رہا تھا۔سامنے کھڑے ہوئے افراد کو خبر نہیں تھی کہ ایک شاہکار تخلیق کرنے والی کا اعتماد چکنا چور ہو رہا تھا۔وہ ایسے بکھر رہی تھی کہ قیامت تک خود کو سمیٹ نہ پاتی۔امجد چپ تھا۔وہ بہت پہلے یہ پیش گوئی کر چکا تھا۔جب انسان کے چہرے بدل جاتے ہیں' نیت بدل جاتی ہے تو تصویر کیا چیز ہے؟اسے پرانے رشتوں کے کچرادان میں پھینک دیا جاتا ہے۔

سمجھانے سے بات سمجھ میں نہیں آتی۔آج وقت اسے سمجھا رہا تھا کہ بیٹے کا مزاج بدل گیا ہے۔ماں کی جگہ بیوی آ گئی ہے۔اس کے سینے پر لگی ہوئی نیم پلیٹ بدل گئی ہے۔

وہ صدمے سے ٹوٹ رہی تھی۔ٹی وی چینل والوں کو دیکھتے ہوئے بڑے شکستہ لہجے میں بولی۔"کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں' جنہیں صرف اپنی ذات تک محدود رکھا جاتا ہے۔پلیز آپ لوگ جائیں' ہمیں تنہا چھوڑ دیں۔"

ایک شخص نے کہا۔"لیکن محترمہ...!"

وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔"میں نے کہا نا...جائیں۔تو پھر جائیں۔"

وہ بحث نہیں کر سکتے تھے۔زیر لب بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔نبیلہ کے ابو اندر جانا چاہتے تھے۔ان کی بیوی نے ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا۔"ابھی ماحول سازگار نہیں ہے۔بیٹھے رہیں۔"

صدیقہ دو انگلیوں سے ایک چٹکی کا اشارہ کرتے ہوئے بڑے صدمے سے بولی۔"اتنی سی جگہ...میں اتنی چھوٹی سی جگہ چاہتی تھی۔دل کے اندر نہیں....اوپر....یا خدایا! اوپری محبت بھی نہیں ملتی؟"

وہ صدمے سے نڈھال ہو رہی تھی۔بیڈ کے سرہانے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔جیسے وہ سہارا نہیں ملے گا تو بستر سے گر پڑے گی۔وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔"گھر کے دروازے پر لکھا جاتا ہے' یہ میرا گھر ہے...مرنے کے بعد قبر کے سرہانے لکھا جاتا ہے' یہ میری قبر ہے...."

سب ہی اپنی اپنی پہچان چاہتے ہیں۔ کیا ایک ماں کی الگ سے کوئی پہچان نہیں ہوسکتی...؟

کیا اس کے لئے ایسی کوئی جگہ نہیں ہے' جہاں وہ اپنے نام کی تختی لگا سکے.....؟"

اس صدمے کی شدت ایسی تھی کہ سر چکرا رہا تھا۔ ایسے ہی وقت اس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وقار کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ لیکن وہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

وہ کمرے کے باہر ٹی وی چینل والوں سے کہہ رہا تھا۔ "نہیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ آپ لوگ ایسے واپس نہیں جائیں گے۔ میری امی کا انٹرویو ریکارڈ ہوگا۔ ساری دنیا ایک ماں کو دیکھے گی۔"

کیمرہ مین نے کہا۔ "آپ کہتے ہیں تو ہم چلتے ہیں۔"

"جسٹ اے منٹ۔ آپ یہاں ٹھہریں۔ میں امی سے بات کر کے آتا ہوں۔"

وہ دروازے پر آیا۔ پھر ماں کو دیکھتے ہی دوڑتا ہوا آ کر اس کے گلے لگ گیا۔ "امی! میں ابھی معلوم کر کے آیا ہوں' سجاد خطرے سے باہر ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کریں' کم ہے۔"

امجد نے پوچھا۔ "بیٹے! تم کب آئے؟"

"ابھی ائرپورٹ سے گھر پہنچا تو معلوم ہوا آپ سب یہاں ہیں۔ ویسے آپ نے ٹی وی والوں کو انٹرویو کیوں نہیں دیا؟"

امجد اور صدیقہ نے بڑے کرب سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ امجد نے کہا۔ "وہ لوگ لاکٹ کی تصویر اپنے چینل کے ذریعہ ساری دنیا کو دکھانا چاہتے ہیں اور ایک ماں کے پاس دکھانے کے لئے کچھ نہیں رہا ہے۔"

صدیقہ نے اس لاکٹ کو کھول کر وقار کے سامنے کر دیا۔ وہاں ماں کی جگہ نبیلہ کی تصویر دیکھتے ہی اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ بڑے دکھ سے بولا۔ "یہ۔ یہ سجاد نے کیا کیا...؟"

امجد نے ناگواری سے کہا۔ "بے شک وہ تصویر بدلتا مگر ماں کو تو دھوکے میں نہ رکھتا۔ اب یہ ممتا کی ماری دنیا کو کیا دکھائے گی؟"

وقار نے سینہ تان کر کہا۔ "میری امی کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچے گی۔ میں ان کا سر نہیں جھکنے دوں گا۔"

اس نے اپنا لاکٹ اُتار کر ماں کی طرف بڑھایا۔ سجاد کے لاکٹ کو اُٹھا کر اپنی جیب میں چھپاتے ہوئے کہا۔ "آنے والے یہ نہیں جانتے کہ کون سا لاکٹ کس کا ہے۔"

پھر اس نے دروازے کی سمت دیکھتے ہوئے آواز دی۔ "پلیز آپ لوگ آجائیں....."

وہ ٹی وی چینل والے کیمرے کے ساتھ اندر آگئے۔ صدیقہ اس لاکٹ کو کھول کر دیکھ چکی تھی۔ اس نے لاکٹ والا ہاتھ کیمرے کے سامنے بلند کرتے ہوئے کہا۔ "میرے بیٹے کی شادی ہوگئی۔ بیوی آگئی۔ بچے ہوگئے لیکن میرے بیٹے نے اس لاکٹ میں اپنے بیوی بچوں کی تصویریں نہیں سجائیں۔ یہاں صرف اپنی ماں کو اپنی دھڑکنوں سے لگا رکھا ہے۔

میں دنیا والوں سے کہنا چاہتی ہوں کہ یہ ماں خود غرض نہیں ہے۔ اپنی بہو اور اس کے بچوں کا حق نہیں چھیننا چاہتی۔ اپنے شوہر کی تمام کمائی' تمام جائداد ان کے نام لکھ دی ہے۔ میرے اختیار میں ہوتا تو یہ ساری دنیا ان کے نام لکھ دیتی۔ میں اپنا سب کچھ ہار کر صرف اتنا چاہتی ہوں کہ میری ایک تصویر... ایک ننھی سی تصویر ہمیشہ بیٹے کے سینے سے لگی رہے...."

وہ بولتے بولتے رونے لگی۔ روتے روتے بولنے لگی۔ "کیا ایک چھوٹی سی.. چٹکی برابر نیم پلیٹ ایک ماں کہیں لگا نہیں سکتی...؟"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کیمرے کے ذریعہ ممتا کے موتی دنیا والوں تک پہنچنے والے تھے۔

(ختم شُد)